

کار، شلوار اور دوپٹہ

احمد یار خان



پیش لفظ

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

فہرست

”لہو گرم رکھنے کا ہے اک بہانہ“ کے مصنف محترم صابر حسین راجپوت کی طرح محترم احمد یار خان بھی ماہنامہ ”حکایت“ کی دریافت ہے۔ ریٹائرڈ پولیس انسپکٹر احمد یار خاں کی شخصیت اور فن کے متعلق ہم کچھ بھی نہیں کہیں گے۔ آپ ان کی کہانیاں پڑھیں گے تو ان کی شخصیت، ان کا کردار اور ان کا فن نکھر کر آپ کے سامنے آجائے گا۔

اور یہ کہانیاں آپ پر یہ حقیقت بھی بے نقاب کریں گی کہ جرم و جاسوسی صرف انگریزی زبان میں ہی نہیں ملتی اور سرسبز سانی کے کمالات صرف امریکہ اور برطانیہ میں ہی نہیں دکھائے جاتے، پاکستان میں ایسے جوہر موجود ہیں جو آپ کو مزہ تر جمل سے بے نیاز کر سکتے ہیں بلکہ یہ بھی ثابت کر سکتے ہیں کہ سائنسی سہولتوں کے بغیر بھی ایسی وارداتوں کے جرم پکڑے جاسکتے ہیں جن کا بظاہر کوئی کھرا کھوج اور سراغ نہیں ہوتا۔ سائنسی سہولتیں تو درکنار محترم احمد یار خان کو موندہ واردات پر فوراً پہنچنے کے لیے اور کسی مجرم کے تعاقب کے لیے موٹر گاڑیوں اور بھی میسر نہیں

۴

کار، شلوار اور دوپٹہ

۵۶

پاپی کا پیار

۱۱۱

ایک ماں ایک معتمد

۱۶۸

کون کس کا قاتل؟

۲۰۸

وہی سیرٹھیاں وہی زہر

کار، شلوار اور دوپٹہ

کار بھی غائب، شلوار بھی غائب، دوپٹہ بھی غائب۔ لڑکی کی مرنے لاش ملی مگر دیہاتی علاقے میں۔ اس لاش نے ایک دیہاتی کے ہاتھوں اپنی بیوی کو قتل کرا دیا۔

میں اُس وقت شہر کے ایک مصافحاتی تھانے کا ایس۔ ایچ۔ اڈ تھا۔ ایک سچ نمبر دار اور پٹاری تھانے میں آئے۔ اطلاع لائے کہ گاؤں سے چار پانچ سو گز دور دیران علاقے میں ایک لاش برآمد ہوئی ہے۔ معلوم نہیں مرد ہے یا عورت، لاش دبی ہوئی ہے۔ مرنے کا ہتھکڑیاں تنگی ہیں۔ گوشت کھایا ہوا ہے۔

میں اُسی وقت دوکانسٹیبلوں کو ساتھ لے کر ان کے ساتھ روانہ ہو گیا۔ جس جگہ لاش دبی ہوئی تھی وہ تھانے سے ڈیڑھ میل دور تھی۔ اس جگہ سے قریب جو گاؤں تھا اس کا وہاں سے فاصلہ دو یا اڑھائی فرلانگ تھا۔ علاقہ دیران تھا۔ ایک ایک اور دو روٹ ادبھی جھاڑیوں سے یہ علاقہ بھرا ہوا تھا۔ درخت بھی بہت تھے۔ یہ بھر علاقہ تھا۔ کھیتیاں گاؤں کی دوسری طرف تھیں۔ اس بھر علاقے میں پرندوں کا شکار کھیلنے کے لئے شہر سے انٹری شکاری آیا کرتے تھے۔ میں نے لاش کا ہتھکڑیاں دیکھا جو کسی گیڈیا اودھلاؤ نے مٹی سے نکال کر خود ترا

تھی۔ ان کی لیبارٹری اپنا داغ اور ٹرانسپورٹ اپنی ٹانگیں تھیں۔

سراغ سانی کے علاوہ ان سچی وارداتوں میں آپ کو چار دیواری کی ڈھکی چھپی دنیا اور اپنے معاشرے کے وہ ڈرامے ملیں گے جو پڑھو تو سنسنی خیز لگتے ہیں۔ لیکن عملی زندگی میں ہر روز ہمارے سامنے، ہمارے گھروں میں کھیلے جاتے ہیں۔ مگر ہم میں سے کوئی چہیکتا نہیں، نہ انہیں کوئی اہمیت دی جاتی ہے۔ یہ کہانیاں پڑھ کر آپ محسوس کریں گے کہ ہماری ذرا ذرا سی کوتاہیاں کتنے بھیانک ایسے کا باعث بن جاتی ہیں۔ معصوم اور پاک بٹیاں کہاں سے کہاں جا پہنچتی ہیں اور جو جیونٹی کو بھی مارنے سے گھبراتے ہیں، وہ قتل تک کر گزرتے ہیں۔ میں اپنے پولیس والوں سے یہ استدعا کر دوں گا کہ یہ کہانیاں ضرور پڑھیں۔

مدیر ماہنامہ ”حکایت“ لاہور

معلوم ہوتی تھی۔ موسم سرد تھا۔ اس لیے لاش زیادہ خراب نہیں ہوتی تھی۔ لڑکی خوبصورت تھی۔ بدن پر صرت قمیض تھی جو ریشمی کپڑے کی تھی بشلوار نہیں تھی۔ دودھ پٹ بھی نہیں تھا۔ پاؤں میں سینڈل نہیں تھے۔ سینڈل دونوں ٹانگوں کے درمیان رکھے ہوئے تھے۔ لڑکی بلا شک و شبہ شہری تھی۔ قمیض کا کپڑا قیمتی اور رنگ چاکلیٹ تھا۔ لاش کا ڈانگ لاشوں کی طرح تھا لیکن اس کی زندگی والے رنگ کا اندازہ لگانا مشکل نہیں تھا۔ لڑکی گورے رنگ کی تھی۔ میری نظروں کے مطابق اس کی عمر زیادہ سے زیادہ چھبیس سال ہوگی۔

شلوار کی غیر موجودگی سے میری یہ رائے غلط نہیں ہو سکتی تھی کہ قتل کی یہ واردات جنسی جرم ہے۔ لاش کے کانوں میں مکے میں، بازوؤں اور انگلیوں میں زیور کی ایک بھی چیز نہیں تھی۔ گینڈروں وغیرہ نے ایک ہاتھ باہر نکال کر رکھا لیا تھا۔ شاید اس ہاتھ کی کسی انگلی میں انگوٹھی ہو۔ یہ دایاں ہاتھ تھا۔ بائیں ہاتھ گڑھے میں تھا۔ وہاں بھی انگوٹھی نہیں تھی۔ مجھے گڑھے سے صرت ایک چیز ملی۔ یہ ٹوٹی ہوئی چوڑی کا ایک ٹکڑا تھا۔ میں نے اٹھایا اور جیب میں ڈال لیا۔

لڑکی قمیض کے کپڑے کے مطابق امیر گھرانے کی معلوم ہوتی تھی۔ یہ ہو ہی نہیں سکتا تھا کہ اس کے جسم پر کوئی زیور نہ ہو۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ یہ رہبرنی کی واردات ہے۔ اس طرح یہ زمین جراثیم کی واردات تھی۔ آغوا یا رہبرنی، آرموریزی اور قتل۔ یہ کام پیشہ دروہاں ہی ہو سکتا تھا۔ میں نے لاش باہر نکلا کر گاؤں سے تنگواں ہولی چارپائی پر رکھوائی۔ سب سے پاؤں تک، ہر طرف سے لاش کا نظری معائنہ کیا۔ جسم پر ضرب یا زخم کا کوئی نشان نہیں تھا۔ خواش تک نہیں تھی۔ گردن کے گرد سی یا انگلیوں کا کوئی نشان

سا کھایا تھا گاؤں کے لوگ اکٹھے ہو گئے تھے۔ انہیں لاش کے اوپر سے مٹی بٹانے کو کہا اور میں خود علانے میں نیز تیز قدم اٹھانا گھومتے پھرنے لگا۔ یہ اسی قسم کا ایک قتل تھا جس کی گواہی لاش اور زمین دیا کرتی ہے لیکن یہ کام پتھر سے دودھ پٹانے کے برابر ہوتا ہے۔ میں زمین سے گواہی لینے کے لیے زمین پر نظریں گاڑے گھوم پھر رہا تھا۔ لاش سے ساٹھ ستر گز دور سے ایک پگڈنڈی گزرتی تھی۔ اس پر گیا تو زمین نے میری نظروں کو وہیں روک لیا۔

میں روک گیا اور سوچنے لگا کہ زمین جھوٹ بول رہی ہے یا سچ؟ اگر زمین سچ بول رہی ہے تو یہ لاش کسی شہری کی ہوگی دیہاتی کی نہیں ہو سکتی۔ میں نے ابھی لاش نہیں دیکھی تھی۔ ابھی یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ مرد ہے یا عورت۔ میں نے پگڈنڈی کی خاموش زبان سن لی اور اس کی گواہی اپنی آنکھوں میں اور ذہن میں محفوظ کر لی۔ میں اپنی کہانیوں میں بتا چکا ہوں کہ پولیس مین کی نظر عام لوگوں کی نظر سے بہت ہی مختلف اور تیز ہوتی ہے۔ بعض اوقات گھاس کا ایک تنکا جو انسانوں اور حیوانوں کے لیے صرت گھاس ہوتا ہے آنکھیں کرنے والے پولیس آفیسر کے لیے سونے جتنا قیمتی ہوتا ہے اور ایک آدمی کو بچانسی چڑھا سکتا ہے۔ کچھ ایسی ہی گواہی پگڈنڈی نے دی۔ میں بہت تیز قدم اٹھانا لاش تک گیا۔ لاش تنگی کردی گئی تھی۔ ابھی باہر نہیں نکالی گئی تھی۔ اس کے اوپر سے مٹی جھاڑ دی گئی تھی۔ گڑھا جو اس کے لیے کھودا گیا تھا مشکل سے دو فٹ گہرا تھا۔ میں نے آگے ہو کر دیکھا۔ میرے سامنے ایک عورت کی لاش پڑی تھی۔

چہرہ سو جتنا شروع ہو گیا تھا۔ منہ اور آنکھیں ذرا ذرا کھلی تھیں۔ جوان لڑکی

نہیں تھا۔ اس سے ظاہر ہوتا کہ گانہیں گھونٹا گیا۔ سر پر ہاتھ پھیرا۔ اچھلا ہوا کوئی نشان نہیں تھا جو چوٹ کی گواہی دیتا۔ میری ٹائیں لڑکی کی مرث کا باعث وہ تشدد تھا جو لڑکی سے کیا گیا اور اس سے اس کی حرکت قلب بند ہو گئی۔ اس صورت میں مجرم ایک سے زیادہ تھے۔ اتنے زیادہ کہ لڑکی زندہ نہ رہ سکی۔

میں نے تمام شاہدوں کو جو سب کے سب دیہاتی تھے، وہاں سے دور ہٹا دیا تھا۔ دونوں کانسیبلوں سے کہا کہ ہر طرف جا کر شہلار اور دوپٹہ تلاش کریں یا کوئی ایسی چیز دیکھیں جو اس لڑکی کے جسم سے اتری ہو۔ اس دوران، میں نے خبردار اور پواری کے بیان قلمبند کیے، جس آدمی نے سب سے پہلے لاش کی نشاندہی کی تھی، اس کے بیان لیے اور رکھے۔ ضروری کاغذی کارروائی کی۔ انگوٹھے گواہ تھے۔ تقریباً ڈیڑھ گھنٹہ گزر گیا ہوگا۔ کانسیبل آگئے۔ انہیں ٹوٹی ہوئی کاپڑ کی چوڑیوں کے تین ٹکڑیوں کے سوا کچھ بھی نہ ملا۔ جہاں سے یہ ٹکڑے ملے، میں وہاں گیا۔ مٹی کے نشان بناتے تھے کہ یہاں ضرور کوئی لیٹا رہا ہے۔ پاؤں کے نشان بہت تھے مگر اتنے گڈیڑے پہچانے نہیں جاتے تھے۔ واردات اسی جگہ ہوئی تھی۔

وہاں سے پاؤں کے جو نشان چلے وہ بھی اتنا ہی پہچانے جاسکے کہ یہاں سے کوئی گزرا ہے۔ نشان واضح نہیں تھے۔ صرف اتنا سا سراخ ملا کہ لڑکی پر تشدد کس جگہ کیا گیا ہے۔ یہ سراخ میری کوئی مدد نہیں کر سکتا تھا میں ایسے ہی تھا کہ دریا میں سے ایک قطرہ کسی پیاسے کے منہ میں ڈال دو۔ میرے اس شک کی تائید ہو گئی کہ یہ آبد ریزی اور قتل کی واردات ہے میں نے چوڑیوں کے تینوں ٹکڑے جیب میں ڈال لیے۔

لاش اٹھوا کر تھانے میں بھیجی۔ میں خود پیچھے رہ گیا۔ خبردار کو خفیہ ہدایات دیں۔ مجرموں کو اپنا کام شروع کرنے کو کہا اور میں تھانے چلا گیا۔ میرے ذہن میں پگھڑی کی گواہی کے سوا اور کچھ بھی نہیں تھا۔ دیہاتیوں کا کام تو آسان تھا۔ انہوں نے گڑھا مردہ اکھاڑ کر دکھا دیا تھا۔ اب مجھے زمین کی تہ سے مجرموں کو نکالنا اور عدالت میں کھڑا کرنا تھا۔ پہلے تو میں خوش تھا کہ یہ لاش کسی دیہاتی کی ہوگی اور یہ خاندانی دشمنی کی بنا پر قتل کیا گیا ہوگا۔ ایسے قتل کے کیسوں کی سراغ رسانی بہت آسان ہوتی ہے۔ خبردار پتہ چلا لیتے ہیں مگر اس کیس میں شہریوں نے اپنی ایک لاش دیہاتی علاقے میں لا کر دیا دی تھی۔ اب مجھے سمندر میں ڈوبی ہوئی چوڑیوں کو ڈھونڈنا تھا۔

مجھے امید کی ایک کرن نظر آئی۔ وہ یہ تھی کہ شہر کے کسی نہ کسی تھانے میں کسی جوان لڑکی کی گمشدگی کی رپورٹ درج کرائی گئی ہوگی۔ اگر لڑکی کا آتا پتا مل جائے تو مجرم کے گھر تک پہنچنا قدر سے آسان ہو جائے گا۔ دوسری صورت یہ تھی کہ جرائم پیشہ افراد کی فہرست مل جائے گی۔ جرائم پیشہ لوگوں سے ہم انبیاں جسم کرایا کرتے تھے۔ اس فہرست میں جنسی جرائم کے پیشہ دروں کے بھی نام تھے۔

وہ کنواری نہیں تھی!

تھانے جا کر میں نے لاش کی قمیض سامنے سے پھاڑ کر اتروالی۔ لاش سے قمیض بغیر پھاڑے نہیں اتاری جاسکتی۔... پھر لاش پوسٹ ماٹم کے لیے بھجوائی اور ٹیلیفون پر پیشہ کیا۔ ایک گھنٹہ صرت کر کے تمام تھانوں سے اور پولیس ہیڈ کوارٹر سے

○ لڑکی کو مرنے تین دن ہو گئے تھے یعنی تین دن اور تین راتیں وہاں پڑی رہی مگر صرٹ ایک ہاتھ کھایا گیا۔ گیڈڑوں یا اود بلاءوں نے لاش کھود کیوں نہ لی؟
○ کیا یوں ہوا ہو گا کہ لڑکی کو گھر میں قتل کیا گیا اور تیسرے روز یہاں دفن کیا گیا؟

○ یہ ایک ہاتھ اوپر کس طرح اور کیوں رہا؟
○ شہر کی لڑکی اتنی دیر دیر لانے میں کیوں گئی؟ کیا اسے زبردستی لے جایا گیا یا قتل کر کے لے جایا گیا؟ پگڈنڈی نے خاموشی سی گواہی دی تھی کہ لڑکی کو وہاں تک لے جایا گیا۔ یہ معلوم کرنا تھا کہ مردہ لے جایا گیا یا زندہ۔
○ کیا اسے صرٹ قتل کرنا مقصود تھا؟ اگر مقصد یہی تھا تو شلوار اور زیورات کہاں گئے؟

○ لڑکی کتنی کون؟
○ لاش سرد خانے میں رکھ دی گئی۔ فوٹو گرافر نے اسی شام مجھے لڑکی کے چہرے کے فوٹو دے دیے جو میں نے تمام اخباروں کو اس ہلاکت کے ساتھ بھجوا دیئے کہ کل صبح کے اخبار میں مندر شائع کیے جائیں۔ صبح اخبار آئے۔ فوٹو چھپ گئے تھے۔ نیچے لکھا گیا تھا کہ اس لڑکی کے وارث ہسپتال کے سرخانے میں لاش شناخت کر سکتے ہیں۔ مجھے یہ حدشہ تھا کہ لاش کا چہرہ کچھ پھول گیا تھا، اس لیے وارث فوٹو سے شناخت نہیں کر سکیں گے۔ دوسرے دن ریڈیو سے بھی اعلان کرایا گیا۔ لڑکی کا حلیہ بیان کیا گیا مگر وہ دن، اگلے دن اور اس سے

پر چھا کہ کسی لڑکی کی گمشدگی کی رپورٹ تو نہیں آئی؟ ہر جگہ سے جواب ملا ”نہیں“۔ یہ جواب سن کر میں بڑی صبر آزمائی و تحقیق کے لیے تیار ہو گیا۔ فوٹو گرافر کا انتظام کر کے ہسپتال بھیج دیا تاکہ لڑکی کے چہرے کی تصویر نہایت صاف لے کر پانچ چھ کاپیاں بنا دے۔ لاش کو چار پانچ روز ہسپتال کے سرد خانے میں رکھنے کا بھی انتظام کیا اور میں سرکپ کر بیٹھ گیا۔

پوسٹ مارٹم رپورٹ شام تک نہ آئی تو میں ہسپتال چلا گیا۔ موت کا باعث معلوم نہیں ہو رہا تھا۔ ایک انگریز سینٹسٹ دیکھ رہا تھا۔ بہت انتظار کے بعد رپورٹ ملی۔ لڑکی کی موت سانس رکنے سے واقع ہوئی تھی۔ لگا نہیں گھونٹا گیا تھا۔ دوسرا طریقہ یہی ہو سکتا تھا کہ منہ اور ناک پر ہاتھ یا کپڑا باندھ کر سانس روکا گیا ہو گا۔ لڑکی کا مذہب معلوم نہیں ہو سکا۔ اس کی عمر پچیس سال کے لگ بھگ بتائی گئی۔ وہ کنواری نہیں تھی۔ یعنی شادی شدہ تھی۔ ڈاکٹروں کے معائنے کے مطابق اس نے ابھی تک ایک بھی بچہ کو جنم نہیں دیا تھا۔ اسے تین روز پہلے قتل کیا گیا تھا۔ اس رپورٹ نے میرے لیے ایک بہت ہی عجیب و غریب مسئلہ پیدا کر دی۔ ڈاکٹر نے لکھا تھا کہ موت سے پہلے لڑکی پر مجرمانہ حملہ نہیں کیا گیا۔ تشدد کے کوئی آثار نہیں ملے۔ میرے سامنے جو سوال آئے وہ یہ تھے:

○ اگر لڑکی پر مجرمانہ حملہ نہیں ہوا تو شلوار کہاں گئی؟
○ لڑکی کے زیورات یقیناً اتارے گئے ہیں جو کسی پیشہ ور مجرم کا کام ہے۔ کیا وہ مجرم اس قدر شریف تھا کہ اتنی خوبصورت اور جوان لڑکی کو اس نے بہن کا درجہ دے کر اس کی عزت پر ہاتھ نہ ڈالا؟

بھی اگلے دن کوئی نہ آیا۔ ہسپتال سے یہ اطلاع آئی کہ لاش چونکہ پہلے ہی پھوٹی شروع ہو گئی تھی، اس لیے سرد خانے میں یہ زیادہ دن نہیں رکھی جاسکتی، خراب ہو رہی ہے۔ مجھے لاش وہاں سے اٹھوانی پڑی۔ مذہب کا کچھ پتہ نہ تھا۔ میں نے مسلمانوں کے قبرستان میں دفن کرادی۔ اس سے مجھے یہ سکون ضرور ہوا کہ لڑکی کا کوئی وارث سامنے نہیں آیا۔ ہو سکتا ہے یہ کیس گول ہی ہو جائے لیکن لڑکی لاوارث تو نہیں ہو سکتی تھی۔ مجھے یہ خیال بھی آیا کہ اسے کسی دور دراز شہر سے نہ لایا گیا ہو۔ اس کے ساتھ ہی یہ خیال آیا کہ یہ لڑکی طوائف ہی تو نہیں؟ میں اس لائن پر سوچنے لگا۔

یہ خیال آتے ہی میں نے طوائفوں کے علاقے کے تھانیدار کو ٹیلیفون کیا۔ وہ ہر دیال سنگھ تھا۔ میرا دوست تھا۔ میں اس سے پہلے بھی پوچھ چکا تھا کہ اس کے خٹانے میں کسی لڑکی کی گندگی کی رپورٹ تو نہیں آئی؟ اب اس کے ساتھ پھر بات ہوئی تو اس نے پوچھا — ”پتہ نہیں چلیا اور کیسی کالی لے؟“ میں نے اسے بتایا کہ کچھ پتہ نہیں چل رہا کہ وہ کون تھی۔ ہر دیال سنگھ نے مجھے ایک ”دانشندانہ“ مشورہ دیا۔ کہنے لگا۔

”احمد جارا، میری گل سن۔ پھلاں تو بڑا پتہ کرے اور کیسی کالی اسے۔ پھر نہیں پتہ چل جائے گا اور کون سی گی؟“

میں نے اس سے پوچھا — ”ہر دیالے، اوکائی تیری ای تے نہیں سی؟“ ہر دیال سنگھ نے مجھے نہایت دل چسپ گالی دی۔ وہ میری بات سمجھا نہیں تھا۔ میں نے اسے کہا کہ وہ ہمارے علاقے کی طوائف تو نہیں تھی؟ وہ سمجھ گیا اور وعدہ

کیا کہ کل تک مجھے پکی خبر دے گا۔ مجھے شک تھا کہ کوئی امیر زادہ رقابت کے جوش میں لڑکی کو قتل کر گیا ہے مگر ہر دیال سنگھ نے دوسرے دن یہ اطلاع دے کر میری امیدوں پر پانی پھیر دیا۔ ”احمد جارا، میرا ٹوٹل تے پورا اے۔“ اس کے علاقے کی تمام طوائفیں جن میں اعلیٰ درجے کی بھی تھیں پوری تھیں۔ کوئی بھی لاپتہ نہیں تھی۔ اسی دن کا ڈیڑھ ایک بج رہا تھا کہ دو دیہاتی دوڑتے خٹانے میں آئے۔

انہوں نے نئے کپڑے پہنے ہوئے تھے جیسے عید یا شادی کے موقع پر پہنے جاتے ہیں۔ وہ گھبرائے ہوئے تھے۔ انہوں نے اطلاع دی کہ ان کے گاؤں میں ایک لڑکی کی شادی ہے۔ بارات آنے والی ہے۔ لڑکی کی برادری کے کچھ لوگ بارات پر حملہ کرنے کے لیے تیار کھڑے ہیں۔ لڑکی والوں نے انہیں رشتہ دینے سے انکار کیا تھا۔ بارات دوسرے گاؤں سے آرہی ہے۔ ادھر بھی اطلاع پہنچ گئی ہے کہ باراتی کلباڑیوں سے مسلح ہو کر آرہے ہیں۔

ان دونوں کو نمبر دار نے بھیجا تھا۔ یہ اسی گاؤں سے آئے تھے جس کا میں نے ابتدا میں ذکر کیا ہے کہ جہاں سے لاش برآمد ہوئی تھی، وہاں سے دو اڑھائی فرلانگ دور ہے۔ میں نے چھ کانسیٹیل ساتھ لیے اور نقص امن کے خطرے کو دبانے کے لیے فوراً روانہ ہو گیا۔ گاؤں میں گیا تو بہت سے لوگ نئے کپڑے پہنے ہوئے تھے۔ یہ معمولی معمولی سے کسانوں کا گاؤں تھا۔ میں دیکھتے ہی گاؤں میں ہلچل مچ گئی۔ ہمارے لیے اچھی قسم کی چار پائیاں باہر نکال دی گئیں۔ اوپر بستر بچھا دیے گئے۔ نمبر دار موجود تھا۔

نسواری دوپٹہ اور سواری شلو

میں نے مطلوبہ پارٹی کے چند آدمیوں کو بلایا۔ انہیں ڈرایا دھمکایا۔ پارت دوپٹے کے دور سے آرہی تھی۔ گاؤں کے ایک آدمی کو ادھر یہ حکم دے کر بھیجا کہ وہ لوگ لاشیوں اور کلہاڑیوں کے بغیر آئیں۔ وہاں فضا واقعی خون خرابے والی تھی۔ میں نے احتیاط کے طور پر حملے کی تیاری کرنے والی پارٹی کے تین سرغنوں کو پابند کر لیا۔ یہ سب مسلمان تھے جو لڑائی جھگڑے سے دل ہلایا کرتے تھے۔ بہر حال ضروری کارروائی جو محض زبانی تھی کر کے میں نے سب کو وہاں سے اٹھا دیا۔ سرغنوں سے کہا کہ وہ ابھی تھانے چلے جائیں اور وہاں بیٹھیں۔ تماشائی ادھر ادھر ہو گئے تو میں عورتوں اور بچوں کو دیکھنے لگا سب نے رنگارنگ کپڑے پہنے ہوئے تھے۔ عورتوں کے کپڑے بہت شوخ تھے۔ بھر پور کیلے اور گہرے رنگ کے کپڑے جو غامض سستے تھے۔ ان دنوں ٹانسا بہت چلتا تھا یا اگر اٹھا ہوا مصنوعی ریشم جو چمک دیتا تھا۔ یہ سستا ہوتا تھا۔ دیہاتی ہی کپڑا پہنا کرتے تھے کیونکہ ان میں شو اور شوخی زیادہ اور قیمت کم ہوتی تھی۔ ایسے کپڑے یہ عورتیں عیدوں پر یا شادیوں پر پہنا کرتی تھیں۔

مجھ سے تقریباً پندرہ گز دور ایک درخت کے نیچے چھ عورتیں اور کچھ بچے کھڑے تھے۔ ان سب میں کوئی خاص بات نہیں تھی کہ میں انہیں غور سے دیکھتا۔ ان پر اڑتی ہوئی نگاہ ڈالی تو ایک عورت نے میری نظروں کو بالکل اسی طرح جکڑ لیا جس طرح لاش برآمد ہونے وقت پگڈنڈی نے میری نظروں

کو جکڑ لیا تھا۔ اس کانگ دوسری عورتوں کی نسبت صاف تھا۔ جسم بہت اچھا تھا۔ باقی عورتوں نے بال اس طرح گوندھ رکھے تھے کہ کوئی بال دوپٹے سے باہر نہیں تھا لیکن اس عورت نے کنپٹیوں سے کچھ بال کانوں سے آگے کو کھینچ کر رکھے تھے جو اچھے لگتے تھے۔ وہ جوان بھی تھی۔ وہ شوخ بھی نظر آتی تھی مگر میں نے اسے غور سے اس وجہ سے نہیں دیکھا کہ دوسریوں کی نسبت اس میں کشش تھی۔ وجہ یہ تھی کہ اس کی شلو اور کپڑے ہونے لٹا سے کی نہیں تھی بلکہ قیمتی کپڑے کی تھی اور اس کا دوپٹہ بھی قیمتی تھا۔ البتہ اس کی قمیض دیہاتی ذوق کے عین مطابق تھی۔ یہ لوگ شوخ رنگ پسند کیا کرتے تھے۔ مثلاً گہرا سرخ، گہرا سبز اور جامنی وغیرہ۔ اس عورت کی قمیض تو فربسی ہی تھی لیکن شلو اور دوپٹے کا رنگ دیہاتی ذوق سے بہت دور تھا۔ رنگ کے علاوہ شلو اور کپڑے کی ڈھلک بتاتی تھی کہ یہ عورت کھاتے پیتے گھرانے کی ہے اور اس کا ذوق شہری ہے مگر قمیض بھانڈہ پھوڑ رہی تھی۔

اچانک شلو اور دوپٹے کے رنگ نے میرے ذہن میں پھل چا دی۔ رنگ چاکلیٹ تھا۔ میری نظروں کے سامنے لاش کی قمیض آگئی۔ قمیض پر ہلکے ہلکے اور ایک دوسرے سے دور دو پھول تھے اور اس کی زمین چاکلیٹ رنگ کی تھی۔ مجھے شلو اور دوپٹے کی تلاش تھی۔ دونوں چیزیں میرے سامنے تھیں۔ میں اٹھا اور آہستہ آہستہ اس انداز سے ٹھٹھا ان عورتوں کی طرف جانے لگا، جیسے میں انہیں نہیں دیکھ رہا۔ حوالدار جگن ناتھ میرے ساتھ تھا۔ میں اس کے ساتھ غیر متعلق سی بائیں کرتا رہا۔ عورتیں ذرا ایک طرف ہو گئیں۔

میں نے ان کی طرف دیکھا اور مسکرا کر کہا۔ "نشادی مبارک ہو ہنواؤ فکر کرو"

جو نہایت ضروری ہوتا ہے۔ میں نے مسکرا کر نمبر دار سے پوچھا۔ ”یہ دانا کس کا ہے؟“

”کچھ تو اس کا بکواس ہے لیکن ہے اڑتا بچھی۔“ نمبر دار نے جواب دیا۔ ”اس عورت کا نام آمنہ بی بی ہے۔ لوگ اسے امو پکارتے ہیں۔ تین سال پہلے اس کی شادی اس گاؤں میں ہوئی تھی جہاں سے آج بارات آرہی ہے۔ ایک سال بعد اسے بد چلتی کے شبہ میں طلاق مل گئی تھی۔ ایک سال گھر بیٹھی رہی۔ پھر بکواس نے اس کے ساتھ شادی کر لی۔ ایک سال ہو گیا ہے۔ لڑکی شوباز ہے۔ آنکھوں سے بانیں کرتی ہے۔ شرکاری عورت ہے۔“

اس کے خاوند بکواس کے متعلق نمبر دار نے بتایا۔ ”آدمی ٹھیک نہیں کھیتی باڑی کرتا ہے اور واردات کرنے سے بھی نہیں ڈرتا۔ جو ابھی کھیل لیتا ہے۔ لٹھ باز ہے۔ چاقو چلا لیتا ہے۔ اس کا ریکارڈ صاف ہے۔ آپ کے اس بھٹانے میں آنے سے پہلے تین دفعہ مشتبه بٹھایا گیا تھا۔ قسمت اچھی تھی کہ نکل آیا۔ یہ ضرور ہے کہ پیشہ چوری چکاری اور جو انہیں ہے۔ آدمی استاد ہے۔ مگر اب بیوی نے اسے دبایا ہے۔ اس میں پہلے والی شرارت اور شوخی نہیں رہی اب تو سر بھی اونچا نہیں کرتا۔“

نمبر دار نے بکواس اور امو کی تین چار کہانیاں سنائیں اور ثابت کیا کہ دونوں شریف نہیں ہیں۔ مجھے یس کر خوشی ہوئی۔ میرا مسئلہ حل ہونے کی صورت پیدا ہو رہی تھی۔ امو کی شلوار اور دوپٹہ اور کانٹے بٹکے تھے کہ یہ مقتول کے جسم سے اترے ہیں۔ قیض اتارنی مشکل تھی، اس لیے نہیں اتاری گئی لیکن سوال یہ تھا

اب دانا کس کا نہیں ہوگا۔ میں نے اس عورت کو غور سے دیکھا۔ اس کے کانوں میں چھوٹے چھوٹے کانٹے تھے جو صرت شہری لڑکیاں استعمال کیا کرتی تھیں۔ دیہات کی عورتیں کانوں میں اتنے لمبے لمبے کانٹے ڈالا کرتی تھیں، جو کندھوں پر پڑتے تھے اور یہ چاندی کے ہوتے تھے مگر اس عورت کے کانٹے نفیس ذوق کا پتہ دیتے تھے۔ سوال یہ پیدا نہیں ہوتا تھا کہ اس عورت کا ذوق اتنا نفیس ہو۔ اس عورت نے مجھے مزید شک میں اس طرح ڈالا کہ میں جب ان عورتوں کے قریب گیا تو وہ پیچھے ہٹ کر دوسری عورتوں کے پیچھے چھپ گئی اور پھر وہاں سے چلی گئی۔

میں ایک طرف کو ٹھٹھا گیا۔ لیکن ناتھ کے علاوہ نمبر دار بھی میرے ساتھ تھا اور چند آدمی میرے پیچھے پیچھے آرہے تھے۔ میں نے نمبر دار کو الگ لے جا کر اس سے پوچھا۔ ”نسواری دوپٹے اور شلوار والی عورت کون ہے اوکیسی ہے؟“ اسے یاد نہیں آ رہا تھا۔ میں نے اسے علیہ بتایا تو وہ مسکرایا۔ وہ شاید میرے کو دار سے ابھی واقف نہیں ہوا تھا۔ رازداری سے بولا۔ ”دانا ہے حضور، آپ حکم کریں۔“

میں جانتا تھا کہ نمبر دار تنہا لاروں کو کیسے کیسے طریقوں سے خوش کیا کرتے ہیں۔ میں نے اسے بالکل نہیں کہا کہ یہ دانا مجھے چاہئے یا یہ کہ میں بڑا شریف آدمی ہوں۔ وہ تنہا لار کمزور سمجھا جاتا ہے جس کے متعلق یہ مشہور ہو جائے کہ وہ شریف آدمی ہے۔ ڈاکوؤں اور قاتلوں کو پکڑنے اور انہیں جرم کرانے کے لیے شرانت نقصان دہی ہے۔ تنہا لار شریف بھی ہوتے ہیں لیکن زبان کے گندے ہوتے ہیں

”بلانا ہوں سرکار۔ آپ کی باندی ہے۔ سرکار کے قدموں میں بیٹھنے کی۔ وہ
امو کو بلانے کی بجائے بونتا ہی جا رہا تھا۔ اس نے مجھے شک ہڑا جیسے وہ اسے
بلانے میں دانستہ دیر کر رہا ہے۔ میں نے آواز دی۔ ”امو! باہر آؤ۔“ بکو اٹھ کر
اندر کو دوڑا۔ پھر بھی انہوں نے باہر آتے کچھ وقت لگایا۔ میں نے امو کو دیکھا۔ اب
اس کا دوپٹہ چاکلیٹ رنگ کا نہیں تھا اور نہ ہی شلوار چاکلیٹ تھی۔ کانوں میں
چھوٹے میندول کی بجائے چاندی کے بڑے بڑے کانٹے تھے۔ اس کی شلوار
تقبیض کے ساتھ کی تھی اور دوپٹہ دسی ریشم کا جیسے ذرا سا کھینچو تو تار تار ہو جاتے۔
یہ تھی اصلی دیہاتی پسند۔

وہ میرے سامنے کھڑی ہو گئی۔ میں نے اسے بیٹھنے کو کہا اور بکو سے کہا کہ
وہ دور کھڑی کی دوسری جانب جا کر کھڑا ہو جائے۔ امو میرے سامنے بیٹھ گئی۔
میں نے اس کی کلاسیاں دیکھیں اور دھیمی آواز میں کہا۔ ”یہ چوڑیاں کیوں نہیں
آتاریں؟“ وہ گھبراؤ گئی لیکن عورت تیز تھی کہنے لگی۔
”یہ چوڑیاں۔ یہ میں نے شہر سے خریدی تھیں۔“

ان چوڑیوں کے چار ٹکڑے میرے پاس موجود تھے جو میں نے غفلت میں
اپنی میز کی دوازیں رکھ دیے تھے۔ ایک ٹکڑا مجھے لاش والے گڑھے سے ملا تھا۔
اور تین ٹکڑے کانسیلوں کو گڑھے سے دور سے ملے تھے جب میں نے انہیں کہا تھا
کہ شلوار اور دوپٹہ لٹاؤں کہ وہ اور جو چوڑیاں ٹوٹی نہیں تھیں وہ امو کی کلاسیوں میں
تھیں۔ یہ کانچ کی باریک باریک اور عمدہ قسم کی چوڑیاں تھیں اور رنگ نہایت

کے شہری لٹکی اتنی دور کس طرح آئی؟ یہ تو ہونہیں سکتا تھا کہ یہ دیہاتی آدمی
اسے شہر سے درغلا لایا ہو۔ مرن ایک صورت سمجھ میں آتی تھی کہ بکو شہر کے
جوائنٹ پیشیہ گروہ کا آدمی ہے۔ بہر حال جو کچھ تھا، اسی گاؤں میں یا بکو کے گھر
میں تھا۔ میں نے نمبر دار سے کہا کہ مجھے بکو کے گھر لے چلو۔

وہ دوپٹہ اور شلوار بدل آئی

بکو کے گھر کے سامنے میں نے نمبر دار اور حوالدار جگن ناٹھ کو باہر کھڑا رہنے
کو کہا اور اکیلا اندر چلا گیا۔ صحن میں کوئی نہیں تھا۔ میں نے آواز دی تو بکو اندر سے
”نکلا۔ دوڑ کر میرے گھٹنے چھوئے اور ہاتھ لایا۔ دوڑ کر چار پائی اٹھا لایا میں نے پوچھا۔
”امو کہاں ہے؟“

اس نے کہا۔ ”اندر ہے۔“

میں نے کہا۔ ”باہر بلاؤ۔“

”کیوں سرکار؟“ بکو نے غلاموں کی طرح ہاتھ جوڑ کر کہا۔ ”ہم غریبوں
سے کوئی بھول چوک ہو گئی ہے؟ ہم تو بڑے غریب لوگ ہیں سرکار۔“
”کچھ نہیں ہڑا بکو۔“ میں نے دوستوں کی طرح پیار سے کہا۔ ”تم ڈر کیوں ہے
ہو؟ تم سے اور تمہاری بیوی سے دو تین باتیں پوچھنی ہیں پھر چلا جاؤں گا۔ گھبراتے
کیوں ہو؟“

”چلے کیوں جائیں گے سرکار۔“ اس نے میرے گھٹنے چھو کر کہا۔ ”ہم سر

وں پر بٹھائیں گے۔“

اون ہی بات پر جو چون سے برس ہے ہم نے کیا کیا ہے سرکار؟
"قتل"

وہ بدک کر پیچھے ہٹ گیا۔ بولا۔ "قتل؟... کس کا قتل سرکار؟ ہم سرکار کے
غلام، حکم کے بغیر کبھی بھی نہیں مارتے۔"

"سنو بکو" میں نے دوستانہ لے تکلفی سے کہا۔ "دور در بعد جو اقبال جرم کر گئے
وہ آج ہی کیوں نہیں کر دیتے۔ مال تمہارے گھر سے ابھی برآمد ہوگا۔ لاش برآمد ہو چکی
ہے۔ دوستوں کی طرح ان جاؤ۔ تم ضرور تمہانے جل کر میرے ہاتھ سے الٹا لٹگو گے اور
مرحوں کی دھونی لو گے؟ یاد رکھو جب تک بکو گے نہیں تم جھپٹ سے نکلنے نہ ہو گے
اور نیچے میں آگ میں مر چیں پھینکتا رہوں گا۔" میں اسے دھمکی دے رہا تھا۔
خدا گواہ ہے کہ میں نے تھوڑی گری کا طریقہ کبھی اختیار نہیں کیا تھا۔

اس نے ہاتھ جوڑ کر اور روٹا ہسی آواز میں کہا۔ "سرکار، قرآن پر ہاتھ رکھا
لو۔ میں نے کسی کو قتل نہیں کیا۔ میرے اندر کوئی مال نہیں۔"

"غور سے سنو بکو" میں نے کہا۔ تم قرآن پر ہاتھ نہ رکھو۔ میں قرآن پر ہاتھ رکھ
کر تمہارے ساتھ وعدہ کروں گا کہ تمہیں اس کیس میں سے اس طرح نکال لوں گا جس طرح
مکھن سے بال نکالتے ہیں۔ تم اپنے ساتھی پکا دو۔ میں تمہیں سلطانی گواہ بنا دوں گا۔
بس گواہی دے کر گھر آ جاؤ گے ورنہ پھانسی چڑھو گے۔"

اس کا سارا جسم اس طرح کانپنے لگا جیسے اسے دورہ پڑ گیا ہو۔ میں نے اسے
سہارا دینے کے لیے پھر کہا کہ اس کے بچنے کی یہی ایک صورت ہے کہ وہ سلطانی
گواہ بن جائے مگر اس کا جسم کانپتا رہا اور بات کرنے لگا تو اس کی زبان بھی کانپ

دل کش تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں۔ پھر میں نے اسے پوچھا۔ "تمہاری دوپٹہ اور شلوار کیوں اتار
دی ہے؟ وہ تمہیں بہت اچھی لگتی تھی۔"

اس نے فوراً جواب دیا۔ "ڈرگ جلتے ہیں۔ یہ شلوار اور دوپٹہ مجھے غاوند
نے شہر سے لا دیا تھا۔ شلوار شہر کے درزی سے سلوائی تھی۔"

"کب؟"

"چھ مہینے شاید ہو گئے ہیں۔"

مجھے زیادہ سوال جواب کی ضرورت نہیں تھی۔ میں نے امو سے کہا کہ وہ اندر
چلی جائے۔ وہ چلی گئی تو میں نے بکو کو بلایا اور اپنے سامنے بٹھالیا۔ میں نے اس
سے پاؤں تلے سے زمین نکالنے کے لیے کہا۔

"تمہاری بیوی ہے تو بہت چالاک لیکن بات چھپا نہیں سکی۔ میں نے جو
پوچھا، اس نے صاف بتا دیا۔"

ہمارے لیے ضروری نہیں ہوتا کہ مشتبه ہمارے سوال کا جواب دے تو ہم جواب
پر ہی غور کریں اور اگلا سوال پیدا کریں۔ بعض سوال کر کے مشتبه یا ملزم کے الفاظ
نہیں سنے جاتے بلکہ اس کے چہرے کو دیکھا جاتا ہے کہ اس پر کیا رنگ آتا اور جاتا
ہے۔ چہرے کا رنگ جو بدلتا ہے وہ ہمارے سوال کا صحیح جواب ہوتا ہے۔ میں
نے بکو کے چہرے کو غور سے دیکھا اس کا رنگ سیاہ تھا جس کی تبدیلی نظر نہیں آ سکتی
تھی۔ البتہ اس کی آنکھوں کی پتلیوں نے جو حرکت کی اس سے مجھے جواب مل گیا۔
اس نے بے چینی سے میری طرف دیکھا اور پھر یکجہت بولا۔ "سرکار، اسی

یہاں تک بلکہ کا بیان میرے لیے قابل قبول تھا۔ وہاں تک ایک کار ضرور آئی تھی۔ پگڈنڈی نے مجھے یہی گواہی دی تھی۔ میں آپ کو سنا چکا ہوں کہ جب دیہاتی لاش سے مٹی ہٹا رہے تھے تو میں ارد گرد کے علاقے میں گھومتا تھا پگڈنڈی تک چلا گیا تھا اور وہاں میری نظریں پگڈنڈی پر جم گئی تھیں۔ مجھے وہاں کار کے ٹائروں کے نشان نظر آئے تھے۔ ایک نشان اور بھی تھا جو میں نے اپنے ذہن میں محفوظ رکھا ہوا تھا۔ نمبر دار اور گاؤں کے تین آدمیوں نے یہ بھی بتایا تھا کہ تین چار دن گزرے رات کے وقت انہوں نے اس علاقے میں موٹر گاڑی کی آواز سنی تھی۔ جی نظر نہیں آئی تھی۔ بلکہ کا یہ بیان بھی میرے لیے قابل قبول تھا کہ لاش ابھی گرم تھی اور اکڑی بھی نہیں تھی۔

اس کا مطلب یہ تھا کہ لڑکی کو تھوڑی دیر پہلے قتل کیا گیا تھا۔ کار میں اس کا سانس روکا گیا یا باہر لا کر روکا گیا اور لاش وہیں پھینک کر کار چلی گئی۔ اب یہ سوال تھا کہ شلوار، دوپٹہ اور زیور بیکو کی بیوی تک کس طرح پہنچے۔ بکو نے بتایا کہ وہ لاش کی اطلاع نمبر دار کو دے کر یہ خطرہ مول نہیں لینا چاہتا تھا کہ اس پر رشک کیا جائے یا وہ گواہ کی حیثیت سے پیشیاں بھگتنا رہے۔ چنانچہ میں اسے لڑکی کے کانوں کے بندے چھتے نظر آئے۔ جیسا کہ نمبر دار نے مجھے بتایا تھا کہ بکو شریف آدمی نہیں ہے اور واردات کرنے سے بھی نہیں گھبراتا، میں بکو کا یہ بیان سن کر حیران نہ ہوا کہ اس نے لاش کے کانوں سے دو لڑوں بندے آمار لیے۔ لگے ہیں سونے کی زنجیر اور اس کے ساتھ سونے کا پتہ تھا جس کا سائز ایک روپے کے سگے جتنا تھا۔ ایک انگوٹھی وہیں

رہی تھی۔ میں نے جگن ناتھ اور نمبر دار کو اندر بلا لے آئے اور جگن ناتھ سے کہا کہ وہ دو کا ٹیبل گاؤں میں رہنے دے اور باقی کو اپنے ساتھ تھانے لے جائے اور گاؤں کے ان تین آدمیوں کو جنہیں میں نے تھانے بھیج دیا تھا، میرے آنے تک وہیں بٹھائے رکھے۔

نمبر دار ایک بزرگ کو اپنے ساتھ لے آیا۔ میں بکو کو اندر کرے میں لے گیا تو چارپائی پر بیٹھی تھی۔ مجھے دیکھ کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ نمبر دار اور بڑھا ابھی باہر تھے۔ بکو نے میرا بازو پکڑ لیا اور بہت آہستہ سے بولا۔ "انہیں باہر نکال دیں سرکار۔ پہلے میری بات سن لیں۔ اللہ پاک کی قسم کچھ بھی نہیں چھپاؤں گا۔"

قاتل کے رہزن آئے

میں نے اسے موقع دینے کے لیے ان دونوں کو باہر نکال دیا۔ بکو اپنی بیوی کے سامنے بات کرنا چاہتا تھا لیکن میں نے امو کو باہر بھیج دیا۔ میں چارپائی پر اور بکو فرش پر بیٹھ گیا۔ اس نے جو لمبا چوڑا بیان دیا، وہ مختصر اس طرح ہے کہ چھ سات روز پہلے کا ذکر ہے۔ بکو آدھی رات سے پہلے ایک گاؤں سے اپنے گاؤں کی طرف آ رہا تھا چاندنی رات تھی۔ گاؤں سے دو فرلانگ دور اسے ایک عورت کی لاش پڑی نظر آئی۔ اس کا جسم ابھی تک گرم تھا اور ابھی اکڑا بھی نہیں تھا۔ اس نے بتایا کہ وہ اس جگہ سے ابھی بہت دور تھا کہ اس دیر لانے میں اسے ایک موٹر کی آواز سنی دی تھی۔ کوئی جی نظر نہیں آئی تھی۔ بکو سوچتا رہا کہ اس طرف موٹر کا کیا کام؟ پھر آواز بند ہو گئی۔ تھوڑی دیر بعد موٹر کی آواز پھر سنی دی اور یہ آواز دور جاتے جاتے ختم ہو گئی۔

ہاتھ کی درمیانی انگلی میں تھپی اور ایک بائیں ہاتھ کی چھوٹی انگلی کے ساتھ دالی انگلی میں۔ بکونے یہ تمام چیزیں اتار لیں اور بہت تیز چلنا گھر چلا گیا۔

اس کی بیوی جاگ اٹھی۔ بکونے دیا جلا یا اور زیورات بیوی کے ہاتھ میں دے دیئے۔ بیوی کی ہاتھیں کھل گئیں۔ اس نے بکونے پوچھا کہ یہ چیزیں وہ کہاں سے لایا ہے۔ اس نے بتا دیا کہ ایک لاش سے اتار لایا ہوں۔ یہ سن کر امو گھبرا گئی۔ ایک تو اتنے سارے زیور نے اس کا دماغ خراب کر دیا تھا۔ دوسرے شش ماں تو دماغ زیادہ خراب ہو گیا اور عیسوی دھرم یہ تھی کہ وہ اچلے درہاتی تھے اس لیے کوئی بہتر ترکیب نہ سوج سکے۔ امو نے بکونے کو مشورہ دیا کہ لاش کو کہیں دبا دو۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ کل صبح جب لاش کی رپورٹ پولیس کو ملے تو پولیس تمہارے گھر پر ہمارے گھر پہنچ جائے۔ وہاں لاش نہ ہوئی تو کسی کو پتہ ہی نہیں چلے گا کہ یہاں کوئی قتل ہوا ہے اور اس کا زیور ہمارے پاس ہے۔

بکونے کو یہ بات پسند آگئی۔ اس نے امو سے کہا کہ وہ اس کے ساتھ چلے تاکہ کام جلدی ختم ہو جائے۔ انہوں نے زیورات ٹرنک میں رکھ دیئے۔ کمال اٹھائی اور گاؤں سے نکل گئے۔ گاؤں کے لوگ بیہوشی کی بنید سویا کرتے ہیں۔ سردیوں کی راتیں تھیں۔ سب لوگ اندر سوئے ہوئے تھے۔ باقی علاقہ دیران تھا۔ پکڑے جانے سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ دونوں لاش تک پہنچے۔ ابھی لاش کو کھانے کے کپڑے پہنے ہوئے تھے۔ بکونے ایک ایسی جگہ جہاں تھوڑی سی جھاڑیوں کے درمیان تیاریاں "ابھی تک نہ بھاہی ہے۔ کوئی چیز نہیں آئی تھی۔ بکونے امو لاش کو دیکھنے چلی گئی تھی اور اس نے کہا جگہ خالی تھی گڑھا کھودا۔ اس دوران امو لاش کو دیکھنے چلی گئی تھی اور اس نے کہا کی چوڑیاں بھی اتار لی تھیں۔

دونوں لے لاس اٹھائی۔ بکونے سینڈل دیکھے تو وہ بھی اٹھا لیے۔ لاش گڑھے میں رکھ کر اس نے سینڈل لاش کی ٹانگوں کے درمیان رکھ دیئے۔ امو سینڈل بھی اٹھانے لگی تو بکونے اسے یہ کہہ کر روک دیا کہ یہ شہر کے فیشن کے ہیں گاؤں میں تنک پیدا کریں گے۔ ان بد بختوں نے یہ نہ سوچا کہ زیورات اور کپڑے بھی شہر کے ہی فیشن کے تھے۔ بکونے بتایا کہ لاش گڑھے میں رکھتے اس کا دایاں بازو معلوم نہیں کس طرح اوپر کو اٹھ گیا تھا جو اس نے لاش کے پہلو کے ساتھ لگا دینے کی بجائے گڑھے کی دیوار کے ساتھ لگا دیا۔ اوپر مٹی ڈال دی۔ غالباً دائیں ہاتھ کی انگلی ذرا باہر رہ گئی تھی جو کسی چیز نے سونگھ کر ہاتھ باہر گھسیٹ کر کھا لیا۔ وہاں بھیڑیے نہیں تھے ورنہ لاش باہر نکال لیتے۔

ضروری نہیں تھا کہ یہاں بکونے کے سارے ہی بیان کو سچ مان لیتا میں نے اس سے اس کی جراتہ عادتوں کے متعلق بہت سے سوال پوچھے پھر اسے کہا کہ لاش کو چھپانا اور اس سے چیزیں اتارنا سخت جرم ہے اور مذہب کے لحاظ سے بھی گناہ ہے۔ اس کے افسوس نکل آئے۔ اس نے کہا کہ یہ جرم اس سے اس کی بیوی نے کرایا ہے۔ اس نے اپنی بیوی کے چال چلن کے متعلق بتایا کہ بڑی "شوقین" عورت ہے۔ اسے اچھے کپڑوں اور زیورات کا بہت شوق ہے۔ اس کی طبیعت میں عیاشی ہے۔ پہلے خاندان سے اسی وجہ سے طلاق ملی تھی۔ یہ کم بخت اس وقت کی تیاریاں "ابھی تک نہ بھاہی ہے۔

بکونے اپنی بے عزتی کے ڈر سے اسے طلاق نہیں دیتا تھا بلکہ منتیں کرتا رہتا تھا کہ وہ باز آجائے۔ اسے خوش کرنے کے لیے اس نے جو اکھینا بھی شروع کر دیا

تھا تاکہ پیسے زیادہ کم کر اس کی کپڑوں وغیرہ پر سب سے زیادہ
اس سے تنگ آچکا تھا۔ کئی روز سے وہ اسے سونے کے کانٹے لانے کو کہہ رہی
تھی اور وہ پریشان تھا کہ اتنے پیسے کہاں سے لائے۔ اُس رات وہ ایک گاؤں
میں جُھا کھینے گیا تھا۔ اسی لیے آخری دیر بعد گاؤں واپس آیا تھا۔ راستے میں
اسے لاش ملی، جس کے ساتھ زلیزلہ بھی تھے۔ پتھر کے داغ ہیں یہی خیال چھایا
ہوا تھا کہ اٹو کی فرمائش پوری کرنی ہے ورنہ وہ اسی لپٹ میں کسی اور کے ساتھ
تعلقات قائم کرے گی۔ خدا نے بگو کو موقع دیا اور اس نے یہ سوچے بغیر کہ یہ
جرم ہے یا خدا کی نظر میں گناہ ہے لاش کا زبور اُتار لیا اور جب اٹو وہاں گئی
تو لاش کے کپڑے بھی اُتار لائی۔

میں نے باہر جا کر نمبر دار سے کہا کہ اٹو کے پہلے خاوند کو اس کے گاؤں سے بلا
لے اور اسے اس گاؤں کا نام بھی بتایا جہاں بگو کہتا تھا کہ جُھا کھینے گیا تھا بگو سے
نام پوچھ کر چار آدمیوں کو بلوانے کے لیے کہا۔ نمبر دار اسی وقت چلا گیا۔ میں نے
گاؤں کے جڑگ کو تارخ کو دیا۔ بگو کو کمرے سے نکال کر اس کی بیوی کو اندر بلا
بگو نے فوراً بونا شروع کر دیا تھا۔ مگر اٹو نے مجھے چکر دیے۔ شروع کر دیے۔ نمبر دار
نے ٹھیک کہا تھا کہ یہ شکاری عورت ہے۔ میں اس کی وہ حرکتیں اور باتیں نہیں
سکتا جو اس نے میری مردانگی کو گمراہ کرنے کے لیے کیں۔ میں اس سے کچھ اور پوچھ
اور وہ کوئی اور ہی بات چھیڑ دیتی۔ اس طرح کچھ دیر زبانوں کی آٹھ بھٹی چلا
رہی۔ اس کو یہ غلط فہمی تھی کہ بگو نے شاید مجھے کچھ نہیں بتایا۔
میں نے اس کی چوڑیوں والی کلائی پکڑ کر پوچھا۔ ”چوڑیاں لاش سے

اتارتے دو ٹوٹی تھیں یا زیادہ؟

اس نے جواب دینے کی بجائے یہ حرکت کی کہ میں نے اس کی کلائی پکڑ لی تھی۔
اس نے اسی ہاتھ سے میری کلائی پکڑ لی اور دوسرا ہاتھ میرے ہاتھ پر پھیرنے لگی۔
اس وقت تک میں بھولا بنا رہا تھا۔ میں صحت یہ یقین کرنا چاہتا تھا کہ یہ عورت
کیسے چال چلن کی ہے۔ وہ مجھے یقین ہو گیا۔

میں نے یکایک روٹی بدل لیا اور کہا۔ ”تم اور تمہارا خاوند سیدھے پھانسی
کے تختے پر جا رہے ہو۔ تمہارے خاوند نے اس لڑکی کو قتل کیا اور دونوں نے مل
کر اس کے زلیزلہ اور کپڑے اُتارے۔ کو کیا کہتی ہو؟ تم جاہل دیہاتن مجھے چکر
دے لو گی؟“ وہ بدک گئی۔ میں نے بڑے اطمینان سے کہا۔ ”وہ سارے
آدمی تمہارے خلاف گواہی دیں گے جن کے ساتھ تمہارے تعلقات ہیں۔“

چوڑیاں بھی اُتار دیں

اس نے آخری بار شہر سے کر دیا اور ہو ہو دی کہا جو بگو مجھے سنا چکا تھا۔
فردہ بھر فرق نہیں تھا۔ اپنے چال چلن کے متعلق بھی اس نے کچھ نہیں چھپایا۔
میں نے بگو کو اندر بلا لیا اور دونوں سے کہا کہ خود ہی ساری چیزیں نکال دو۔ دونوں
نے کوئی جیل وحشت نہیں کی ہڑنگ سے تمام چیزیں نکال دیں۔ اُتارنے شلوار
اور دوپٹہ شادی کے لیے پہنا تھا۔ کانوں میں مقننہ کے جُوندے اور انکھیلوں
میں انگوٹھیاں ڈالی تھیں مگر گاؤں میں پولیس کو دیکھ کر اسے ذرا دیر بعد خیال آیا
کہ یہ چیزیں پہچانی نہ جائیں۔ وہ وہاں سے کھسک گئی مگر میں سب کچھ دیکھ چکا

نخا۔ میں جب اس کے گھر میں داخل ہوا تھا تو وہ اندر کپڑے بدل رہی تھی اور یہ چیزیں چھپا رہی تھی۔ اسی لیے بکڑا سے انداز سے بلانے میں دیر لگا رہا تھا۔ اب انہوں نے چیزیں ٹنک سے نکال دیں۔ اتنے شلووار اور دوپٹہ ایک گھر سے لٹکا لاجو کرے کے کوئی نہیں رکھا تھا اور اس پر دو اور گھر سے رکھے تھے۔ یہ کورے گھر سے تھے جن پر رنگ بنگے پھول بنائے ہوئے تھے۔

میں نے تہیہ کر لیا تھا کہ تفتیش جاری رکھوں گا خواہ راتیں اسی گاؤں میں گزارنی پڑیں۔ ان دنوں جرائم کی یہ بھرمار نہیں ہوتی تھی، جو آج پاکستان میں ہے۔ چھوٹے موٹے جرائم ہوتے تھے۔ ایسے پیچیدہ کیس کوئی ایسے زیادہ نہیں ہوتے تھے۔ میرے پاس کچھ وارداتیں تھیں۔ میں نے ان کی تفتیش ملتوی کر دی اور بکڑا اور اس کی بیوی کے بیان کی تصدیق یا تردید ہونے تک گاؤں میں ہی رہنے کا فیصلہ کر لیا۔ لاش کے زیورات اور کپڑے میرے سامنے رکھ دیے گئے۔ اتنے چوڑیاں بھی اتار دیں۔ میں سوچنے لگا کہ ان دونوں کو حراست میں لوں یا ابھی شامل تفتیش ہی رہنے دوں۔ اتنے میں باہر ڈھولوں کی آوازیں آئے گییں اور گھر سے پھٹنے لگے۔ بارش آگئی تھی۔ اس کے فوراً بعد نمبر دار نے اندر آ کر اطلاع دی کہ اتلو کا پہلا خاوند آگیا ہے۔ اس کے اتنی جلدی آنے کی وجہ یہ تھی کہ وہ اسی بارش کے ساتھ آ رہا تھا۔ میں نے اسے اس کی چھوڑی ہوئی بیوی کے گھر بلانا مناسب نہ سمجھا۔ میں نے ایک کانسٹیبل کو بلایا۔ اسے کمرے کے دروازے میں کھڑا کیا۔ بکڑا اور اتلو کو صحن میں بیٹھنے کو کہا اور میں باہر چلا گیا۔

اتلو کے پہلے خاوند سے میں نے اتلو کے چال چلن کے متعلق پوچھا۔ اس نے

بتایا کہ بدکار اور عیاشی عورت ہے۔ اسے امیر زادی بیٹے کا شوق ہے۔ میں نے اس سے پوچھا کہ جویری چٹکڑی بھی کرتی ہے؟ اس نے جواب دیا۔ ”اسے ذرا سال پہلے مل جائے تو سب کچھ کرتی ہے۔“ میں نے چندا رہ باتیں پوچھیں لیکن یہ میری تفتیش کے لیے کوئی خاص نامہ مند نہیں تھیں۔

دن کے پچھلے پہر اس گاؤں کے چار آدمی آگئے جہاں سے بکڑا رات کو واپس آ رہا تھا۔ انہوں نے بتایا کہ بکڑا ان کے گاؤں میں سورج غروب ہو رہا تھا تو گیا تھا اور آدمی رات سے بہت پہلے وہاں سے چلا تھا۔ وہ بتوا کیلئے رہے تھے۔ میں نے ان چاروں کو پابند کر لیا۔ مجھے شک ہوا تھا کہ کہیں یہ دارلہ ان چاروں کی تو نہیں؟ اس کے ساتھ ہی میں نے بکڑا سے کہا کہ اپنا اور اپنی بیوی کا کوئی تھانہ بتلا دو۔ میں دراصل انہیں ابھی گرفتار نہیں کرنا چاہتا تھا۔ میری تجربہ، میری موجودہ وجہ اور اس میاں بیوی کے بیان یقین دلارہے تھے کہ قاتل کوئی اور ہے۔ میں نے نمبر دار کو بلا کر کہا کہ وہ ان دونوں کا ذمہ دار ہے۔ جس وقت ان کی مجھے ضرورت ہو نہیں فوراً حاضر کیا جائے۔ ان سے جو چیزیں برآمد ہوتی تھیں، ان کا میں نے مشیر نامہ بھی نہ بنایا حالانکہ انہوں نے ایک جرم کا ارتکاب کیا تھا۔

میں نے ان چاروں کو جن کے گاؤں میں بکڑا کھینچے گیا تھا اور بکڑا کو بھی ساتھ لیا اور سب کو قحطانے لے گیا۔ انہیں برآمدے میں بٹھا کر میں نے وردی آناری، نہایا اور بڑے آرام سے لیٹ کر سوچنے لگا۔ میرے سامنے یہ حقائق آئے۔

○ زیورات لاش کے ساتھ تھے۔ لہذا یہ رہزنی کی واردات نہیں۔

○ پرسٹ مارٹم رپورٹ کے مطابق یہ اُپر ویزی کی واردات نہیں۔

انہارا کرو گے۔ میں تمہارا بکا بندہ دست کروں گا۔“

ہنسکتا ہے کوئی مجھ پر اعتراض کرے کہ میں نے ایک مشتنبہ اور مجرم کو آزاد چھوڑ دیا تھا۔ میں پہلے کسی کہانی میں لکھ چکا ہوں کہ یہ بھی میرا ایک طریقہ تھا کہ میں بعض اونٹ مشتنبہ افراد کو اس طرح کھلا چھوڑ دیا کرتا تھا جیسے میں ان کے متعلق کچھ بھی نہیں جانتا اور میں بدھ ہوں۔ ایسے لوگوں کو معلوم نہیں ہوتا تھا کہ وہ میرے جبروں کے جال میں گرفتار ہیں اور وہ کوئی حرکت نہیں کے اندر جا کر کریں وہ بھی معلوم ہو جاتی تھی۔ اس طرح یہ لوگ میری تفتیش میں نا اہل طور پر بہت مدد کرتے تھے۔ بکو کو بھی میں نے اسی اصول کے تحت چھوڑ دیا تھا۔ البتہ اسے ہر صبح تھانے میں آنے کا پابند کیا تھا اور نمبردار کو اس کا حاضمان ٹھہرایا تھا۔

ایک اور قتل

رات کو میں دیر سے سویا۔ صبح ذرا دیر سے آنکھ کھلی بیوی نے بتایا کہ ایک کانسٹیبل آیا تھا۔ کہتا تھا کہ ایک واردات آئی ہے۔ میں ناشتہ وغیرہ سے فارغ ہو کر تھانے میں گیا تو وہاں بکو بیٹھا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی کہنے لگا۔

”مجھے باندھ لو سرکار، میں قاتل ہوں۔“

مجھے ایسے لگا جیسے چودہ طبق روشن ہو گئے ہوں۔ بکو اور اس کی بیوی نے لاش کو صرت ٹوٹا ہی نہیں تھا بلکہ قتل بھی انہی نے یاد دہانی کی تھی۔ میں نے اس سے پوچھا۔ ”قتل کس طرح کیا ہے؟“ اس نے جواب دیا۔ ”گلا دبا یا اور مر گئی۔“

۵ کاروبار تک گئی تھی اور واپس آئی تھی۔ لہذا لاش یا مقتول زندہ وہاں تک نہ رہے جاتی گئی۔

۵ بکو اور اس کی بیوی کا قتل کے ساتھ کوئی تعلق نہیں۔
۵ پوسٹ مارٹم رپورٹ میں قتل کا جو دن اور وقت مقرر کیا گیا تھا، اس دن اور اس وقت بکو دوسرے گاؤں میں تھا۔

۵ اگر قاتل بکو جیسے دیہاتی ہوتے تو کھانا پانی استعمال کرتے یا گلہ گھونٹ دیتے۔ سانس روک کر قتل کرنا انگریز ملکوں کا طریقہ قتل ہے اور یہ طریقہ ذہین قاتلوں کا ہے۔ اس ویرانے میں کار کے جانے کا ایک سبب یہ بھی ہو سکتا تھا کہ کوئی امیر زادہ کسی لڑکی کو کار میں بٹھا کر عیاشی کے لیے وہاں لے گیا۔ اس صورت میں اگر کوئی جیسے رہزن حملہ کرتے تو وہاں ایک یا دو آدمیوں کی بھی لاشیں ہونی چاہئیں تھیں یا صرف ایک آدمی کی لاش ہوتی اور لڑکی غائب ہوتی۔

عجیب بات تو یہ تھی کہ لڑکی کو قتل ہوئے ساتواں روز تھا اور ابھی تک شہر کے کسی تھانے میں کسی لڑکی کی گمشدگی کی رپورٹ درج نہیں ہوئی تھی۔ اس سے شک ہوتا تھا کہ لڑکی کسی اور شہر سے لائی گئی ہے۔

میں نے یہ فیصلہ کیا کہ پولیس سٹیڈ کوارٹر کو کھوں گا کہ وہ منٹے کے بڑے بڑے شہروں میں مجھے کو اطلاع دیں اور لڑکی کے نوٹس بھی بھیجیں۔ رات کا اندھیرا گہرا ہو گیا تھا۔ میں نے ان چار آدمیوں کو اور بکو کو بھی اکٹھا بٹھا کر بہت کچھ کہا اور پوچھا اور انہیں یہ حکم دیا کہ روزانہ صبح سویرے نکلتے وقت تھانے میں آجایا کریں۔ میں نے بکو کو الگ کر کے کہا۔ ”ابھی تم نے لاش کے کپڑے اتارے ہیں۔ کل راہ جانے لوگوں کو مار کر کپڑے

”کارکس کی تھی؟“ میں نے پوچھا۔ ”لڑکی کس کے ساتھ آئی تھی؟“ وہ تھکانے سے رخصت ہو کر اپنے گاؤں پہنچا تو گاؤں کے لوگ اس کا انتظار کر رہے تھے۔ گاؤں کے کسی گھر میں پولیس جاتے، وہاں سے مال برآمد کرے اور اس گھر کے کسی آدمی کو تھکانے لے جاتے تو یہ معمولی واقعہ نہیں ہوتا۔ لوگ بات کی تہہ تک پہنچنے کی کوشش کرتے ہیں۔ بکو کا گھر بھی گاؤں کے لیے نمائندہ گاہ بن گیا تھا۔

”اس لڑکی کی جس کی لاش برآمد ہوئی ہے“
 ”نہیں سرکار“ اس نے کہا۔ ”میں اپنی بیوی کی بات کر رہا ہوں سر“
 میں اپنی بیوی کو قتل کر آیا ہوں“
 یہ سن کر مجھے چکر آگیا۔ میں تو سمجھا تھا کہ میری تفتیش ختم ہوئی مگر یہ قتل اتارے ہیں۔ وہ رات کو گاؤں میں داخل ہوا تو لوگ انتظار میں تھے۔ انہوں نے ایک اور کیس اٹھایا۔ میں نے اس کا بیان سنا۔ مختصر طور پر یہ واقعہ اس طرح ہوا۔ اسے گھیر لیا اور گاؤں کے بزرگوں کے سامنے بٹھا دیا۔ اسے کہا گیا کہ لوگ چوری بکو اپنی بیوی کی بدکاریوں اور فرائشوں سے تنگ آگیا تھا۔ اسے دوستوں نے چکاری تو کرتے ہیں۔ مردوں کی طرح ڈاکے بھی ڈالتے ہیں۔ یہ تو نے کیا کیا کر لاش بھی کہنا شروع کر دیا تھا کہ بلکہ اس ناحسنہ کو چلتا کرو، تمہاری عزت ختم ہو چکی۔ کے کپڑے اتار دیے!

اور لوگ تمہاری سردارگی پر شرم کر رہے ہیں۔ مگر وہ امو کو سمجھاتا رہا اور اس کی لاش بھی کرتا رہا۔ امو کو بدکاری کی لت پڑ گئی تھی۔ وہ باز نہ آئی بلکہ اسے یہ کہنے لگی، کی اور کہا کہ لوگ تنگی لاش پڑی دیکھیں تو اس پر کپڑا ڈال دیتے ہیں اور تو نے عورت مجھے زبردستی تین چار چیزیں لا دو۔ پھر میں تمہاری غلام بن کر رہوں گی۔ بکو کو ایک رات ذات کی لاش کو نہنگ کر دیا۔ اب خدا جانے اس گاؤں پر کیا آفت ٹوٹے گی۔ لوگ اس شہری لڑکی کی لاش نظر آئی تو اس نے اس کا زیور اتار کر اپنی بیوی کی فرمائش پر ہلکے بھڑکے ہوئے تھے اس لیے اسے یہ بھی کہ دیا۔ ”ایک تیری بیوی ہے جس پوری کر دی مگر وہ پڑا گیا۔ اس کی بیوی اتنی شوباز اور احمق تھی کہ شہری فیشن نے سارے گاؤں کو گندا کر رکھا ہے۔ تو مردہ تو طلاق دے کر لغزادی کو اور چھٹا کر۔“
 چیزیں جو لاش سے اتاری گئی تھیں، وہ شادی کے موقع پر پہننے پھرتی تھی اور تو اسے لاشوں کے کپڑے اور زیور اتار کر پہنا رہا ہے۔ کل تو گاؤں کی میتوں کے لاش کے کپڑے اُس وقت بھی پہنے رکھے جب پولیس گاؤں میں موجود تھی۔ کفن اتارے گا۔

میں بکو کو تھکانے لے آیا تھا۔ لاش کے کپڑے اور زیورات بھی لے آیا تھا۔ بکو کچھ بھی نہ بولا۔ اس نے بزرگوں کے پاؤں کپڑے اور وہاں سے اٹھ گیا۔ اب اس نے قتل کی کاغذی کارروائی کرنی تھی۔ بکو نے بیان دیا کہ رات کے گھر گیا تو بیوی منہ لبورے بیٹھی تھی۔ اس نے بکو کو پہلی بات یہ کہی۔ ”میں پہلے

اعمال چار آدمیوں سے بیان لیے۔ لاس پوسٹ مارٹم کے لیے بھجوائی۔ تمام تر
کاغذات تیار کیے اور جیب میں تنانے میں واپس گیا تو شام کے چار بج رہے
تھے۔ وہاں دو آدمی پیچھے میرا انتظار کر رہے تھے۔ تھکانے کے احاطے کے باہر
ایک پرانی سی کار کھڑی تھی۔ یہ غالباً اسی میں آئے تھے۔ ایک بوڑھا تھا اور دوسرا
جوان، پورے کی عمر ساٹھ سال سے زیادہ معلوم ہوتی تھی اور جوان چھبیس ستائیس
سال کا ہوگا۔ دونوں امیر خاندان کے آدمی تھے۔ بوڑھے نے اپنا تعارف کرایا
کا نام حمید الدین تھا اور جوان آدمی اس کا داماد تھا جس کا نام اعجاز حسین بتایا
گیا۔ بڑے میاں انبار سے آئے تھے۔ اعجاز حسین میرے شہر میں ٹھیکیداری کرتا
تھا۔ بڑے میاں کے ہاتھ میں وہی اخبار تھا جس میں لڑکی کی لاش کے چہرے کی
تصویر چھپی تھی۔ اس نے بتایا کہ یہ تصویر غالباً اس کی بیٹی کی ہے۔ اس نے کہا۔
"اس کا چہرہ اتنا بھرا نہیں تھا لیکن ہی کی معلوم ہوتی ہے۔"

"یہ تصویر مرنے کے چوتھے روز لی گئی تھی۔" میں نے اسے بتایا۔ "چہرہ پھولا
ہوا تھا۔ اب اگر لاش قبر سے نکالی گئی تو اور زیادہ خراب ہو چکی ہوگی۔" پھر میں نے
اس سے پوچھا۔ "آپ نے یہ تصویر کب دیکھی ہے؟ یہ تو تین چار دن پرانا اخبار
ہے؟"

"ذی کل صبح یہاں آکر دیکھی ہے۔" اس نے جواب دیا۔
میں نے اس کے داماد اعجاز حسین سے پوچھا۔ "آپ تو یہیں تھے۔ آپ
نے اپنی بیوی کی تصویر ہمیں پہچانی؟"

"میں نے بھی کل ہی دیکھی ہے۔" اس نے جواب دیا۔

روز ہی جان گئی تھی کہ تو مرد ہی نہیں ہے۔ تھانیدار نے ذرا سارے دبا اور ٹوک
پڑا۔ اور اس نے اس طرح کی جلی کٹی اور باتیں اسے کہیں۔ بکو خاموشی سے
سناتا رہا۔ وہ چپ ہوئی تو بکدے صحت انسا کہا۔ "میں جانتا تھا کہ تو بیکار ہے،
لیکن اپنی عزت کی خاطر میں نے تجھے خوش کرنے کے لیے جو اکھیلا اور پیچ
تیری خوشی کے لیے میں نے لاش کا زہر اتارا اور تو نے لاش کا ستر ننگا کیا۔ اب
تجھے طلاق نہیں ملے گی اور اب تو کسی کی بیوی نہیں بنے گی۔"

یہ کہ کر وہ تیزی سے آگے بڑھا اور امو کی گردن اپنے ہاتھوں میں دہالی
چھوڑا اس وقت جب وہ مرگئی۔ اس نے لاش کو کندھے پر اٹھایا۔ گاؤں کے
درمیان کھلی جگہ تھی۔ وہاں لاش کو پھینکا اور بڑی زور سے مختلف آدمیوں
کو آوازیں دینے لگا۔ ٹھوڑی دیر میں سارا گاؤں اس کے گرد جمع ہو گیا۔ بعض لوگ
دیسے اور لائینیں جلا لائے۔ دیکھا کہ وہاں امو کی لاش پڑی ہے۔

بکو نے سب سے کہا۔ "میں نے تم سب کا نام بنام کیا ہے، صرف اس
عورت کو خوش رکھنے کے لیے۔ یہ دیکھو۔ تم سب کو خوش رکھنے کے لیے میں نے
اس کا گلا گھونٹ دیا ہے۔ اب مجھے بخش دو۔ میرے گناہ بخش دو۔ میں تھکانے
جار ہوں۔" لوگ حیران و ششدر کھڑے رہے اور بکو تھکانے پہنچ گیا۔
اس نے مجھے بیان دیتے ہوئے کہا۔ "اس کا پہلا خاوند بزدل تھا۔"

نے اسے طلاق دے دی تھی۔ ایسی عورت کو زندہ ہمیں چھوڑنا چاہیے۔"
یکسین میرے لیے آسان تھا۔ صرف شہادت اکٹھی کرنی تھی۔ انبال جرم
تھا۔ میں نے بکو کو حوالات میں بند کیا۔ اس کے گاؤں گیا۔ لاش دیکھی۔ تھکا

لوٹکی کے باپ نے کہا۔ ”مجھے پرسوں انبار میں اس کا (اعجاز حسین، داماد) مجھ سے زیادہ نہیں جانتے۔ اس کے پاس ایسا کوئی سوٹ نہیں تھا۔

خط ملا۔ اس نے پوچھا تھا کہ کتنوم (مفتولہ) مجھے بتاتے بغیر آپ کے پاس چلی گئی ہے۔ یہ زیورات دیکھ لیں۔“ میں نے تمام زیورات ان کے آگے رکھ دیئے۔

وہ کب واپس آ رہی ہے۔ کیا میں اسے لینے آؤں؟ کتنوم انبار میں آئی تھی۔ مجھے

پریشانی ہوئی۔ میں اسی وقت گاڑی میں بیٹھا اور یہاں آگیا۔ اعجاز کو بتایا کہ کتنوم انبار

نہیں آئی۔ یہ بھی پریشان ہو گیا۔ اسے گئے سوئے چھ سات روز ہو گئے تھے۔ اعجاز نے

مجھے بتایا کہ کئی بار وہ فیروز پور اپنے ماموں کے ہاں گئی تھی۔ ہم نے اس کے ماموں کو تار دیا۔

اس کا جواب کل صبح دس بجے بذریعہ تار ملا۔ اس نے کھا ہے کہ کتنوم فیروز پور نہیں گئی

یہی وجہ کہیں تھیں جہاں وہ جا سکتی تھی۔ اعجاز کو اچانک یاد آیا کہ اخبار میں کسی لوٹکی

کی تصویر شائع ہوئی تھی جو قتل ہو گئی ہے اور اس کے وارث نہیں مل رہے۔ اس

نے تین چار روز پرانے اخبار دیکھے اور ہم دونوں تصویر کو غور سے دیکھنے لگے۔ مرن

چہرہ تھا، آنکھیں بند تھیں۔ چہرہ مڑا تھا۔ اس لیے ہم پوری طرح پہچان نہ سکے۔ مجھے

ستر فیصد یقین ہے کہ یہ کتنوم کی تصویر ہے۔ ہم پولیس ہیڈ کوارٹر گئے۔ وہاں سے ہمیں

آپ کے پاس بھیجا گیا ہے۔“

”میں آپ کو وہ کپڑے اور زیورات دکھا سکتا ہوں جو لوٹکی کی لاش سے اتارے

گئے ہیں۔“ میں نے کہا۔ ”آپ ان کی مدد سے کسی فیصلے پر پہنچ سکتے ہیں۔“ میں

نے سب سے پہلے شلوار، قمیض اور دوپٹہ ان کے آگے رکھا۔

باپ اٹھ بیٹھ کر یاد کرنے لگا۔ اس نے ماتھے کو ہاتھ سے رگڑا۔ آخر بولا۔ ”میرا

یہ ہے کتنوم ایک بار انبار اس سوٹ میں آئی تھی۔“

آپ کو غلط فہمی ہو رہی ہے۔ ”اعجاز حسین نے کہا۔ ”اس کے کپڑوں کو آپ

میرا ہونا ہوتا اور اگر آنکھیں کھلی ہوتیں تو بھی یہ کتنوم کا چہرہ نہیں ہے۔“

”یہ دونوں چیزیں کتنوم کی نہیں ہیں۔“ اعجاز حسین نے کہا۔ ”مجھے یقین ہے کہ

اس نے خود کی تھی کہ وہ زیور اور تپا بدل کر ایک اور ڈیزائن کی زنجیر اور لاکٹ لینا

چاہتی ہے۔ میرے منع کرنے کے باوجود اس نے زنجیر دے کر لاکٹ والی زنجیر لے لی

تھی۔ مجھے اٹھانی سو روپیہ اس کے ساتھ ادا کرنا پڑا تھا اور انگوٹھی وہ ایک ہی

انگلی میں رکھتی تھی۔ یہ در انگوٹھیاں ہیں۔“

پھر میں نے انہیں چوڑیاں اور سینڈل دکھائے۔ باپ نے کہا کہ ان کے متعلق

وہ کچھ نہیں کہہ سکتا۔ اعجاز حسین نے کہا۔ ”میں پورے اعجاز کے ساتھ بات کر سکتا

ہوں۔ اس نے کاپڑ کی چوڑیاں کبھی پہنی ہی نہیں تھیں اور یہ سینڈل تو اس کی

پسند کے ہیں ہی نہیں۔ وہ ہلکے پھلکے سینڈل پسند کرتی ہے۔“

باپ خاموش ہو گیا۔ وہ بار بار اخبار کے نوٹوں کو دیکھتا تھا۔ میں نے میز کی دراز

کھولی۔ اس میں اصل لوٹکی ایک کاپی پڑی تھی۔ میں نے وہ ان کے آگے رکھ دی اور

کہا کہ اخبار میں تصویر صاف نہیں آئی۔ آپ یہ دیکھ لیں۔ نوٹ سب سے پہلے اعجاز نے

دیکھی اور فیصلے کے لیے میں بولا۔ ”اوہ بالکل نہیں۔ یہ کتنوم کی تصویر نہیں۔ اگرچہ

میرا ہونا ہوتا اور اگر آنکھیں کھلی ہوتیں تو بھی یہ کتنوم کا چہرہ نہیں ہے۔“

۲۹

۲۸

جھانسنے دے رہے ہیں۔ آپ کی بیٹی آپ کے پاس لگی ہے۔ آپ نے اسے چھپایا ہے اور مجھے کر رہے ہیں کہ وہ گھر نہیں گئی۔“

”دیکھئے انسپکٹر صاحب!“ سسر نے مجھے مخاطب کر کے کہا۔ ”ایک بار اس ظالم کے بچے نے میری بیٹی کو مار پیٹ کر گھر سے نکال دیا تھا۔ وہ پانچ چھ درز میرے گھر رہی اور واپس آگئی۔ وہ کہتی تھی کہ یہ کم بخت کا بچہ شراب پیتا ہے اور زندگی بڑی بھی کرتا ہے۔ اب مجھے دھمکیاں دیتا ہے کہ میں نے اپنی بیٹی کو چھپا لیا ہے۔ جناب، مجھے شک ہے کہ اس نے میری بیٹی کو یا قتل کر دیا ہے یا قتل کروا دیا ہے۔“

اعجاز حسین بھڑک اٹھا اور بولا۔ ”اور اپنی بیٹی کے کڑوت آپ نہیں بتائیں گے؟ آپ مجھے زندگی باز کہتے ہیں۔ وہ تو خود زندگی بنی ہوئی ہے۔ میں یہ بھی کہوں گا کہ وہ اپنے کسی یار کے ساتھ چلی گئی ہے۔“

سسر نے چلا کر کہا۔ ”بکواس بند کر کے بچتے۔“

میں نے انہیں خاموش کر کے کہا۔ ”یہ پولیس سٹیشن ہے جناب، آپ کا گھر نہیں ہے۔ آپ اگر اس لڑکی کو شناخت کر سکتے ہیں تو مجھ سے بات کریں ورنہ تشریف لے جائیں۔“

اعجاز حسین فوراً اٹھا اور مجھ سے پوچھا۔ ”ذنبہ، مجھے بتائیں کہ میں اس کے خلاف کہاں رپورٹ درج کرواؤں کہ اس نے میری بیوی کو روپوش کر رکھا ہے۔“

”آپ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کے پاس چلے جائیں۔“

وہ بہت تیزی سے باہر نکل گیا۔ بوڑھا سسر بیٹھا رہا۔ اس نے اعجاز حسین کے خلاف بہت سی باتیں کیں اور اپنی بیٹی کو مظلوم بتایا۔ اس نے یہ بھی کہا کہ وہ

نرٹو باپ نے لے لی۔ بہت دیر دیکھتا رہا اور کہنے لگا۔ ”کلنڈم میری بچی ہے، وہ چونکہ لاپتہ ہے، اس لئے آنکھوں کے سامنے اسی کی تصویر ہے۔ میں یقین سے نہیں کہہ سکتا۔ کبھی یہ چہرہ اسی کا لگتا ہے اور کبھی یقین آتا ہے کہ یہ میری بچی کا چہرہ نہیں ہے۔ (اعجاز) کہتا ہے کہ یہ کپڑے اس کے نہیں ہیں تو میں کیا کر سکتا ہوں۔“

سسر، مادا اور مقتولہ

اعجاز حسین نے مجھے یقین دلادیا تھا کہ یہ اس کی بیوی کی تصویر نہیں۔ اس کا سسر بھی کوئی فیصلہ نہ کر سکا۔ میں نے اعجاز سے کہا۔ ”آپ نے کہا تھا کہ آپ کا بیوی آپ کو بتائے بغیر اپنے والدین کے ہاں انبال چلی گئی ہوگی۔ کیا اس سے پہلے بھی وہ آپ کو بتائے بغیر کبھی گئی ہے؟“

”چار پانچ دفعہ مجھے بتائے بغیر گئی ہے۔“

”کوئی وجہ؟“

”لوٹ کر گئی تھی۔“ اس نے کہا۔ ”اب بھی لوٹ کر گئی ہے۔ یہ اس کی عادت ہے۔“

”اس کی نہیں۔ یہ تمہاری عادت ہے۔“ اس کے سسر نے غصے میں کہا۔ ”وہ“

جتنی بار گھبراہٹ ہے اس نے مجھے بتایا ہے کہ تم اسے پریشان کرتے ہو اور طلاق کی دھمکیاں دیتے رہتے ہو۔“

فوراً ہی وہ جھگڑنے لگے۔ میں اس پر سمجھانے لگا کہ ان دونوں کا مقتولہ کے

ساتھ کوئی تعلق نہیں تھا۔ پھر میں یہ سوال کیوں کر بیٹھا کہ وہ پہلے بھی کبھی بتائے

بغیر گئی تھی؟ ان کا جھگڑا بڑھ گیا۔ اعجاز حسین نے اپنے سسر سے کہا۔ ”آپ مجھے

پڑی۔ میں وہیں جھک گیا اور کچھ دیر زمین کو دیکھتا رہا۔ ایک دو منٹ بعد مجھے اس طرح معلوم ہوا جیسے میں تھکانے کے سامنے نہیں بلکہ اس پگڈنڈی پر کھڑا ہوں، جس کے قریب سے لاش برآمد ہوئی تھی۔ گواہی جو پگڈنڈی نے دی تھی، وہی گواہی میرے تھکانے کے سامنے کی زمین دے رہی تھی۔ یہ ایک تنگ سڑک تھی جس کے ساتھ خاصی چوڑی کچی زمین تھی۔ اس پر مجھے چار پانچ اپنے جگہ پرتیل گرہا نظر آ رہا تھا اور اس کے دائیں اور بائیں ایک کار کے ٹائروں کے نشان تھے۔ نیل کا یہی دھبہ میں نے ٹائروں کے اسی قسم کے نشانوں کے درمیان پگڈنڈی پر دیکھا تھا۔ پگڈنڈی پر جو نشان تھے، ان سے مجھے اتنا ہی پتہ چلا تھا کہ اس دیرانے میں وہاں تک ایک موٹر گاڑی گئی ہے، وہاں رکی ہے اور وہیں سے واپس ہوئی ہے۔

ٹائروں کے نشان پر کسی مجرم کو نہیں پکڑا جا سکتا کیونکہ ایک ہی قسم کے ٹائر اتنے بڑے شہر میں سینکڑوں گاڑیوں کے ہو سکتے ہیں۔ لیکن ان نشانوں میں جو مجھے پگڈنڈی پر اور پھر سڑک کے کنارے کچی زمین پر نظر آئے تھے، دو چیزیں مشترک تھیں۔ ایک یہ تھی کہ ان کے درمیان نیل کا دھبہ تھا۔ کار پرانی تھی جس سے نیل ٹپکنا تھا۔ قطرہ قطرہ۔ دوسری یہ کہ ایک ٹائر گھسا ہوا تھا۔ اس کا نشان پگڈنڈی پر بھی ایسا ہی تھا اور میرے تھکانے کے سامنے بھی ایسا ہی۔ میں نے پگڈنڈی پر تیل کا دھبہ دیکھ کر بھی سوچا تھا کہ کار بہت پرانی ہے۔

میں جب گاؤں سے آئے ہوئے تھانے تک پہنچا تھا تو کریم رنگ کی ایک کار سیاں کھڑی دیکھی تھی۔ اندر گیا تو یہ سسر اور داماد میرے انتظار میں بیٹھے تھے۔

بھی ڈسٹرکٹ جج صاحب کو درخواست دے گا کہ اس نے میری بیٹی کو قتل کر دیا ہے۔ اسے مجبور کیا جائے کہ کھنڈم و عدالت میں لائے۔ یہ بزرگ میرے لیے ایک اہم گواہ بن سکتا تھا۔ میں نے اس سے پوچھا۔

”کیا آپ سڑک کی تعمیر اور اس کی چیزوں کی شناخت کر سکتے ہیں یا نہیں؟“

مجھے ہاں یا نہی جواب دیں۔ اس نے ایک بار پھر تصور کو غور سے دیکھا، اس کی چیزوں کو دیکھا اور سڑک کے لیے جی بی بولا۔ ”میں ہاں بھی نہیں کہہ سکتا اور نہ بھی نہیں کہہ سکتا میں ابھی تک شک میں ہوں۔“

میں نے اسے شامل تفتیش کر لیا اور اس کا ایڈریس لے کر اسے کہا کہ مجھے جب بھی اور جس وقت بھی اس کی ضرورت پڑی اسے فوراً حاضر ہونا پڑے گا۔ اس نے سنجوشی قبول کر لیا اور وہ پھر اپنے داماد کو برا بھلا کہنے لگا۔ بوڑھا اٹھنے کا نام ہی نہیں لیتا تھا۔ میں خود اٹھا اور اسے یہ کہہ کر اٹھایا کہ میں ایک تفتیش کے سلسلے میں باہر جا رہا ہوں۔ میں اسے تھکانے سے باہر لے گیا اور احاطے سے بھی باہر سڑک تک اس کے ساتھ چلا گیا۔ اس کا داماد کار لے گیا تھا۔ بوڑھے نے گالی دے کر کہا۔ ”اپنا سامان لینے کے لیے مجھے اس خبیث آدمی کے گھر جانا پڑے گا۔“ میں نے اس سے پوچھا کہ آپ کہاں تک جائیں گے؟ میں تانگہ رکوانا ہوں۔ اس نے مجھے کوشی کا نمبر اور سڑک بتا دی۔ میں نے ایک تانگہ روکا اور بوڑھے سے جان چھڑائی لیکن وہ میرے لیے ایک کار آمد قسم کا شک پیدا کر گیا۔

تانگہ دوڑ نکل گیا تو میں اپنے دفتر کی طرف واپس مڑنے لگا۔ میری نظر زمین پر

کہہ دیتا تھا کہ نہیں، یہ اس کی نہیں۔ تصویر دیکھ دیکھ کر باپ کہتا تھا کہ یہ کلنڈم کی ہے اور پھر شک میں پڑ جاتا تھا اور اعجاز نے صاف کہہ دیا کہ یہ اس کی بیوی کی تصویر نہیں۔ مجھے اس کا انداز یاد آ رہا تھا۔ اب اس کی کار کا نشان دیکھ کر مجھے شک ہونے لگا کہ وہ اس کو تش میں تھا کہ اس کی بیوی کا باپ تصویر کو نہ پہچانے۔

بہر حال یہ تصویر اگر اعجاز کی بیوی کی یا حمید الدین کی بیٹی کی نہیں بھی تھی تو بھی میرے لئے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ میرا مسئلہ تو یہ تھا کہ ایک لڑکی قتل ہو گئی ہے اور جہاں سے لاش برآمد ہوئی ہے، اس کے قریب ایک کار کے ٹائروں کے نشان تھے، ان کے درمیان تیل کا دھبہ تھا۔ یہی نشان میرے تھانے کے سامنے مجھے نظر آئے تھے۔ ان سے مجھے یقین ہو گیا تھا کہ ویرانے میں یہی کار گئی تھی ضروری نہیں کہ کار اعجاز ہی لے گیا ہو۔ ہو سکتا ہے اس کا کوئی دوست اس کی کار مانگ کر لے گیا ہو اور کسی لڑکی کو اس میں قتل کر کے لاش وہاں پھینک آیا ہو۔ مجھے اس کار کو زیر تفتیش لانا تھا۔

میں نے اعجاز سے اس کے کار و بار اور دفتر وغیرہ کے متعلق پوچھا تھا، جو مختصرانہ طور پر کی عادت میں شامل ہوتا ہے۔ اس طرح مجھے اس کے پرائیویٹ دفتر کا علم ہو گیا تھا۔ اس کے سسر سے میں نے اعجاز کی رہائش پوچھی تھی۔ اس نے کوٹھی کا نمبر اور سڑک بتادی تھی۔ میں نے اپنے ایک ڈی۔ ایف۔ سی (ڈائیکٹیٹنگ ٹائپسٹیل) بشیر احمد اور سٹیٹ کانسیٹیل جگن ناتھ کو ساتھ لے کر ساتھ لیا اور اعجاز کی کونٹری کی طرف چل پڑے۔ اس کے سسر کو تھانے سے گئے کوئی پون گھنٹہ گزر چکا تھا۔ میں جب اعجاز کی کوٹھی تلاش کرنا اس کی کوٹھی میں پہنچا تو معلوم ہوا اس کا سسر جا چکا ہے اور

اب باہر یا تو کار و بار (اعجاز حسین) لے جا چکا تھا۔ کار اسی کی تھی۔ ٹائروں کے نشان دیکھ کر میرے ذہن میں اعجاز اور اس کے سسر کا جھگڑا گونجنے لگا۔ آپ ان کی تکرار پڑھ چکے ہیں۔ آپ سمجھ گئے ہوں گے کہ اعجاز اور اس کی بیوی کی آپس میں ناچاقی تھی اور ناچاقی بھی اس حد تک تھی کہ اعجاز نے، سسر کے بیان کے مطابق، ایک بار اپنی بیوی کو مار پیٹ کر نکال دیا تھا اور وہ اپنے والدین کے پاس انبار چلی گئی تھی۔

سسر اعجاز کو شرابی وغیرہ کہہ رہا تھا اور اعجاز اپنی بیوی کو رٹھی کہہ رہا تھا اور یہ بھی کہ وہ تین چار بار لڑکر اپنے والدین کے ہاں اسے بتائے بغیر چلی گئی تھی۔ میرا دماغ اور میری نظر ایک پولیس مین کی تھی۔ اس لیے میں بال کی کھال اتارنے لگا۔ ان دونوں کا ایک ایک لفظ یاد کر کے، وہیں کھڑے کھڑے، اپنے دماغ میں الجھنے پلٹنے لگا۔ میں نے اس وقت جب وہ میرے سامنے بیٹھے ہاتھیں کر رہے تھے، ان کی باتوں سے تو جہ ہٹالی تھی کہونکہ میں نے دیکھ لیا تھا کہ وہ مقتولہ کو شناخت نہیں کر سکے اور مقتولہ کے کپڑے اور زیورات دیکھ کر اعجاز نے فیصلہ دے دیا تھا کہ یہ اس کی بیوی کے کپڑے نہیں۔ یہ سن کر میں انہیں ٹانے کی کوشش کر رہا تھا لیکن اب ٹائروں اور تیل کا نشان دیکھ کر میں ان کی باتیں یاد کرنے لگا۔

سسر نے کہا تھا کہ اعجاز نے اس کی بیٹی کو قتل کر دیا یا کر دیا ہے۔ گویا نوبت ایسے شکوک تک پہنچی ہوئی تھی۔ پھر مجھے خاص طور پر یاد آیا کہ لڑکی کے باپ نے کپڑے، انگوٹھی اور گھٹے کی زنجیر دیکھ کر کہا تھا کہ یہ چیزیں اس کی بیٹی کی ہیں مگر اعجاز نے اس کی تردید کر دی تھی۔ باپ جو چیز دیکھتا تھا سوچ میں پڑ جاتا تھا اور اعجاز فوراً

نے کبھی شراب نہیں پی تھی۔ نوکر کو یہ بھی علم نہیں تھا کہ اعجاز کے تعلقات کسی اور لڑکی کے ساتھ تھے یا نہیں۔ شادی کا یہ تیسرا سال تھا۔

میں نے نوکر سے پوچھا۔ ”تمہیں یاد ہے کہ بیگم گھر سے کس روز گئی تھی؟“

اس نے جواب دیا۔ ”جی ہاں، مجھے یاد ہے۔ شام کا کھانا کھا کر اعجاز صاحب اور بیگم صاحبہ گاڑی میں گئے تھے۔ رات کے شاید گیارہ بجے تھے جب مجھے گاڑی واپس آنے کی آواز آئی۔ میرا اندر کوئی کام نہیں تھا۔ اس لیے میں اندر نہیں گیا۔ صبح ناشتہ لگا رہا تھا تو اعجاز صاحب نے مجھے کہا کہ ناشتہ صرت میرے لیے لگاؤ، بیگم رات کو انبالہ چلی گئی ہیں۔ میں سمجھا کہ رات کو اعجاز صاحب بیگم صاحبہ کو سٹیشن پر لے گئے تھے۔ اور میں ابھی تک یہ سمجھ رہا ہوں کہ وہ انبالہ گئی ہوئی ہیں۔“

میں نے اپنے کان غدرل میں سے وہ اخبار نکالا جس میں کلثوم کی تصویر تھی۔ یہ اخبار نوکر کے ہاتھ میں دے کر اسے کہا۔ ”یہ تصویر پہچان سکتے ہو؟“

اس نے تصویر کو آنکھوں سے دور کر کے دیکھا اور بولا۔ ”اسٹنڈ جھوٹ بولو، بیگم صاحبہ کی تصویر معلوم ہوتی ہے۔ بھرا اور غدر سے دیکھ کر بولا۔ ”ہاں حضور، بیگم صاحبہ ہیں۔“ وہ یحیٰی گھبرا گیا اور اس کے منہ سے نکلا۔ ”ہاں، یہ کیا لکھا ہے؟“ لاش سول ہسپتال کے سردار نے میں پڑی ہے؟“ نہیں یہ کوئی اور ہوگی۔ اعجاز صاحب کہتے تھے کہ....“

”یہی ہے؟“ میں نے کہا۔ ”تم نے اس سے پہلے اخبار نہیں دیکھا تھا؟“

”ہم غریب لوگ اخبار کماں پڑھتے ہیں۔“

”مجھے یہ بتاؤ کہ تم نے پہلی ہی نظر میں پہچان لیا تھا کہ یہ بیگم کلثوم کی تصویر ہے؟“

اعجاز گھر میں نہیں ہے۔ میں نے کوٹھی کے سامنے، برآمدے کے ساتھ دیکھا۔ وہاں نیل گزتا رہا تھا۔ میرے سامنے اعجاز کا ایک نوکر کھڑا تھا۔ اس نے میرے پوچھنے پر بتایا کہ گھر میں اس کے سوا اور کوئی نہیں ہے۔ کھانا پکانے تک کا کام یہی نوکر کرتا تھا۔ گھر کے دوسرے کام، جھاڑ پونچھ وغیرہ ایک عورت کرتی تھی جو اس وقت وہاں نہیں تھی۔

بیگم کا چلن اچھا نہ تھا

میں نے نوکر سے پوچھا۔ ”بیگم کہاں ہیں؟“ اس نے لاپرواہی سے جواب دیا۔ ”میں کیا کہہ سکتا ہوں حضور، نوکس روز سے گئی ہوئی ہیں۔ معلوم نہیں کہاں گئی ہیں۔“

میں نے اس کا بے پردہ انداز دیکھا تو اسے کہا کہ میں ایک قتل کی تفتیش کر رہا ہوں اس لیے وہ مجھے ہر سوال کا جواب صحیح دے۔ میں نے اس سے بہت سی معلومات حاصل کیں جن سے ظاہر ہوا کہ اعجاز حسین اور اس کی بیوی کے تعلقات کشیدہ تھے اور ان کا آپس میں کئی بار جھگڑا بھی ہو چکا ہے۔ بیگم کا نام کلثوم ہے۔ نوکر میرے اس سوال پر جھجک گیا کہ بیگم کا چال چلن کیسا تھا۔ میں نے اسے ڈرانے و دھمکانے کی بجائے دوستانہ طریقے سے پوچھنے پر آمادہ کر لیا اور اسے یہ احساس بھی دلا دیا کہ اسے آخر گواہی دینی ہی پڑے گی اور اگر اس نے جھوٹ بولا، تو ساری بات کھل جانے پر وہ خواہ مخواہ پکڑا جائے گا۔ اس نے یہ رائے دی کہ بیگم اچھے چال چلن کی عورت نہیں تھی۔ اعجاز کے متعلق اس نے بتایا کہ گھر میں اس

میں دے دی جسے وہ دیکھنے لگا۔ پھر اس نے میری طرف دیکھا۔ شاید اس کے دل کا چور جاگ اٹھا تھا۔ وہ چپ رہا۔

”اعجاز صاحب“ میں نے اطمینان کے لیے میں پوچھا۔ ”یہ تصویر کس کی ہے؟“

”میں نے آپ کو بتایا تھا کہ یہ کسی اور کی ہے۔“ اس نے جواب دیا۔

”کیا یہ ضروری ہے کہ آپ کے گھر سے آپ کی بیوی کی کوئی تصویر لے کر اس تصویر کے ساتھ ملاؤں؟“ میں نے کہا۔ ”آپ کو شاید معلوم ہوگا کہ ہمارے پاس ایسے پیشبیلٹ بھی ہوتے ہیں۔“

”کیا آپ مجھ سے خواہ مخواہ منوانا چاہتے ہیں کہ یہ میری بیوی کی تصویر ہے؟“ اس نے کہا اور مجھ سے پوچھا۔ ”آپ کا مطلب کیا ہے؟“

”اعجاز صاحب“ میں نے کہا۔ ”میرا مطلب بالکل صاف ہے۔ میں ایک لڑکی کی لاش ملی ہے۔ اس کی شکل آپ کی بیوی سے ملتی ہے۔ میں مجبور ہوں کہ آپ سے چند ایک اٹلے سیدھے سوال کروں تاکہ مجھے یقین ہو جائے کہ یہ آپ کی بیوی نہیں ہے۔ میں آپ پر کوئی چیز ٹھونس نہیں رہا میں آپ کو کوئی بھی الزام تسلیم کرنے پر آمادہ نہیں کروں گا۔ میں نے آپ کی عزت افزائی کی ہے کہ میں یہاں آگیا ہوں ورنہ آپ جاننے ہیں کہ ہم سوال و جواب کے لیے تھانے بلایا کرتے ہیں۔ آپ بالکل نہ مانیں کہ یہ آپ کی بیوی کی تصویر ہے۔“ میرے ٹھنڈے ٹھنڈے رویے سے وہ کچھ سنہیل گیا۔

”آپ کا کاروبار شاید اچھا نہیں چل رہا؟“ میں نے کہا۔

”آپ کو یہ خیال کیوں آیا؟“

”اس لیے کہ آپ گاڑی کا وہ ٹائر بھی تبدیل نہیں کر سکتے جو گھس گیا ہے۔“

”ہاں حضور!“ اس نے جواب دیا۔ ”چہرہ ذرا مڑا ہے لیکن تصویر میں اتنا فرق تو آ ہی جاتا ہے۔ پہچاننے میں کوئی وقت نہیں ہوتی۔“

یہ جواب میرے لیے اہم تھا۔ مقتدر کے باپ نے تصویر کو پہچان لیا تھا لیکن اعجاز نے اسے یقین دلادیا تھا کہ یہ کثوم کی تصویر نہیں۔ باپ تو ابھی سننا چاہتا تھا کہ اس کی بیٹی زندہ ہے اور ٹھیک ٹھاک ہے۔ اس لئے وہ مان گیا کہ یہ اس کی بیٹی نہیں۔ نوکر کے جواب سے میں اس نتیجہ پر پہنچا کہ تصویر کو ذرا سا غور سے دیکھو تو پہچانی جاتی ہے کہ یہ کس کی تصویر ہے۔

شہادت اعجاز حسین کے خلاف اکٹھی ہوتی جا رہی تھی۔ میں نے نوکر سے پوچھا کہ اعجاز صاحب کس وقت آئیں گے؟ سوچ غروب ہو چکا تھا۔ نوکر نے بتایا کہ انہیں اب آ ہی جانا چاہیے۔ میں نے نوکر سے کہا کہ ہم یہیں برآمدے میں بیٹھیں گے۔ وہ چلا جائے اور اعجاز کو بالکل نہ بتائے کہ میں نے اس سے کوئی بات کی یا پوچھی ہے۔ میں برآمدے میں بیٹھا رہا۔ شک کی کوئی گنجائش نہیں رہی تھی، معاملہ یقینی تھا۔ میں سوچنے لگا کہ اعجاز کو کون سے طریقے سے اقبال جرم کے لیے تیار کیا جاسکتا ہے۔ نصف گھنٹہ گزر گیا ہوگا جب اس کی گاڑی برآمدے کے سامنے آکر رکی میں اس کے استقبال کے لیے اٹھا۔ وہ گاڑی سے نکلا تو مجھے دیکھ کر جھونچکا سا رہ گیا۔ فوراً ہی ہنس پڑا اور میری طرف ہاتھ لمبا کر کے بولا۔ ”معلوم ہوتا ہے میرا سسر آپ کو شک میں ڈال آیا ہے۔“ اس نے ہاتھ ملایا اور مجھے اندر لے گیا۔ میں نے ڈرائنگ روم میں بیٹھ کر اسے کہا کہ اس کے سسر کو میں نے جلدی اٹھا دیا تھا اور اس کی میں نے کوئی بات نہیں سنی تھی۔ میں نے لڑکی کی تصویر اس کے ہاتھ

”آپ...“ وہ سخت گھبرا گیا تین بار اس نے کہا۔ ”آپ... آپ...“

”آپ اتنا زیادہ نہ گھبرائیں۔“ میں نے اسے کہا۔ ”آپ میرے ساتھ تعاون کریں اور مجھ سے تعاون کی توقع رکھیں۔ ورنہ آپ کو بہت ہی زیادہ نقصان اٹھانا پڑے گا جس میں آپ کی جان کا نقصان بھی شامل ہے۔ میں اگر آپ سے کچھ بھی نہ پوچھوں اور آپ کو گرفتار کر کے لے جاؤں تو بھی میں آپ کے خلاف بیوی کے قتل کا جرم ثابت کر سکتا ہوں۔ آپ باعزت خاندان کے فرد ہیں۔ میں آپ کی تحفظ سہمی مدد کر سکتا ہوں۔ آپ کچھ میری مدد کریں۔“

اس نے اپنے بیگ سے چیک بک نکالی اور چیک کھنکھ کر میرے آگے کر دیا۔ اس پر پانچ ہزار روپے کی رقم لکھی ہوئی تھی میں نے چیک صحت دیکھا، ہاتھ میں نہیں لیا۔ میں نے اس کی غلط دیکھا تو اس نے کہا۔

”اگر آپ کو یہ منظور نہیں تو میں رقم زیادہ کر دوں گا۔ آپ یہ کم کریں کہ کیس گولی کر دیں۔ لاش کو لاوارث قرار دے دیں۔ اس کا باب مان گیا ہے کہ یہ لاش کلنزوم کی نہیں ہے۔“

”میرے لیے یہ مصیبت پیدا ہو گئی ہے کہ مجھے معلوم ہو گیا ہے کہ یہ لاش کلنزوم کی ہے۔“ میں نے کہا۔ ”آپ کے یہ پانچ ہزار یا اس پندرہ ہزار میں کب تک کھاؤں گا۔ آپ چیک اپنے پاس رکھیں اور میرے کچھ سوالوں کا جواب دے دیں۔ پھر میں آپ کو کوئی راستہ بتا دوں گا۔“

”پوچھئے۔“

میں نے کہا۔ ”گھسا بھی اتنا ہے کہ رپڑ کئی جگہوں سے اڑ گیا ہے۔ میں اس کے چہرے کو دیکھ رہا تھا جو بدنام شروع ہو گیا تھا۔ میں نے کہا۔ ”گاڑی آئی پرانی ہے کہ اس میں سے تیل گرتا رہتا ہے۔“

”آپ نے میری گاڑی ابھی دیکھی ہے۔“ اس نے پھینکی سی ہنسی ہنس کر کہا۔ ”پولیس کی آنکھیں بہت تیز ہوتی ہیں۔“

”نہیں اعجاز صاحب۔“ میں نے اسے کہا۔ ”آپ کی گاڑی یہاں رکی تو میرا نظر آپ پر پڑا۔ میں نے تو آپ کی گاڑی کا رنگ بھی نہیں دیکھا البتہ اس سے پہلے آپ کی گاڑی ایک ایسی جگہ کھڑی دیکھی تھی جہاں بہت کم گاڑیاں جایا کرتی ہیں۔“

”کہاں؟“

”جہاں آپ نے اپنی بیوی کی لاش پھینکی تھی۔“

وہ پیشہ ور قاتل نہیں تھا۔ اس کی یہ حالت ہو گئی کہ آنکھوں کے ڈھیلے باہر نکل آئے اور منہ کھل گیا۔ میں نے اسے سنبھلنے نہ دیا۔ میں نے کہا۔ ”اگر اسے قتل ہی کرانا تھا تو کسی پیشہ ور کو پیسے دے کر کر دیتے۔ قتل کر دینا کوئی مشکل نہیں لیکن آپ کو یہ علم نہیں تھا کہ جہاں قتل کیا جانا ہے، وہاں کی بے زبان چیزیں دھار کی زمین اور لاش بھی گواہی دے دیا کرتی ہے۔ میں آپ کے پاس کسی شک کی بنا پر نہیں آیا اور آپ کے سسر کی باتیں بھی مجھے متاثر نہیں کر سکی تھیں۔ مجھے آپ کا بیوی کی لاش یہاں تک لے آئی ہے اور میں آپ کی اس گاڑی پر یہاں آیا ہوں جس کا ایک ٹائر گھسا ہوا ہے اور جہاں رکھی ہے وہاں تیل کے چند ایک قطرے گراتے ہیں۔ میں مکمل شہادت اور ثبوت لے کر آیا ہوں۔“

انہاں چلی گئی۔ دو تین روز بعد اعجاز کو سسر کا خط ملا کہ وہ فوراً انہاں پہنچے۔ اعجاز چلا گیا۔ اسے توقع تھی کہ صلح صفائی کی کوئی بات ہوگی۔ مگر پتا چلا کہ سسر نے اپنے دو مزارعوں کو بلا کر اسے ان سے پٹوایا اور کہا کہ واپس چلے جاؤ۔ اعجاز واپس آ گیا۔ وہ ذرا کمزور خاندان کا آدمی تھا۔ اس نے فیصلہ کر لیا کہ بیوی کو طلاق دے دے گا۔ اسے توقع تھی کہ جھگڑا مار کٹائی تک پہنچ گیا ہے۔ اس لیے اب کلثوم کو ماں باپ اس کے پاس نہیں بھیجیں گے یہ ایک وکیل سے مشورہ کر رہا تھا۔

اس کے سامنے سب سے بڑی دشواری یہ تھی کہ حق مہر کی رقم بہت زیادہ تھی۔ طلاق دی جاسکتی تھی۔ مگر حق مہر دینا اس کے بس کی بات نہیں تھی۔ اگلے روز کلثوم آگئی۔ اب وہ شہزادی بن کے آئی تھی جیسے اعجاز اس کا غلام ہو گیا ہو۔ اس نے آتے ہی اعجاز کو دو تین حکم سنا ڈالے۔ اس رویے سے اعجاز کا دل غم چھ گیا۔ وہ اتنا غلام نہیں بننا چاہتا تھا۔ اس کی نظر میں یہ بے غیرتی تھی۔ اس سے وہ اس قدر مشتعل ہوا کہ اس نے قتل کا فیصلہ کر لیا۔ دو دن سوچتا رہا کہ قتل کس طریقے سے کرے تاکہ پکڑا نہ جائے۔ اس دوران وہ کلثوم کا غلام بنا رہا۔

ایک شام کھانے کے کچھ دیر بعد اعجاز نے اسے کہا۔ ”ایک روز میری بھی ذرا سی بات مان لو۔ آؤ سیر کو چلیں۔ دیکھو کتنی اچھی چاندنی ہے۔“ وہ فوراً تیار ہو گئی۔ وہ اسے پہلے تو ادھر ادھر گھماتا پھرتا رہا۔ پھر اسے اس دیرانے میں لے گیا۔ کلثوم نے اسے تین چار بار کہا کہ وہ اس جنگل اور جابڑ میں نہیں جائے گی مگر اعجاز نے گاڑی نہ روکی۔ وہ اسے بہت دور لے جا کر قتل کرنا چاہتا تھا لیکن ایک جگہ کلثوم بُری طرح بگڑ بیٹھی۔ اعجاز

”بدکار آپ ننھے یا آپ کی بیوی؟“

”میری بیوی“

”آپ پوری بات سنا دیں“ میں نے کہا۔ ”پھر میں آپ سے بات کروں گا۔“

دو بدکار بیویاں

اس نے وہی کہانی سنائی جو آپ ہزار مرتبہ سن چکے ہوں گے۔ میری اس گفتیش میں بھی آپ ایسی ایک کہانی پڑھ چکے ہیں۔ یہ بیکو اور اس کی بدکار بیوی کی کہانی ہے۔ اس میں دیہات کی ایک گنوار لڑکی بدکار تھی، یہاں ایک اونچے اور امیر خاندان کی تعلیم یافتہ لڑکی بدکار تھی۔ اعجاز نے اسے بالکل بکو کی طرح اپنی عادتیں بدلنے کے لیے کہا تھا مگر کلثوم ایک جاگیردار کی بیٹی تھی۔ جس نے گھر میں مزارعوں اور نوکروں چاکروں پر حکومت کی تھی۔ وہ اپنے خاوند کو بھی اپنا نوکر سمجھتی تھی۔ اعجاز نے اپنے سسر سے ایک بار شکایت کی تو سسر نے اعجاز کو ہی گالیاں دیں۔

اس کے بعد لڑکی کئی بار اعجاز سے لڑ جھگڑ کر میکے چلی گئی۔ اعجاز نے مجھے بتایا کہ کلثوم کو اپنے ماں باپ نے دولت اور جاگیر داری کے نشے میں کھلی آزدی دے کر آوارہ کر دیا تھا۔ اعجاز کو اس لڑکی سے محبت تھی اور اس کے ساتھ یہ دل چسپی بھی کہ ماں باپ کی گمراہ کی سہیلی لڑکی کو وہ راہ راست پر لے آئے۔ اعجاز کے بیان کے مطابق، کلثوم کو درد ستیاں کرنے کا بہت شوق تھا۔ اس نے اعجاز کے دو عزیز دوستوں سے بھی تعلقات قائم کر لیے تھے۔ اعجاز اب ہر جگہ رسوا ہونے لگا تھا۔ ایک رات کلثوم گھر پر سے آئی۔ اعجاز نے اسے مار پٹیا۔ دوسرے دن کلثوم

نہراہہ مکرحوالات میں دونوں فریق پر سیٹھ ایک ہی انداز میں اپنے مستقبل کے تعلق سوچ رہے تھے۔ دونوں کے جذبات اور احساسات ایک جیسے تھے اور میں سوچ رہا تھا کہ انسان گنوار سہ یا اگر سچوٹ اس کی بنیادی فطرت تبدیل نہیں ہوتی۔ دونوں مقدمے اکٹھے چلے۔ جگہ نے جرم سے انکار نہیں کیا۔ اس کے کاؤں کے دس آدمی اور اس کی بیوی کا پہلا خاوند بمع تین آدمی اس کی صفائی کے لیے عدالت میں آئے اور شہادت دی کہ اس کی بیوی بدچلن تھی۔ سیشن کورٹ نے اسے سات سال سزائے قید دی جو اپیل میں ہائی کورٹ سے پانچ سال ہو گئی۔ میں نے اس پر یہ کرم کیا کہ لاش ردپوش کرنے اور لاش کی چیزیں چوری کرنے کے جرم میں اس کے خلاف کوئی مقدمہ قائم نہیں کیا۔ اس کا فائدہ اعجاز حسین کو بھی مل گیا جو دراصل میری غلطی تھی۔ استغاثہ میں تھا کہ لاش گڑھے میں دفن شدہ برآمد ہوئی مگر اتنا ہی جرم میں تھا کہ لاش کار سے نکال کر چھینک دی تھی۔ سیشن کورٹ نے اعجاز کو عمر قید کی سزا دی تھی۔ ہائی کورٹ نے اپیل میں شک کا فائدہ دے کر بری کر دیا۔

نے گاڑی روک دی اور کلنٹوم سے کہا۔ ”اچھا واپس چلتے ہیں۔“ اس نے جیب سے رومال نکالا اور کلنٹوم جو اس کے ساتھ اگلی سیٹ پر بیٹھی تھی، کی ناک اور منہ پر رکھ دیا۔ اس قدر دباؤ ڈالا کہ کلنٹوم کا سر نیچے سیٹ کے ساتھ لگ گیا۔ اعجاز نے تہہ کیا ہوا رومال اس کی ناک اور منہ پر رکھے ہوئے اوپر سے مہنسی کا دباؤ ڈالے رکھا۔ وہ تڑپتی رہی اور ڈرا سی دیر میں وہ مر گئی۔ اس نے لاش باہر نکالی اور اٹھا کر فٹوڑی دور چھینک دی۔ اس دیرانے میں قتل کر کے پھینکنے سے اس کا مقصد یہ تھا کہ یہاں رات کے وقت گیڈر وغیرہ اسے کھا کر علیہ بگاڑ دیں گے اور جو کچھ بچ جائے گا، وہ دن کے وقت لگدھ کھالیں گے۔

اعجاز نے جب اخبار میں کلنٹوم کی تصویر دیکھی تو اس نے فوراً پہچان لی۔ وہ بہت پریشانی ہوا۔ اس نے اسی روز اس کے باپ کو خط لکھا جس میں پوچھا کہ آج چونٹھا روز ہے۔ کلنٹوم انبار گئی تھی۔ وہ خود آجائے گی یا میں آؤں۔ یہ خط ملنے ہی اس کا سسر بھاگا آیا اور بتایا کہ کلنٹوم انبار نہیں گئی۔ اعجاز نے اسے اخبار میں تصویر دکھائی جسے کلنٹوم کے باپ نے پہچان لیا لیکن اعجاز نے بڑی کامیاب چالاکي سے اسے باور کرا دیا کہ یہ کوئی اور ہے۔

اس کے بعد تھانے میں میرے سامنے جو کچھ ہوا وہ آپ کو سنا چکا ہوں۔ اعجاز مجھ پرٹ کے سامنے اتنا ہی جرم کرنے کے لیے تیار ہو گیا۔

اُس رات میرے تھانے کی حوالات میں درخاوند بند تھے۔ دونوں کا کیل ایک ہی تھا۔ دونوں کی بیویاں بدچلن تھیں۔ دونوں اپنی بیویوں کے قاتل تھے۔ ایک غریب اور اجڑو بیاتی تھا اور دوسرا اگر سچوٹ اور کوٹھی میں رہنے والا شہری

پاپی کا پیار

خاندان نے اس لیے دوسری شادی کی کہ اولاد نہیں تھی دوسری بیوی نے اس لیے اسے قبول کیا کہ صاحب جائیداد تھا۔ ان کے درمیان ایک پاپی آگیا جو پیار کا پیاسا تھا

انسان کی فطرت ایک عجیب ہے۔ اگر آپ پولیس کار یا کارڈ دیکھیں تو بعض وارداتوں کو آپ ناقابل یقین تصور کریں گے اور کہیں گے کہ کوئی انسان یہ حرکت نہیں کر سکتا۔ بچے پیسے اور جائیداد کا لالچ، عورت کی محبت، حسد اور رقابت کا جذبہ بعض انسانوں پر جن کی طرح سوار ہو جاتا ہے اور ان سے ایسی حرکتیں کرا لیتا ہے جو ہوش والے انسانوں کے لیے ناقابل یقین ہوتی ہیں بلکہ ایسی حرکت کرنے والا انسان خود بھی جب پکڑا جاتا ہے تو حیران رہ جاتا ہے کہ اس نے یہ واردات کی تھی۔ پھر اسے سبکدوش کی صورت نظر نہیں آتی تو وہ اقبال جرم کر لیتا ہے۔ یہ واردات جو ہیں آپ کو سنانے لگا ہوں ایسی ہی وارداتوں میں سے ایک ہے۔

شام کے چار بجے تھے۔ عابد نام کا ایک آدمی، عمر پچیس سال سے ذرا زیادہ، تھلنے میں آیا۔ رپورٹ درج کوئی کہ اس کی بچی جس کی عمر تین مہینے ہے، کم ہو گئی ہے گمشدگی ایک بجے کے لگ بھگ ہوئی ہے۔ گھر میں بچی کی ماں تھی اور نانی۔ بچی کا باپ جو رپورٹ دینے آیا تھا بسلسلہ کاروبار گھر سے باہر تھا تین بجے اسے اطلاع پہنچی کہ بچی کو

کوئی اٹھالے گیا ہے۔ وہ کھڑا آیا اور یقین کر کے کہ بچی کو کوئی پڑوسی عورت یا کوئی بچہ پیار سے نہیں اٹھالے گیا، تھانے میں رپورٹ دینے آگیا۔

میں عابد کے ساتھ اس کے گھر گیا۔ بڑا اچھا مکان تھا جو ایک محلے میں واقع تھا۔ عابد کا کاروبار اچھا تھا۔ اس کے دو مکان کرائے پر چڑھے ہوئے تھے۔ گھر میں عابد اپنی بیوی کے ساتھ رہتا تھا۔ اس کے والدین مر چکے تھے۔ گھر میں ایک لڑکائی تھی جس کے خلاف شک کی کوئی گنجائش نہیں تھی کیوں کہ بچی کی ماں کے بیان کے مطابق وہ صبح دس بجے کے قریب کام سے فارغ ہو کر اپنے گھر چلی گئی تھی اور بچی کی گمشدگی کے نصف گھنٹہ بعد آئی تھی۔ عابد چونکہ گھر نہیں تھا اس لیے ابتدائی معلومات عابد کی بیوی سے لینی تھیں۔ میں نے عابد اور اس کی ساس کو دوسرے کمرے میں بھیج دیا۔ عابد کی بیوی جس کا نام فرزنا تھا، کو اس کمرے میں لے گیا جہاں بچی سوئی ہوئی تھی۔ اس کمرے میں قیمتی فرنیچر تھا۔ اس سے معلوم ہوتا تھا کہ عابد کا کاروبار بہت اچھا ہے۔ میں نے فرزنا میں پہلی چیز یہ نوٹ کی کہ اس کی عمر بیس سال ہے۔ عابد کی عمر پچیس سال سے کچھ زیادہ تھی۔ دوسری چیز یہ نوٹ کی کہ انہیں صاف شفاف تھیں۔ میں نے ان آنکھوں کو بہت غور سے دیکھا، ان میں آنسوؤں کا کوئی نشان نہ تھا۔ شرمسہ موجود تھا۔ چہرہ جوانی کے جوش سے دمک رہا تھا۔ اس پر مجھے افسوس اور غم کا کوئی کھڑکھوج نہ ملا۔ اس نے گہرا دیکھ کر کہا تھا جس کی اسے ضرورت نہیں تھی کیونکہ خدا نے اسے گوارا رکھ دیا تھا۔ ان دنوں ماہوں کا فیش کچھ اور تھا۔ فرزنا نے اس سیشن میں یہ اتفاق کیا ہوا تھا کہ گاؤں کے قریب سے بال کاٹ کر بی تھیں بنائی ہوئی تھیں۔ لباس شوخ رنگ کا تھا۔ میں نے جب اسے کہا تھا کہ آپ میرے ساتھ اس کمرے میں چلیں جہاں سے بچی کم ہوئی

بے تودہ میں سال کی پردہ نشین دیکھیں کی طرح شرمائی یا جھینپی نہیں بلکہ فوجیوں کی طرح چٹان چٹان چلتی میرے آگے آگے کمرے میں چلی گئی اور بولی۔ ”آئیے۔“

ایک تو کوٹھیوں میں رہنے والے لوگ ہوتے ہیں جن میں عجیب طرح کی شوبازی ہوتی ہے اور ایک گنجان اور پرانے فحلوں میں رہنے والی ایک خاص کلاس ہوتی ہے جس کی تعلیم کم ہوساتھی ان پڑھ اور ناروا بارے آمدنی بہت ہی زیادہ ہوتی ہے۔ ان میں مضحکہ خیز قسم کی شوبازی ہوتی ہے۔ اس کلاس کی لڑکیاں بھانڈوں کی سی حرکتیں کرتی ہیں یہی حال اس لڑکی کا تھا۔ وہ مجھ پر عجب گانٹھ لڑی تھی کہ سم پیسے ملے ہیں اور میں اب ڈانس لڑکی ہوں۔ پھر بھی میں نے اس کے متعلق کوئی بُری رائے قائم نہ کی۔ میں نے سوچا کہ بیس سال عمر ہی کیا ہوتی ہے۔ ابھی اس کا ذہن کچا ہے۔ مجھے یہ جتنا چاہتی ہے کہ تم تختانیدار ہو تو کیا تھا۔ میں بڑے امیر آدمی کی بیوی ہوں۔ میں نے کمرے میں جا کر پوچھا کہ کچھ کہاں تھی؟ اس نے دیوان پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ ”سو گئی تھی۔ میں اسے یہاں ڈال گئی تھی۔ میں نے دیوان کو بڑی غور سے دیکھا۔ کمرے کے دروازوں کا جائزہ لیا۔ ایک اندر کھلتا تھا۔ ایک دوسرے کمرے میں اور اس کے بالمتقابل ایک اور دروازہ تھا جو ڈیڑھ میں کھلتا تھا اور ڈیڑھ کا دروازہ لگی میں کھلتا تھا جو فرزانہ کے بیان کے مطابق دن کے وقت کھلا رہتا اور رات کو بند ہوتا تھا۔

بیویاں دو تھیں

فرزانہ نے بیان دیا کہ صبح سے اس کی ماں آئی ہوئی تھی۔ فرزانہ کے ماں باپ اس شہر کے دور دراز محلے میں رہتے تھے۔ گیارہ بجے صبح فرزانہ نے بچہ کو دودھ پلا

اور وہ سو گئی۔ اس نے بچہ کو دیوان پر ڈال دیا اور ماں کے ساتھ دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ ایک بجے کے بعد بچہ کا خیال آیا کہ جاگ اٹھی ہوگی۔ جلکے دیکھا۔ بچی غائب تھی۔ ڈیڑھ کی طرف کھلنے والا دروازہ کھلا تھا۔ نوکرانی گیارہ بجے سے پہلے گھر چلی گئی تھی۔ فرزانہ ماں کو بتائے بغیر پڑوس کے تین گھروں میں گئی۔ وہاں کی عورتیں اور ایک گھر کی ایک لڑکی بچی سے بہت پیار کرتی تھیں۔ فرزانہ اس خیال سے وہاں گئی کہ شاید مذاق سے کوئی بچی کو اٹھائے گئی ہو۔ ان میں سے کسی نے ایسی حرکت نہیں کی تھی۔ ایک گھر سے اسے پتہ چلا کہ فرزانہ کے خاوند کی پہلی بیوی اس کے ماں آئی تھی اور کچھ دیر بیٹھ کر چلی گئی تھی۔ فرزانہ نے کہا۔ ”مجھے اس پر شک ہے۔“ یہ میرے لیے نیا انکشاف تھا کہ عابد کی ایک اور بیوی بھی ہے۔ میں نے فرزانہ سے پوچھا کہ اسے اس بیوی پر جس کا نام جمیلہ تھا، کیوں شک ہے؟

اس کے بیان سے معلوم ہوا کہ بارہ سال ہوئے عابد نے جمیلہ کے ساتھ شادی کی تھی لیکن کوئی اولاد نہ ہوئی۔ دس سال گزر گئے تو اولاد کی کوئی امید ہی نہ رہی۔ عابد بیوی کا علاج کراتے کراتے یالوس ہو گیا تو اس نے دوسری شادی کا فیصلہ کیا۔ جائیداد خاصی تھی۔ اس کا کوئی وارث تو نہ ہونا چاہیے تھا۔ جمیلہ کے لیے یہ بہت بڑا صدمہ تھا۔ اس نے عابد کی منت سماجت کی کہ دوسری شادی نہ کرے۔ عابد نہ مانا اور اس نے فرزانہ کے ماں باپ رشتہ نگار رشتہ مل گیا اور شادی ہو گئی۔ اب عابد اور فرزانہ کی شادی کو دو سال ہو گئے تھے۔ دوسرے سال کے آخر میں یہ بچی پیدا ہوئی جو کم ہو گئی۔

فرزانہ نے بتایا کہ جب وہ اس گھر میں آئی تو جمیلہ نے اسے کہا تھا کہ اس گھر میں کبھی بچہ پیدا نہیں ہوگا اور اگر تم نے بچے کو جنم دیا تو وہ اس گھر میں نہیں رہے گا۔ خاوند

جبیلہ کو اپنے گھر رکھنا چاہتا تھا لیکن وہ یکے چلی جاتی تھی اور یہاں بھتے میں ایک دو دن ہی رہتی تھی۔ اس دو سال کے عرصے میں جبیلہ نے فرزانہ کے کہنے کے مطابق اسے کئی بار دھکی دی کہ اگر تم نے بچے کو جنم دینا ہے تو اسے اپنے یکے میں رکھنا۔ وہ یہاں نہیں رہ سکے گا۔ اب بچی لاہور ہو گئی اور فرزانہ پڑوس کے تین گھروں میں گئی تو ایک گھر سے اسے پتہ چلا کہ جبیلہ آئی تھی اور کچھ دیر بیٹھ کر چلی گئی تھی۔ میرے پوچھنے پر فرزانہ نے بتایا کہ جب سے بچی پیدا ہوئی ہے جبیلہ یہاں دو بلا آئی ہے۔ دونوں بلا ایک ایک رات یہاں رہ کر چلی گئی تھی۔ خاوند کے ساتھ کبھی کبھی رہتی تھی۔ خاوند اس کا بہت خیال رکھتا تھا۔ اسے خوش رکھنے کی کوشش کرتا تھا۔

میں نے بہت سے سوال اپنے ذہن میں محفوظ رکھ لیے اور اس کمرے سے نکل کر دوسرے کمرے میں چلا گیا۔ وہاں سے نکلتے تو تیسرے کمرے میں چلا گیا۔ یہ سونے کا کمرہ تھا میں نے اسے غور سے دیکھا۔ دونوں پٹنگوں کو دیکھا میں جس چیز کی تلاش میں تھا وہ مجھے نظر نہ آ رہی تھی۔ میں نے یہ چیزیں بھی اپنے ذہن میں محفوظ کر لیں۔ میں نے فرزانہ سے کہا کہ وہ اس عورت کو بلا لائے جس کے پاس جبیلہ آئی تھی۔ میں نے انہی دیر کے لیے عاید کو الگ کمرے میں بٹھالیا۔ میں نے پہلا سوال یہ پوچھا۔ ”کیا آپ کو اپنی پہلی بیوی پر شک ہے کہ وہ بچی کو اٹھا کر لے گئی ہوگی؟“ عاید نے سر جھکایا اور خامی دیر کچھ سوچتا رہا۔ جب اس نے سر اٹھا کر مجھے دیکھا تو میں نے کہا۔ ”آپ اور زیادہ وقت صرف کریں لیکن جواب سوچ کر دیں۔ بہت بڑا جرم ہوا ہے۔ آپ کے منہ سے نکلے ہوئے الفاظ آپ کے خلاف بھی استعمال ہو سکتے ہیں اور یہ بھی ممکن کہ آپ کے الفاظ مجھے گمراہ کر دیں اور آپ کو اپنی سچی کہی نہ لے۔ کہیں آپ کو اپنی پہلی بیوی پر شک ہے؟“

”فرزانہ نے اس پر شک کیا ہے؟“ اس نے پوچھا۔

”یہ آپ فرزانہ سے پوچھیں۔“ میں نے کہا۔ ”مجھے میرے سوال کا جواب دیں۔“

”مہر سکتا ہے اس نے انتقام کے طور پر بچی کو غائب کیا ہو۔“ اس نے کہا۔ ”لیکن میں نہیں کہہ سکتا کہ مجھے اس پر شک ہے۔“

”آپ نے جبیلہ کے ساتھ دس سال گزارے ہیں۔“ میں نے پوچھا۔ ”کیا آپ نے کبھی محسوس کیا کہ اس میں انسا بڑا جرم کرنے کی ہمت ہے؟“

”نہیں۔“ اس نے جواب دیا۔ ”وہ شریف گھرانے کی عورت ہے۔“

”اولاد نہ ہونے کی وجہ کیا تھی؟“

”جبیلہ میں نقص تھا۔“ عاید نے جواب دیا۔ ”میں نے مجبور ہو کر یہ دوسری شادی کی تھی۔“

”آپ نے جبیلہ کا علاج کرایا تھا؟“ میں نے پوچھا۔ ”اگر کرایا ہے تو ڈاکٹر کون سا تھا؟“

”کوئی ایک ہو تو بتاؤں۔“ اس نے جواب دیا۔ ”دس برسوں میں کوئی ڈاکٹر، حکیم

ویدنسیاسی اور سیانا نہیں چھوڑا۔“

”دوسری شادی کے بعد جبیلہ کا رویہ کیا تھا؟“

”آپ سمجھ سکتے ہیں کہ اسے بہت صدمہ ہوا تھا۔“ عاید نے جواب دیا۔ ”وہ زیادہ دن

اپنے ماں باپ کے گھر رہتی ہے۔ میں اسے اپنے ساتھ رکھنا چاہتا تھا لیکن وہ بالکل ہی خاموش رہنے لگی تھی۔“

”جبیلہ اور فرزانہ کا کبھی لڑائی جھگڑا بھی ہوا ہے؟“ میں نے پوچھا۔ ”اور فرزانہ نے

کبھی آپ کو یہ کہا ہے کہ جبیلہ کو طلاق دے دیں یا اس نے کبھی اس کے خلاف کوئی شکایت

کی ہے؟“

چلا کہ جمیلہ اس کے گھر آئی تھی۔ عورتوں نے کیٹی ڈالی تھی۔ وہ اسی سلسلے میں آئی تھی۔ فرزانہ کے متعلق بھی باتیں ہوئی تھیں۔ میں نے بہت کرا لیا لیکن کوئی کام کی بات معلوم نہ ہوئی۔ یہ پتہ چلا کہ اس نے فرزانہ کے خلاف شدید غصے کی کوئی بات نہیں کی تھی۔ ردی منور تھی اور اس نے یہ بھی کہا تھا کہ وہ عابدہ سے طلاق لینا چاہتی ہے لیکن عابدہ نہیں مانتا۔ اس نے ہتھکڑیاں بھی کیا تھا کہ عابدہ کے دل میں اس کی محبت ہے۔ میں نے اس عورت سے پوچھا "تمہارے گھر سے اٹھ کر جمیلہ کہاں گئی تھی؟" اسے کچھ پتہ نہیں تھا۔ وہ اندر بیٹھی رہی تھی اور جمیلہ نکل گئی تھی۔

پولیس میں تفتیش اور سرانجام رسانی کی ٹریننگ اسی طرح دی جاتی ہے جس طرح فوج میں فوجی ٹریننگ لیکن جنگ میں بعض اوقات اس ٹریننگ کو نظر انداز کر کے ایسے طریقے اختیار کیے جاتے ہیں جن کا ذکر کسی سرکاری کتاب میں نہیں آتا۔ اسی طرح تفتیش کے دوران بھی ایسے ایسے مرتبے اُجارتے ہیں کہ اپنی عقل سے کام لینا پڑتا ہے۔ تفتیش میں بعض باتوں میں ہم بولنے والے کی باتوں کی طرف انصاف دیکھنا نہیں دیتے جتنا اس کے چہرے کو دیکھتے ہیں کہ اس پر کیسے کیسے رنگ آتے ہیں اور اس کی آنکھوں کی پتکیاں کس طرح پھرتی ہیں۔ یہ فہم و فراست اور انسان شناسی کا کھیل ہوتا ہے۔ اگر آپ میں عقل ہے تو آپ حیرت گئے درنہ لازم حیرت گیا۔ اس سچی کی گمشدگی کی تفتیش میں مجھے اپنی عقل سے زیادہ کام لینے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ میں نے پہلا کام یہ کیا کہ ان تمام افراد پر جن کا اوپر ذکر کر چکا ہوں کوئی جرح نہ کی اور نہ ہی انہیں یہ تاثر دیا کہ میں اس کے بعد بھی ان کے بیانوں کو لگاؤں گا۔ انہیں بالکل شک نہیں ہوا کہ یہ تو ابتدائی کارروائی ہے اور یہ محض ایک تعارفی رسم ہے۔

"یہ تو روز ہی ہوتا ہے کہ فرزانہ جمیلہ کے خلاف کوئی نہ کوئی شکایت میرے آگے رکھ دیتی ہے۔" عابدہ نے جواب دیا۔ اور جب فرزانہ کی ماں یہاں آتی ہے تو جمیلہ کے خلاف باتوں کے سوا اور کوئی بات ہی نہیں کرتی۔ ایک بل اس نے یہاں تک کہ دیا تھا کہ میں جمیلہ کے ہاتھ کا پانی بھی نہ پیا کروں۔ وہ بہت خطرناک عورت ہے۔ سچی کی گمشدگی کچھ روز پہلے فرزانہ کی ماں میرے ہاں ہر روز آجاتی تھی اور مجھے جمیلہ کے متعلق پہلے زیادہ بھر جانے لگی تھی۔ کتنی سچی کہ جمیلہ انہیں دھکیلاں دیتی ہے اور اس کے روتے پتہ چلتا ہے کہ ضرور کوئی وار کرے گی۔ پھر سچی غائب ہو گئی۔"

فرزانہ کی ماں بھی وہیں تھی۔ اسے میں نے اپنے پاس بٹھایا تو اس نے مجھے کوئی ہر کرنے کی مہلت ہی نہ دی۔ جمیلہ کو مڑا بھلا کہنا شروع کر دیا اور یہ بھی کہا۔ "عابدہ کو سولہ گز ہوں کہ اس کو اس طرح کو طلاق دے دے۔ کہیں ایسا نہ کہ تجھے یا میری بیٹی کو لے بیٹھے۔ یہ لڑکا مانا اور آج قہقہہ دیکھ لو مجھے سولہ آنے یقین ہے کہ سچی کو وہی اٹھا کے لے گئی ہے محلے میں آئی تھی۔ کیا لینے آئی تھی؟"

"آپ تجربہ کار عورت ہیں۔" میں نے اسے کہا۔ "وہ سچی کو لے جا کر کسے کی کیا؟" کا داغ کیا کہتا ہے؟

"وہ بڑی چالاک عورت ہے۔" اس نے جواب دیا۔ "اللہ جانے کیا کرے گی۔ انہں کو کہیں ربا دے گی۔ حسد ہے نا۔ وہ اتنی جل گئی ہے کہ سچی کو ہی غائب کر دیا ہے۔ وہ عورت میرے انتظار میں بیٹھی تھی جس کے ہاں جمیلہ آئی تھی۔ میں نے اپنے پاس بلایا۔ سیدھی ساوی شریف ہی عورت تھی۔ اس کے منہ سے بات بھی نہ نکلی رہی تھی۔ میں نے تسلی دی۔ تو صلہ بڑھایا تو اس نے کچھ باتیں کیں۔ اس سے:

غائب کی ہے جو صدا اور رقابت کی انتہا ہے۔ میں نے ایسی داریاں بھی دیکھی تھیں کہ بے اولاد عورتوں نے دوسری عورتوں کے دودھ پیتے بچوں کو جان سے مار دیا۔ یہ ملتا کے جذبے کی پامیں کا بڑا ہی خطرناک سرخ ہوتا ہے۔ لیکن اس سوال نے مجھے پریشان کر دیا کہ بچی کو فرزانہ نہ خود غائب کیا یا جمیلہ نے، تو مفید حاصل کر کے کیا بچی بخدی دالیں آجائے گی یا قتل ہو چکی ہوگی؟ کیا ان دونوں میں سے جس نے بھی یہ جرم کیا ہے وہ اس قدر بچہ کا جرم ہے کہ جرم کی آخری کڑی تک سکیم بنائی ہے؟ اگر ایسا ہے تو ملزم کو کسی بچہ کا مرد یا مردوں کا تعاون حاصل ہے۔ اب جمیلہ کو دیکھ کر مجھے یہ رائے قائم کرنی تھی کہ آیا اس میں جرم کی صلاحیت ہے یا نہیں۔ میں نے عابد سے جمیلہ کے گھر کا اتنا پتلا لیا تھا۔

جمیلہ کے گھر گیا تو اس کا باپ ملا۔ مجھے دیکھتے ہی اس کے آنسو نکل آئے کہنے لگا۔ ”یہ وقت بھی مجھے دیکھنا تھا کہ میرے دروازے پر پولیس کھڑی ہوگی۔“ وہ مجھے اندر لے گیا اور میری مٹھوڑی چھو کر کچھ بات تھ باندھ کر انتہائی ”مجھ پر ایک کرم کریں کہ میری بیٹی کو تھانے نہ ملائیں۔ میری ساری عمر کی کمائی صرف عزت ہے۔ ان بد معاش عورتوں نے میری بیٹی پر الزام عاید کیا ہے کہ وہ بچی کو اغوا لاتی ہے۔“

”آپ کو کیسے پتہ چلا؟“ میں نے پوچھا۔

”عابد بنا گیا ہے۔“ اس نے جواب دیا۔ ”دو گھنٹے ہوئے یہاں آیا تھا۔ اس نے میرے سامنے جمیلہ کو کہا تھا کہ بچی کو بگوتی ہے اور فرزانہ اور اس کی ماں جمیلہ پر رشک کر رہی ہیں۔“

”کیا عابد کو بھی رشک تھا؟“ میں نے پوچھا۔ ”اس نے آپ سے یا جمیلہ سے اس

میں عورتوں سے الگ عابد کے ساتھ بیٹھ گیا۔ نوکرانی چائے لے آئی۔ وہ ٹرے میں سے پیالیاں اٹھا کر تپائی پر رکھ رہی تھی تو اچانک میرے دماغ میں ایک سوال آیا جو میں نے نوکرانی کی موجودگی میں عابد سے پوچھا۔ ”کھانا کون پکاتا ہے“ نوکرانی نے جواب دیا۔ ”میں پکاتی ہوں۔“ میں نے پوچھا۔ ”آج کس نے پکایا تھا؟“ عابد نے کہا۔ ”میں تو صبح ہی نکل گیا تھا۔ اسی نے پکایا ہوگا۔“ نوکرانی نے کہا۔ ”میں خود پکا کر گئی تھی۔“ میں نے پوچھا۔ ”کتنے بجے؟“ اس نے کہا۔ ”بہا بج گئے تھے جب میں گھر سے نکلی تھی۔“

چائے کے دوران عابد کے ساتھ باتیں ہوتی رہیں جنہیں میں نے گپ شپ کا رنگ دینے رکھا مگر عابد کا ہر لفظ ذہن میں محفوظ کرتا گیا۔ اس پر خاص قسم کی گھبراہٹ طاری تھی بلکہ بعض اوقات تروہ چکرایا مبرا معلوم ہوتا تھا۔ جمیلہ کو وہ طلاق دینے پر آمکاہ نہیں تھا۔ فرزانہ کو وہ پسند کرتا تھا۔ وہ آخر خوبصورت اور جوان لڑکی تھی لیکن عابد کی باتوں سے معلوم ہوتا تھا کہ اس نے اولاد کی خاطر یہ تجربہ کیا ہے اور اب اس تجربے سے پریشان ہے۔ بعض باتیں تو بالکل ہی اکھڑی اکھڑی کرتا تھا۔ فرزانہ کی ماں کے متعلق اس کی رائے اچھی نہیں تھی۔ اس نے کھل کر کوئی الزام نہیں لگایا لیکن صاف پتہ چلتا تھا کہ اس عورت کو وہ اپنے گھر میں پسند نہیں کرتا۔ میں نے دانستہ کوئی سوال نہ کیا۔ میں ابھی بنیاد بنا رہا تھا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ کسی کو پتہ چلے دوں کہ میری بنیاد کیا ہے۔

میں جب وہاں سے اٹھا اور تھانے کی طرف چلا تو میرے سامنے دو راستے آئے۔ ایک یہ کہ فرزانہ نے بچی کو خود غائب کیا ہے جس کے پیچھے مقصد یہ ہے کہ جمیلہ پر الزام عائد کر کے عابد کو اکسایا جائے کہ وہ جمیلہ کو طلاق دے دے۔ دوسرا یہ کہ جمیلہ نے بچی

کہا جمیلہ کو میرے پاس بھیج دے اور کوئی فکر نہ کرے۔ جمیلہ آئی تو باپ بھی ساتھ آگیا۔
میں نے اسے کہا کہ وہ ذرا باہر چلا جائے کیوں کہ مجھے کچھ ایسی باتیں بھی پوچھنی ہیں جو جمیلہ
نہایت اس کے سامنے نہ بتائے۔ باپ باہر نکلا تو جمیلہ گھر آگئی۔ وہ فرزانہ سے بالکل الٹ
تھی۔ اس میں ساگر کی اور سیاہی تھی۔ فرزانہ بھی خوبصورت تھی لیکن میری رائے میں جمیلہ
زیادہ خوبصورت تھی اور میں یہ کہتے ہوئے نہیں جھجکوں گا کہ فرزانہ کی خوبصورتی جنسی
جذبات کو ابھارتی تھی اور جمیلہ کی خوبصورتی میں جو کشش تھی اس میں پاکیزہ تاثر تھا۔
اس کا چہرہ اداس بلکہ بچھا ہوا تھا۔ آنکھیں بتاتی تھیں کہ جمیلہ بہت دیر روتی رہی ہے۔
اس کے مقابلے میں فرزانہ کی آنکھیں شفاف تھیں۔ اگر میں ان دونوں کو اکٹھا کھڑا کر کے
کسی سے پوچھتا کہ ان دونوں میں سے کسی کی سچی گم ہوئی ہے تو وہ چہرہ اور آنکھیں دیکھ
کر جمیلہ کی طرف اشارہ کرتا۔

ادھر ادھر کی باتیں کر کے میں نے جمیلہ کے باپ کی شرافت کی تعریف کی اور اس کی
پریشانی پر اپنی پریشانی کا اظہار کیا تو جمیلہ کے اعصاب سے پولیس کا ڈراؤ تر گیا۔ میں نے اسے
بتایا کہ میں یہ یقین کر نہیں آیا کہ سچی آپ نے اغوا کی ہے۔ میں یہ یقین کرنے آیا ہوں کہ
آپ بے گناہ ہیں تاہم اسلحہ جرم کو کپڑوں۔ اس طرح کی یقین دہانی سے وہ اطمینان سے
بولنے پر آمادہ ہو گئی۔ میں نے اس سے پوچھا۔

”آپ نے کبھی عابد سے طلاق لینے کی سوچی ہے؟“

”میں اسے بہت دفعہ کہ چلی ہوں مگر وہ نہیں مانتا۔“ اس نے جواب دیا۔ ”اس کے
بہرہ کرنے پر کبھی کبھی اس کے گھر چلی جاتی ہوں۔ اس کی خاطرات کو بھی اسی کے پاس
رہتی ہوں۔ صبح کو فرزانہ گھر میں کوئی نہ کوئی بہانہ بنا کر طوفان کھڑا کر دیتی ہے۔ عابد اپنے

قسم کی بات کہی تھی کہ وہ سچی واپس کر دے؟“
”بالکل نہیں۔“ اس نے کہا۔ ”وہ صحت نہ بنائے آیا تھا اور بہت پریشان تھا۔ جمیلہ
اُس وقت سے رو رہی ہے اور پریشان ہے۔“
”عابد کے متعلق آپ کی رائے کیا ہے؟“
”اتنا سیدھا آدمی ہے کہ آپ اسے بھوکہ کہہ سکتے ہیں۔“ اس نے جواب دیا۔ ”اس نے
دوسری شادی جا بیداد کا وارث پیدا کرنے کے لیے کی ہے مگر غلط لوگوں کی باتوں میں آکر
پھنس گیا۔“
”جا بیداد کتنی ہے؟“

”تین مکان اور بازار میں دو دکانیں ہیں۔ بنک میں پیسہ بھی بہت ہے اور لاکھوں کا
چالو کاروبار ہے۔“

طلاق کیوں نہ دی؟

یہ اکثر ہوتا ہے کہ تفتیش میں کسی کو شامل کریں تو وہ رو پڑتا ہے لیکن اس سے یہ
رائے قائم کرنا کہ اس کا اس جرم کے ساتھ کوئی تعلق نہیں غلط ہوتا ہے۔ رونے رونے
میں فرق ہوتا ہے اور اس فرق کو کوئی پولیس والا ہی سمجھ سکتا ہے۔ جمیلہ کے باپ کے آٹھ
ایک شریف آدمی کے آنسو تھے۔ میں نے اسے یقین دلایا کہ اس کی عزت کا پورا پورا
خیال رکھوں گا اور آئندہ اس کے گھر آنا پڑنا تو دردی ہیں کے نہیں آؤں گا اور راز
کو آؤں گا۔ مسلمان جرم کرنے سے نہ گھبراتے نہیں تھے، مجھ میں اتنی شرم موجود تھی کہ ان کا
عورتوں کی عزت کا میں خاص خیال رکھتا تھا۔ یہ آدمی تو رشتہ ہی بھلا مانس۔ میں نے اسے

لو بادیہ اس سے دوسرا دن اور ایک دن میرے مام رجسٹری کر دی ہے۔ میں عابد کے
لمحوہ کرنے پر ایک روز اس کے گھر چلی گئی۔ رات کو ہم ایک ہی کمرے میں سوئے اور فرزانہ
دوسرے کمرے میں اکیلی رہی۔ صبح عابد کام پر جانے لگا تو بڑا جذباتی ہو کر کہنے لگا کہ خدا کے
لیے ایک رات اور یہیں گزار جاؤ۔ وہ کام پر چلا گیا اور میں رگ گئی۔ فرزانہ مجھ پر برسے گی۔
کہنے لگی کہ عابد پر تیرا یاد دہل گیا ہے۔ تو نے آدھی سے زیادہ جا بڑا د بھی اس سے لکھوالی
ہے اور مجھے بھی گھر سے نکلنا چاہتی ہو۔۔۔۔

”میں نے اسے کہا کہ میں یہاں ایک منٹ کے لیے بھی نہیں رہنا چاہتی۔ میں تو اس سے
طلاق مانگ رہی ہوں۔ تم ہی اسے کہو کہ مجھے طلاق دے دے۔ وہ بولی کہ وہ مجھے طلاق
کیوں دے گا، وہ تو مجھے طلاق دیتا پھر رہا ہے۔ کوئی نہ کوئی بہانہ بنا کر روز رطائی جھگڑا
کھڑا کر دیتا ہے۔ اس وقت میں نے اسے وہ بات کہ دی جو میں نہیں کہنا چاہتی تھی۔
میں نے کہا کہ عابد نے تمہارے ساتھ اس لیے شادی کی تھی کہ تم اس کا سچے جنو۔ اسے
حرام کے بچے کی خواہش نہیں تھی۔ وہ تو میں بھی جن سکتی تھی، صرف شرم انارنے کی بات تھی۔
تم نے آلودی، میں نہیں آتا رکھی۔ پھر فرزانہ نے جو طوفان برپا کیا وہ میں بیان نہیں کر سکتی۔“

بچی اپنے باپ کی نہیں!

جیلہ کی بات سن کر میں چونک اٹھا اور پوچھا کہ حرام حلال کا کیا قصہ ہے؟ اس نے
ایک انگشت کر کے میرے لیے راستہ ہموار کر دیا۔ جیلہ نے کہا۔ ”یہ بچی عابد کی نہیں
ہو سکتی۔ چار سال تک ہماری کوئی اولاد نہ ہوئی تو عابد نے میرا علاج شروع کر دیا۔ ایک
سال تک ہم نے بہت سے ڈاکٹروں اور حکیموں کے علاج کرائے۔ ایک ڈاکٹر نے عابد

کام پر چلا جاتا ہے اور میں یہاں آجاتی ہوں۔“
”اس نے کبھی فرزانہ کے خلاف بات کی ہے؟“
”کبھی نہیں۔“ اس نے کہا۔ ”میں جب ماں باپ کے گھر ہوتی ہوں تو عابد شام
گھر جانے سے پہلے روزانہ یہاں آتا ہے۔ میں نے اس کے سامنے فرزانہ کا کبھی نام نہ
لیا اس لیے وہ بھی اس کے متعلق کوئی بات نہیں کرتا۔“

”آپ کو عابد اپنے گھر کہنے کے لئے بھی کہتا رہا ہے؟“
”اس کی خواہش یہی تھی لیکن فرزانہ برداشت نہیں کر سکتی کہ میں وہاں رہوں۔“
اس نے کہا۔ ”میں فرزانہ کے پیٹ میں یہ بچی تھی تو عابد کی یہ چند پہلے سے زیادہ ہو گئی
میں اس کے ساتھ رہوں۔ میرا خیال تھا کہ فرزانہ چونکہ اس حالت میں ہے۔ اس سے
وہ مجھے گھر کھنا چاہتا ہے لیکن گھر میں تو کوئی ہے اس لئے کام کاج کی کوئی تکلیف نہ
سچی بات یہ ہے کہ میں فرزانہ کی خدمت اور تیمارداری کے لیے تیار نہیں تھی۔ عابد
کو تار رہا اور میں مالتی رہی۔ ایک روز عابد نے مجھے غصے سے کہا کہ جیلہ، میرے گھر
صرف تم آباد کرو گے۔ فرزانہ میرے گھر کی مالک نہیں بن سکتی۔ میں نے اسے کہا کہ خدا
تمہاری مراد پوری کی ہے۔ تمہاری جائیداد کا وارث آ رہا ہے۔ وہ ملاض ہوا
گیا۔ تین روز بعد آیا تو اس نے مجھے دو کاغذ دیئے کہنے لگا کہ دو مکان، ایک دکان تو
نام کر دی ہے۔ یہ رجسٹری کے کاغذات ہیں۔ میں نے یہ کاغذ ہاتھ میں لئے تو میرے
ہاتھ کاچنے لگے۔ دراصل جی بات یہ ہے کہ مجھے برادری کے لوگ میری اور عابد کی محبت
مثال دیا کرتے تھے۔ یہ کہتے ہوئے جیلہ ہچکیاں لے کر رونے لگی۔
میں خاموش بیٹھا رہا وہ کچھ دیر بعد سنبھلی تو کہنے لگی۔ ”عابد نے یہ غلط کر کے“

میں نے یہ روپڑیں اپنے پاس رکھ لیں اور باقی کاغذات جپد کر دے دیئے۔ جمیل نے کہا۔
 ”عابد نے یہ امید لگائے رکھی کہ اس کی اولاد ہو سکتی ہے۔ مگر مجھے یقین تھا کہ یہ امید جھوٹی ہے۔
 وہ اولاد کی خاطر ایسا دیوانہ ہو گیا کہ اس نے دوسری شادی کر لی۔“
 ”آپ نے اسے دوسری شادی سے روکا تھا؟“

”جی۔ میں نے روکا تھا۔ میں نے اسے محبت کے واسطے دیئے تھے اور میں نے اسے
 یہ بھی کہا تھا کہ وہ باری ہوئی باری پر میری محبت کو داؤ پر لگا رہا ہے۔ مگر اس نے میری
 محبت کی کہ میں اسے نعمت آزمائے دوں۔ میں نے اسے کہی بلکہ کہا کہ عابد تمہاری اولاد
 نہیں ہوگی۔ اپنے آپ کو دھوکے نہ دو۔ آخر اس نے شادی کر لی۔ وہ چالاک آدمی
 نہیں۔ میں اسے سچہ سچہ بتا رہی ہوں اور وہ جب میرے پاس ہوتا ہے تو اپنے آپ کو بچہ بننا
 لیتا ہے۔ یہ شخص بچوں کی منہ تھی کہ اس نے شادی کر لی۔ وہ یہ منہ بھی کرتا تھا کہ میں
 اس کا ساتھ نہ چھوڑوں لیکن میں اپنے دل پر پھیر نہ رکھ سکی۔ میں نے اس کی منہ پوری
 کرنے کی کوشش کی تھی مگر فرزانہ نے اس کو بھی میرے وجود کو برداشت نہ کیا۔ میں ماں
 باپ کے گھر رہنے لگی۔ یہ تو آپ کو بتا چکی ہوں کہ عابد ہر روز میرے پاس آتا رہا اور ایک روز
 اس نے یہ خبر سنائی کہ فرزانہ کی گود مری ہوئے والی ہے۔ اس کے بعد خوش ہونے کی بجائے
 اس نے یہ منہ اور تیز کر دی کہ میں اس کے ساتھ رہوں۔ پھر اس نے مجھے بتایا کہ فرزانہ کے
 ساتھ اس کی ان بن ہو گئی ہے۔ وہ پہلے میکے جاتی تھی۔ اب نہیں جاتی بلکہ اس کی ماں آجاتی
 ہے اور کئی کئی روز وہیں رہتی ہے۔ عابد نے مجھے یہ بھی بتایا کہ فرزانہ اس کی ماں اس
 کے آگے کچھ سمجھ جاتی ہیں۔ وہ کسی بات پر ناراض ہو تو زرخیز لونڈیوں کی طرح اس کی منہ
 چا پی کرتی ہیں۔ عابد اتنا سیدھا ہے کہ اس کا غصہ ٹھنڈا ہو جاتا ہے اور وہ ان کے حال

کو اپنا معائنہ کرانے کے لیے کہا۔ معائنہ کرایا تو نقص عابد میں نکلا۔ اگلے ایک سال
 اپنا علاج کرتا رہا۔ وہ جسمانی لحاظ سے ٹھیک تھا۔ نگاہ اسے کوئی شکایت نہیں تھی
 مگر اولاد نہ ہوئی۔ ایک ڈاکٹر نے دلی کی ایک لیڈی ڈاکٹر اور دو ڈاکٹروں کے پتے دے
 کر مشورہ دیا کہ وہ سپنٹسٹ ہیں۔ ان کے سوا اور کوئی صحیح راستہ نہیں دے سکے گا۔ ہم
 دلی چلے گئے۔ لیڈی ڈاکٹر نے میرا پورا معائنہ کیا اور بتایا کہ مجھ میں کوئی نقص نہیں؟
 تین روز دلی میں رہے۔ عابد نے ایک ڈاکٹر سے معائنہ کرایا۔ اس کے خون اور دوسرے
 چیزوں کا ٹیسٹ کیا گیا۔ ڈاکٹر نے مکھ دیا کہ قدرت نے اس کے خون میں اولاد پیدا
 کرنے والے جو انیم پیدا ہی نہیں کیے۔ یہ قدرت کی نقص ہے جس کا کوئی علاج نہیں
 ہم دوسرے ڈاکٹر کے پاس گئے۔ اسے یہ نہیں بتایا کہ ہم ایک سپنٹسٹ سے معا
 کر آئے ہیں۔ اس نے بھی پہلے ڈاکٹر کی طرح لیبارٹری میں معائنہ کیا اور مکھ دیا
 کہ عابد کا خون اولاد پیدا کرنے کے قابل نہیں۔ اس نے یہ بھی کہا کہ دوائیوں کا کوئی
 اثر نہیں ہوگا کیوں کہ یہ نقص پیدائشی ہے۔ عابد اس ہو گیا۔ اس کے اسلوب بھی ٹھیک
 تھے۔ لیکن وہ پھر اپنے آپ کو دھوکے دینے لگا۔ کتنا تھا کہ ڈاکٹر کی اس کو تے ہیں۔“

”آپ مجھے ان ڈاکٹروں اور لیڈی ڈاکٹر کے پتے بتا سکتی ہیں؟“ میں نے پوچھا۔
 ”ہاں، میں پتے بھی بتا سکتی ہوں اور اتفاق سے تمام ڈاکٹروں کے نسخے اور ان دونوں
 ڈاکٹروں کی اور لیڈی ڈاکٹر کی روپڑیں میرے پاس محفوظ ہیں۔“ وہ اندر گئی اور کاغذ
 کا ایک پلندہ لے آئی جو اس نے منہ کر رکھا تھا۔ اس سے مجھے اندازہ ہوا کہ پڑھی ہو
 اور سلیقہ شعار عورت ہے۔ میں نے تمام نسخے دیکھے جو بہت سے ڈاکٹروں اور سکیمیا
 کے تھے اور اس میں دلی والی لیڈی ڈاکٹر اور دونوں ڈاکٹروں کی روپڑیں بھی تھیں۔

تھا۔ موقعہ واردات نشیہ کی طرح صاف تھا۔ اب تو مجھے بھی کے لواحقین کے دلوں میں سے بھیجے گئے تھے۔ مجھے یہ خطرہ بھی تھا کہ بھی قتل کر دی جائے گی اور یہ خیال بھی انا تھا کہ قتل کی جا چکی ہوگی۔

میں پھنس جاتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ وہ چکی میں پس رہا ہے۔ اسی لیے مجھے اپنے ساتھ رکھنا چاہتا ہے۔“

”آپ کا خیال ہے کہ یہ بھی عابد کی نہیں؟“

”اگر مجھے ہو گیا ہو تو میں کچھ نہیں کہہ سکتی۔ اگر نہیں تو یہ بھی عابد کی نہیں ہو سکتی عابد مجھے اپنے ماں رکھنے پر اس لیے زور دے رہا تھا کہ اسے فرزانہ کے چال چلن پر شبہ ہو گیا تھا۔ میں یہ نہیں بتا سکتی کہ سچی پیدا ہونے کے علاوہ اس کے پاس کوئی اور ثبوت بھی ہے یا نہیں۔ اس نے مجھے یہ کبھی نہیں کہا تھا کہ اسے فرزانہ کا چال چلن اچھا معلوم نہیں ہوتا یہ شک مجھے ہوا ہے۔“

اولاد کیوں نہ ہوئی؟

میں نے جمیلہ پر بھی کوئی جرح نہ کی۔ اس کے بیان نے مجھے تفتیش کا ایک واضح راستہ بتا دیا تھا لیکن اس کے بیان کو سچ مان لینا بھی دانشمندی نہیں تھی۔ ویسے جمیلہ نے مجھے متاثر ضرور کر دیا تھا۔ میں نے اس کے باپ کو بلایا اور اسے تسلی دی کہ گھبرانے کی کوئی بات نہیں اور میں نے اسے یہ بھی کہا کہ جمیلہ کی باتیں اگر صحیح ثابت ہوئیں تو یہ اس کے حق میں بہتر نتیجہ برآمد کریں گی اور ہو سکتا ہے کہ آپ کی ساری پریشانی ختم ہو جائے۔ میں نے وقت دیکھا۔ تمام کے آٹھ بج رہے تھے۔ دلی جانے والی گاڑی میں ایک گھنٹہ اور کچھ منٹ باقی تھے۔ میں وقت ضائع نہیں کرنا چاہتا تھا۔ سچی کی برآمدگی سب سے پہلا کام تھا۔ لیکن سب سے پہلے تو یہ معلوم کرنا تھا کہ لڑکی لے کون گیا ہے۔ اس قسم کی صورت حال میں پولیس انسپکٹر کو تیار ہونا مشناس۔ جوتشی اور نجومی بننا پڑتا ہے۔ مجرم کا کوئی سراغ نہیں

جمیلہ میں ایسے سنگین جرم کی صلاحیت نظر نہیں آتی تھی۔ میں نے تھانے میں جا کر خبروں کی فوج کو بلایا اور دلی جانے کی تیاری بھی کرنے لگا۔ روانگی سے پہلے دو آدمی آگئے۔ انہیں عابد کے گھر، فرزانہ کے ماں باپ کے گھر اور جمیلہ کے گھر کی نگراں کرنے اور منہیں گھروں کے مردوں کے متعلق رپورٹ دینے کو کہا۔ میں چونکہ دلی جا رہا تھا اس لیے اپنے اسے ایس آئی لشکر ناخدا کو بتایا کہ وہ باقی خبروں کی کیا کیا ڈیوٹی لگائے۔ میں ویسے سٹیشن چلا گیا۔ سٹیج ٹرین نے صبح پانچ بجے دلی پہنچایا۔ وہاں وقت گزارنے کے لیے پولیس ہیڈ کوارٹر چلا گیا اور ایک دوست کے کوارٹر میں جا کر سو گیا۔ دس بجے مجھے کھلی نوٹیفکیشن ہو کر اُس لیڈی ڈاکٹر کے کلینک میں پہنچا جس نے جمیلہ کا معائنہ کیا تھا۔ اسے جمیلہ کی رپورٹ دکھائی۔ اس نے پرانا ریکارڈ دیکھا اور رجسٹر سے دیکھ کر اس نے مریضوں کے کارڈ دیکھے اور جمیلہ کا کارڈ نکال لیا۔ یہ اسٹیکو انڈین لیڈی ڈاکٹر مسز فرانس تھی۔ اُس زمانے میں مریضوں کی آج والی بھر مار نہیں ہوتی تھی۔ پانچ چھ سال پرانا ریکارڈ ڈسٹنڈ تھے اسے دیر نہ لگی۔ اس نے ذہن پر زور دے کر جواب دیا۔ یہ رپورٹ میری لکھی ہوئی ہے اور یہ بالکل صحیح رپورٹ ہے۔“

پھر دونوں ڈاکٹروں کے پاس باری باری گیا۔ دونوں ہندو تھے۔ انہیں عابد کی رپورٹیں دکھائیں۔ انہوں نے کہا کہ یہ آدمی اولاد پیدا نہیں کر سکتا اور اس نفس کا کوئی علاج نہیں۔ دونوں کے پاس اپنے لیبارٹری ٹیسٹوں کی ٹائپ شدہ رپورٹوں کی کاربن کاپیاں

بھی وہیں تھی۔ عابد اپنے کام پر جا چکا تھا۔ میں نے فرزانہ اور اس کی ماں کو الگ کر کے میں بٹھایا۔ دونوں کی آنکھوں کو دیکھا۔ آنکھیں مات تھیں۔ میں نے بے تکلفی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ ”بڑی ٹھنڈ ہے۔ پہلے مجھے چائے پلائیے۔“ میں نے دوستانہ اور ہمدردانہ باتیں شروع کر دیں۔ فرزانہ نے نوکرائی کو چائے کے لیے کہہ دیا۔ میں نے کہا۔ ”میں کل جمیل کے ماں گیا تھا۔ بڑی خطرناک عورت ہے، آپ کو خدا کا شکر ادا کرنا چاہئے کہ اس نے سچی پروردگار کیا ہے۔ عابد کو یہی نہیں لے بیٹھی۔ فرزانہ اتمارے متقابلے میں جمیل نوکرائی لگتی ہے۔ عابد کہ چائے کے اسے فوراً طلاق دے دے۔“

ماں بیٹی نے اٹھنا شروع کر دیا۔ جمیل کے خلاف وہ زہر لگا کر میں بھی حیران رہ گیا۔ انہوں نے مجھ سے مشورہ لیا کہ عابد سے جمیل کو طلاق کس طرح دلائی جائے۔ وہ مجھے اپنا ہمدرد سمجھنے لگیں۔ میں شخص دوست کی طرح انہیں مشورے دیتا رہا۔ ماں نے پوچھا کہ جو جائیداد عابد جمیل کے نام کر چکا ہے، وہ کس طرح واپس ہو سکتی ہے؟ میں نے اس مسئلے کا بے معنی ساحل پیش کر دیا اور جمیل کے خلاف بھی کچھ باتیں کیں۔ چائے آئی، ہم پیٹے رہے۔ ماں معلوم نہیں کیوں (یا شاید دانستہ) باہر نکل گئی۔ فرزانہ مونس پر میرے ساتھ لگ کر بیٹھ گئی اور بڑی بے تکلفی سے ایک ہاتھ میرے ناف پر رکھ کر اور دوسرا ہاتھ میرے ہاتھ میں دے کر بولی۔ ”آپ ہماری مدد کر سکتے ہیں۔ جمیل کو طلاق دلا دیں۔“

میں نے اس کا ہاتھ دبا کر کہا۔ ”یہ آپ مجھ پر چھوڑ دیں۔“ میں اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر سکرایا۔ اس وقت اس کی مسکراہٹ کوئی اور ہی قسم کی تھی۔ کوئی مردہ مسکراہٹ لگا ل نہیں سکتا۔ اس نے میرا ہاتھ دایا اور کہا۔ ”آپ کی ہر فرمائش پوری کروں گی۔“ میرا سناٹا حل ہو گیا۔ مجرم باطل کچھ تھے اور یہ تو آپ نے بھی نوٹ کیا ہو گا کہ فرزانہ اور

موجودہ تھیں۔ میں انہیں بتا چکا تھا کہ میں پولیس آفیسر ہوں اور ضرورت پڑی تو انہیں گرفتار کر لے آنا پڑے گا۔ دونوں گواہی دینے پر آمادہ تھے۔ میں اسی روز دلی سے واپس اپنے قتلہ چلا گیا۔ رات ہو چکی تھی۔ اب میں یہ لائق اختیار کرنا چاہتا تھا کہ سچی کو فرزانہ نے خود غائب کیا ہے اور الزام جمیل پر عاید کیا ہے تاکہ عابد جمیل سے بدظن ہو جائے لیکن میرا دماغ اس سوال پر اکر رہا کہ چلا جاتا تھا کہ کیا ماں اپنی دو دھڑھکی پچی کو غائب کر سکتی ہے؟ اس سوال پر اگر میں یہ سوچنے لگتا کہ یہ ڈرامہ صرف اسی صورت میں کامیاب ہو سکتا ہے کہ فرزانہ سچی کو زندہ یا مردہ جمیل کے گھر سے برآمد کر لے اور ایسی شہادت مہیا کرے کہ جمیل کا جرم ثابت ہو جائے۔ اس کے لیے کسی بڑے ہی قابل اور جرم کے ماہر دماغ کی ضرورت تھی۔ اب مجھے ان سوالوں کے جواب ڈھونڈنے تھے۔

عابد کی نوکرائی نے کہا تھا کہ وہ کھانا پکا کر بارہ بجے گھر سے نکلی تھی لیکن فرزانہ نے کہا تھا کہ نوکرائی دس بجے چلی گئی تھی تو کیا یہ ہو سکتا ہے کہ نوکرائی ایک بجے کے قریب گئی ہو اور فرزانہ کے ایما پر سچی کو ساتھ لے گئی ہو؟

عابد نے کہا تھا کہ اولاد پیدا نہ کرنے کا نقش جمیل میں ہے۔ اس نے پیشینہ سٹ ڈاکٹروں کی رپورٹیں مجھ سے کیں چھپائیں؟

کیا عابد کے پاس سچی کی پیدائش کے علاوہ کوئی اور ثبوت ہے کہ فرزانہ کا چال چلن اچھا نہیں؟

میں نے عابد کے گھر جا کر وہ دیوان دیکھا تھا جس پر سوئی ہوئی سچی کو ڈالا گیا تھا۔ ایک چیز دیکھنے کے لیے مختلف کمروں میں گیا تھا۔ مجھے وہ چیز نظر نہیں آئی تھی۔ صبح در بجے کے قریب میں پھر عابد کے گھر چلا گیا۔ فرزانہ کا میک اپ گہرا اور نازہ تھا۔ اس کی مار

اس کی ماں نے ایک بار بھی نہیں کہا کہ ان کی بچی برآمد کی جائے۔ ان پر عابدی جائیداد اور جمیلہ کے خلاف حسد اس حد تک سوار تھا کہ میں نے جھوٹی دوستی اور تہمتی کا اظہار کیا تو وہ تمام پردے اٹھا کر میرے سامنے آ گئیں۔ اس کے باوجود مجھے یہ یقین کرنا تھا کہ انہوں نے کبھی خود غائب کی ہے۔ یہ بھی ہر سنا تھا کہ بچی کو کوئی برہہ فردش یا کوئی اور پیشہ ور مجرم اٹھا لے گیا ہو اور ان ماں بیٹی نے جمیلہ پر شک کیا ہو یا جمیلہ کو اس میں ملوث کرنے کی سکیم بنالی ہو۔

اس شک کے پیش نظر مجھے ضرورت محسوس ہوئی کہ وہ چیزیں دیکھوں جو میں نے پہلے دن دیکھنے کی کوشش کی تھی لیکن نظر نہیں آئی تھیں۔ میں نے فرزانہ سے کہا۔ ”اتنی زیادہ ٹھنڈی آپ نے بچی کے نیچے گدا بچھائے بغیر دیوان پر ڈال دیا تھا؟“ دیوان پر گدا بچھانے کی ضرورت نہیں تھی لیکن میرا بھی ایک دودھ پیتا بچہ تھا۔ اتنے چھوٹے بچے کے نیچے چھوٹا سا گدا ضرور بچھا جانا ہے اور اکثر مائیں بچے کے پہلوؤں کے ساتھ چھوٹے چھوٹے گول تیکے ضرور رکھتی ہیں۔ مجھے گدے اور تکیوں کا خیال آیا تو میرا ذہن مزید اٹک گیا۔

میرا سوال سن کر فرزانہ ذرا سی گھبرائی پھر کہنے لگی۔ ”میں نے کبیل میں لپیٹ کر ڈال دی تھی۔“ میں نے کہا۔ ”آپ کی پہلی بچی ہے۔ آپ نے تو اس کے لیے بٹا خوبصورت گدا بنایا ہوگا؟“ میں نے سوال دوستانہ لیے میں کیا۔ اس نے کہا۔ ”بہت خوبصورت“ میں نے کہا۔ ”دکھائیے ذرا مجھے بھی اپنے بچے کے لیے خوبصورت سا گدا بنانا ہے۔“

فرزانہ کی گھبراہٹ نمایاں ہو گئی۔ اس نے مجھے ٹالنے کے لیے کوئی اور ہی بات شروع کر دی۔ فرزانہ کی ماں جو کمرے سے نکل گئی تھی، مایاں آگئی۔ اس وقت میرے ذہن میں

ایک اور سوال آگیا جو میں نے داغ دیا۔ میں نے پوچھا۔ ”آپ کو دودھ پریشان کرنا ہوگا۔“ میں نے سوچا تھا کہ دیوان اور تندرست لڑکی ہے، اس کا دودھ زیادہ اترنا ہوگا اور یہ بہت پریشان ہوتی ہوگی۔ فرزانہ کی بجائے اس کی ماں نے جواب دیا۔ ”دودھ تو بوتل سے پلاتے ہیں۔“ میں نے پوچھا کہ اپنا کبیل نہیں پلاتی؟ ماں نے مسکرا کر جواب دیا۔ ”اسے شروع میں ہی ایک دوائی دے کر دودھ خشک کر دیا تھا۔ ابھی یہ بھی تو بچی ہی ہے۔ اسی عمر میں اپنا دودھ پلانے لگی تو جسم بھدا ہو جائے گا۔ کمزوری بھی ہو جاتی ہے۔“

مجھے معلوم تھا کہ اکثر امیر لڑکیاں بچوں کو اپنا دودھ نہیں پلاتیں بلکہ دوائیوں سے دودھ خشک کر دیتی ہیں تاکہ جسم خراب نہ ہو۔ فرزانہ کی ماں کا جواب سن کر میں نے چانک کر یہ سوال کیا۔ ”بوتل کہاں ہے؟“ ماں بیٹی نے بیک وقت ایک دوسری کی طرف دیکھا اور میں نے دونوں کے چہرہ کو دیکھا۔ میں نے گدے اور بوتل کا تیرا میں چلا یا تھا۔ وہ نشانے پر بیٹھا۔ ماں نے کھیا فی ہنس کر کہا۔ ”وہ تو ٹوٹ گئی تھی؟“ میں نے پوچھا۔ ”کب؟“ فرزانہ اور اس کی ماں نے ایک ہی وقت جواب دیا لیکن جواب دو تھے۔ ماں نے کہا۔ ”کل“ اور بیٹی نے کہا۔ ”پرسوں۔“

اک مور کھ بانک

میں نے ان پر ظاہر نہیں ہونے دیا کہ میں نے یہ سوال تفتیش کے سلسلے میں کیے ہیں۔ میں ظاہری طور پر ذاتی دل چسپی کا اظہار کر رہا تھا۔ دیوان سے میں اٹھنے ہی لگا تھا کہ ایک نوجوان کمرے میں داخل ہوا۔ مجھے دیکھ کر وہ ششک گیا اور دروازے میں ہی رگ گیا۔ فرزانہ نے ہنس کر کہا۔ ”آجواز۔ آجواز۔“ ٹھانڈا صاب بہت اچھے آدمی ہیں۔“ اندر آ کر اس

نے میرے ساتھ ہاتھ ملایا۔ وہ خوبصورت نوجوان تھا اور اس کی خوبصورتی مردانہ نہیں بلکہ زنانہ تھی۔ میں نے اس وقت یہ رائے قائم کی تھی کہ وہ فرزانہ سے زیادہ خوبصورت ہے۔ فرزانہ نے اس کا تعارف ان الفاظ میں کرایا۔ ”اس کا نام تمجل ہے۔ اس کے والدین بچپن میں مر گئے تھے۔ اسے میری خالہ نے پالا ہے۔ بہت پیارا لڑکا ہے۔ آپ اس کا گانا سنیں تو سہل اور کان بالاکو بھول جائیں۔“

اُن دنوں مردگو تیل میں سہل اور عورتوں میں کان بالاک کی آوازیں بہت مشہور تھیں۔ میں نے گانا سننے پر آمادگی ظاہر کی تو فرزانہ نے اسے گانا سنانے کو کہا۔ اس نے سہل کا گایا ہوا ایک بڑا ہی اداس گیت شروع کر دیا۔ گیت کی اداسی کے ساتھ اس نوجوان لڑکے کی آواز کے سوز نے میرے جذبات کو بھی ہلا ڈالا۔ گیت کے الفاظ کچھ اس طرح تھے کہ ایک سچے ریت کا گھر دنیا بنا تا ہے اور اسے توڑ دیتا ہے۔ ایک دھیارا انسان خدا سے کہتا ہے کہ وہ تو مومکھ بالک ہے۔ خود ہی بنانا اور خود ہی توڑ دیتا ہے تو تو خدا ہے۔ تیری شان یہ تو نہیں کہ بچے کی طرح خود ہی بنائے اور خود ہی بگاڑے۔

گیت کے آخری مصرعے پر تمجل کے آنسو نکل آئے۔ وہ یتیم لڑکا تھا میں اس کے جذبات کو اچھی طرح سمجھتا تھا۔ گیت کے الفاظ اس کے دل کی گہرائیوں سے نکل رہے تھے۔ گانے کے دوران فرزانہ کو میں نے دیکھا وہ جن نظروں سے تمجل کو دیکھ رہی تھی انہیں سمجھنے میں کم از کم مجھے کوئی غلطی نہیں لگ سکتی تھی۔ تمجل کے آنسو نکلے تو فرزانہ کے بھی آنسو نکل آئے۔ میں نے اس لڑکے کے ساتھ اس کے متعلق باقیں شروع کر دیں۔ وہ جذباتی تھا۔ میں وہاں سے اٹھا تو میرے ذہن میں امید کی روشنی تھی۔ سچی کا گدا اور لڑل بچی کے ساتھ ہی گئی تھی۔ میں بہت حد تک یہ نتیجہ لے کر وہاں سے نکلا کہ بچی فرزانہ اور اس

نے غائب کی ہے اور اگر بچی عابد کی نہیں تو تمجل کی ہے۔ میں تھانے پہنچا تو فرزانہ نے خاندان کی رپورٹ ملی۔ فرزانہ کی ماں نین خاوند کر چکی تھی جن میں سے مرن ایک زندہ ہے۔ دوسرے چکے ہیں۔ جوانی میں اس نے غیر مردوں سے جنسی عیاشی بہت کی ہے۔ اسے ناوندوں کی مرن جاندا کے ساتھ دل چسپی رہی ہے۔ اس کے جو خاوند مر گئے ہیں ان کے مکان اس نے اپنے نام لکھوا لیے اور جو زندہ ہے اس نے اسے اس بنا پر طلاق دی تھی کہ وہ اس کا چال چلن اور اس کی نیت بھانپ گیا تھا۔ فرزانہ اس کے آخری خاوند کی بیٹی ہے۔ پلے خاوندوں سے اس کے دو بیٹے ہیں جو جوان ہو کر کہیں چلے گئے ہیں۔ فرزانہ کو وہ اپنے زہنگ کی ٹرننگ دے رہی ہے۔ کوئی شریف گھرانہ اس کی لڑکی کا رشتہ قبول کرنے کے لیے تیار نہیں تھا۔ عابد کے ساتھ یہ رشتہ فرزانہ کی خالہ نے دو تین عورتوں کو ساتھ ملا کر کیا تھا۔ ظاہر ہے کہ دل چسپی عابد کی جائیداد کے ساتھ تھی۔ جمیل کے گھرانے کی رپورٹ مرن تھی۔ عابد اور فرزانہ کے گھر کے متعلق یہ اطلاع ملی کہ تمجل نام کا ایک خوبصورت لڑکا عابد کی غیر حاضری میں عابد کے گھر جاتا ہے۔ شادی سے پہلے بھی اس لڑکے کے فرزانہ کے ساتھ تعلقات بیان کیے گئے۔

میں نے عابد کی نوکرائی کو ابھی ایک طرف کیا ہوا تھا۔ یہ میرا دانستہ اقدام تھا۔ اسے میں موقع دینا چاہتا تھا کہ یہ سمجھ لے کہ اسے تفتیش میں شامل نہیں کیا جائے گا۔ وہ اس جرم میں مرن شامل تھی۔ میں نے عابد کو تھانے بلایا۔ اب میں سیدھی سیدھی باتیں کرنے کے قابل ہو گیا تھا۔ عابد سے میں نے کہا۔ ”مرد کا قدرتی نقص کوئی شرمندگی والی بات نہیں ہوتی۔ آپ شاید یہ اعتراف کرنے میں بے عزتی سمجھتے ہیں کہ آپ اولاد پیدا کرنے کے قابل نہیں۔ یہ وصف تو قدرت نے آپ کو دیا ہی نہیں، اس میں آپ کا کیا تصور ہے؟“

ساتھ میری ان بن ہو گئی ہے۔ شادی کے فوراً بعد تھیل نے میرے گھر آنا شروع کر دیا تھا میں نے اپنی سادگی میں اسے فرزانہ کا بھائی سمجھا تھا میں اس حقیقت سے بھی طرح واقف تھا کہ وہ اس کا خال زاد ہے لیکن خال زاد کے بھائی نہیں ہوتے۔ تھیل نے ہی عرصے میں مجھے شک کرنے لگا کہ فرزانہ اور تھیل کے تعلقات مشکوک ہیں۔ میری نوکرائی اس روز سے میرے گھر میں ہے جس روز سے جمید میرے گھر آئی تھی۔ مجھے اس پر بھروسہ تھا۔ ایک روز میں نے نوکرائی سے کہا کہ وہ تھیل اور فرزانہ پر نظر رکھے لیکن اس نے دونوں کی تعریفیں شروع کر دیں۔

اور کہا کہ آپ ایسا شک نہ کریں، وہ تو بہن بھائی ہیں۔ ایک روز میں نے بہن بھائی کو نازیبا حرکتیں کرتے دیکھ لیا۔ فرزانہ، اس کی ماں اور نوکرائی نے مجھے ایسا گھبرا کر مجھے یقین کرنا پڑا کہ میں نے جو دیکھا ہے وہ شریفانہ حرکت تھی۔ میں جب تنہا ہوتا تھا تو مجھے یقین ہو جاتا تھا تھیل اور فرزانہ کے مراسم ناجائز ہیں مگر فرزانہ اور اس کی ماں کا سلوک دیکھتا اور ان کی باتیں سنتا تو میں اپنے آپ کو کہنے لگتا کہ میں نے بلاوجہ ایسا ذلیل شک کیا۔

”میں ایک روز یہ بہانہ کر کے کہ دتی ایک کانڈ باری کام سے جا رہا ہوں، دتی کے ایک اور ڈاکٹر کے پاس چلا گیا۔ اس نے میرا معائنہ اس طرح کیا جس طرح پہلے دو ڈاکٹروں نے کیا تھا۔ اس نے بھی یہی فیصلہ دیا کہ میرا خون اولاد پیدا کرنے کے قابل نہیں۔ میں واپس آیا تو فرزانہ نے مجھے یہ خبر سنائی کہ اس کی گودہری ہونے کی پہلی نشانیاں ظاہر ہو گئی ہیں۔

میرا دماغ چکر اٹھا۔ میں نے فرزانہ سے کچھ بھی نہ کہا۔ میں بہت بڑی غلطی کر چکا تھا۔ میں کسی سے کچھ نہیں کہہ سکتا تھا۔ مجھے سزا ملنی شروع ہو گئی۔ فرزانہ سے مجھے نفرت ہو گئی۔ میں نے جمید سے کہا کہ وہ میرے گھر آجائے لیکن فرزانہ کی موجودگی میں وہ میرے گھر نہیں آتا پابندی تھی۔ میں فرزانہ کو طلاق بھی نہیں دے سکتا تھا۔ میں نے اسے بلانا چھوڑ دیا اور

عابد نے مجھے جھٹلانے کی کوشش کی۔ میں نے لیڈی ڈاکٹر اور دونوں ڈاکٹروں کی رپورٹیں اس کے آگے رکھ دیں۔ وہ کبھی ان رپورٹوں کو دیکھتا اور کبھی ادھر ادھر دیکھتے جس سے اس کی گھبراہٹ ظاہر ہوتی تھی۔ اس کا رنگ پھیکا پڑ گیا اور جب اس نے میرا طرف دیکھا تو میں نے پوچھا۔ ”آپ کو جب پتہ چلا تھا کہ فرزانہ کی گودہری ہونے والی ہے اور آپ کی مریض ہو گئی ہے تو آپ خوش کیوں نہیں ہوئے تھے؟ آپ کو افسوس کیوں ہوا؟“

وہ واقعی سیدھا آدمی تھا۔ میں نے یہ سوال کر کے کوئی ایسا لازمی نقاب نہیں کیا۔ جو ساتویں زین کے نیچے دفن تھا۔ اسے فوراً سمجھ لیا چاہئے تھا کہ پردے کی یہ باتیں مجھے فرزانہ اور جمید نے بتائی ہیں اور ڈاکٹروں کی رپورٹیں مجھے جمید نے دی ہیں۔ اس کی آنکھیں ٹھہر گئیں کسی ایک بھی سوال کا جواب نہ دیا۔ میں سمجھا گیا کہ اس کے مردانہ وقار کو سخت ٹھیس پہنچی ہے۔ کوئی مرد کسی مرد سے یہ نہیں سننا چاہتا کہ وہ اولاد پیدا کرنے کے قابل نہیں۔ عابد کی تو زبان ہی لنگ ہو گئی۔ میں چند منٹ اس کے بولنے کا انتظار کرنا چاہتا تھا۔

”کیا آپ کو یقین ہے کہ بچی کا باپ تھیل ہے؟“

عابد کو یوں جھٹکا لگا جیسے میں نے اس کے جسم کے ساتھ بھی کاٹنگ تار لگا دیا ہو۔

”بڑی جیسی آواز میں پوچھا۔“ آپ کو کس نے بتایا ہے؟ جمید یا فرزانہ نے؟“

”جمید کو اس بات کا علم ہی نہیں۔“ میں نے کہا۔ اور فرزانہ اپنے گناہ کبھی تسلیم نہیں کرے گی۔ عابد صاحب! گھبرانہ جائیں، میری مدد کریں۔ مجھے یقینی برآمد کرنی ہے وہ اچانک بڑی ہی جاندار آواز میں بول پڑا۔ ”مجھے اس بچی کے ساتھ کوئی دلچسپی نہیں۔ بچی جمید نے نہیں اٹھائی اور نہ اس نے اٹھوائی ہے۔ یہ صبح ہے کہ فرزانہ نے

میں شریک ہے۔ میں کوئی ثبوت نہیں دے سکتا۔

بچی کا باپ کون؟

عابد کا بیان میں نے بہت فخر کھا ہے۔ وہ پورا ایک گھنٹہ بولتا رہا تھا۔ ایک بار اس کے آسبھی نکل آئے تھے۔ اس نے کام کی بہت سی باتیں بتادیں اور میرا ذہن اس معاملے میں صاف ہو گیا کہ بچی کی نگہداشت کے پیچھے فرزانہ اور اس کی ماں کا اپنا ہاتھ ہے اور اس جرم میں نوکرانی بھی شامل ہے اور تھیل بھی۔ مجھے شک یہ تھا کہ بچی نوکرانی کے گھر میں ہوگی۔ میں نے عابد سے نوکرانی کے گھر کے متعلق پوچھا تو اس نے ایسے علاقے کا نام دیا جہاں اسی کلاس کے لوگ رہتے تھے۔ وہاں جواری اور چھوٹے موٹے جرائم کرنے والے لوگ بھی رہتے تھے۔ اس آبادی کے لوگوں کا آپس میں اتفاق بہت تھا۔ وہ ایک دوسرے کے جرائم پر پردہ ڈالے رکھتے تھے۔ چوری کا مال وہاں جا کر غائب ہو جاتا تھا۔ ایک گھر میں جو چل رہا ہو تو ساتھ والے گھر کے لوگ چوکیداری کرتے تھے۔ اس بستی کے کسی گھر پر چھاپہ ہمیشہ ناکام رہتا تھا۔ کچے کچے، چھوٹے چھوٹے مکان ایک جھرمٹ کی شکل میں تھے۔ تنگ اور گندمی گلیاں، ارد گرد کوئی آبادی نہیں تھی۔ اس آبادی کے بچے دور سے کسی شکوک آدمی کو تڑنا دیکھتے تو کانوں کان ساری آبادی کو خبردار کر دیتے تھے۔ وہاں جو شریف قسم کے خاندان، بیرے اور گھروں کے نوکر رہتے تھے وہ دوسروں کے ڈر سے ان کے ساتھ تعاون کرتے تھے۔ اس لئے میں نے نوکرانی کے گھر چھاپہ مارنے کو نظر انداز کر دیا۔ اس کی بجائے میں نے ایک اور پروگرام بنایا۔ یہ میری غلطی تھی۔

میں نے یہ غلطی مسلمان گھرانوں کی عزت بچانے کی غلطی کی۔ میں اس معاملے میں خاصا

اس نے اور اس کی ماں نے میرے اشاروں پر ناچنا شروع کر دیا۔ میں گھراتا تو فرزانہ کی ماں میرے بولوں کے تسکے کھولنے بیٹھ جاتی۔ فرزانہ میرے پاس بیٹھ کر روتی اور اپنی محبت کا یقین دلاتی ہیں۔ اسے کبھی بھی نہیں کہا کہ اس کے پیٹ میں جو بچہ ہے وہ میرا نہیں حقیقت یہ ہے کہ فرزانہ اور اس کی ماں جب مجھے اپنے پیار میں جکڑتی تھیں تو میں اس دھوکے میں آ جاتا تھا کہ آنے والے بچے کا باپ میں ہی ہوں۔ مجھے رام کر کے فرزانہ چلا کے خلات باتیں شروع کر دیتی۔ میں جب جمیل کے پاس جاتا تو میرا ذہن صاف ہو جاتا۔ دار کوئی کرا اور فریب نہیں تھا میں نے دو مکان اور ایک دکان جمیل کے نام رجسٹری کر دی۔ ”مجھے اپنی نوکرانی پر کوئی بھروسہ نہیں رہا۔ معلوم ہوتا ہے کہ ماں بیٹی پیسے سے اس کا منہ بند رکھتی ہیں۔ بچی پیدا ہوئی اور تین ماہ کی ہوئی تو ایک روز مجھے اطلاع ملی کہ بچہ کو کوئی اٹھا لے گیا ہے۔ آپ سچ پوچھیں تو اس اطلاع سے مجھے کوئی افسوس نہیں ہوا مگر میں نے یہ بھی دیکھا کہ فرزانہ کو بھی جیسے کوئی افسوس نہیں تھا۔ اس کی ماں نے رونا کی فٹوری سی ایکٹنگ کی پھر دونوں جمیل کو برا بھلا کہنے بیٹھ گئیں۔ نوکرانی نے بھی ان کے ساتھ دیا۔ بیٹوں نے کہا کہ جمیل یہاں آکر کئی بار یہ دھمکی دے گئی ہے کہ اگر اس گھر میں پیدا ہوتا تو سچ اس گھر میں نہیں رہے گا۔ مجھ پر غاموشی طاری ہو گئی۔ میں ایسا چالاک آدمی نہیں ہوں۔ ایسے لوگوں سے کبھی واسطہ نہیں ڈالتھا۔ میں نے صحت محفلے والوں کو دیکھا کہ لیے تھانے میں رپورٹ درج کرادی میں کسی کو یہ بتانے سے بھی گھبراتا تھا کہ بچی میری ہی اب میری دل چسپی یہ نہیں کہ بچی برآمد کر کے مجھے دلائی جائے بلکہ یہ سراغ نکالیا جائے کہ بچی کو کس نے غائب کیا ہے۔ میں آپ کو یہ راز بتا سکتا ہوں کہ جمیل ایسا جرم نہیں کر سکتا بچی فرزانہ اور اس کی ماں نے غائب کی ہے۔ یہ بچی میری نہیں ہے میری نوکرانی اور

”نہیں“

میں نے ڈاکٹر مرل کی رپورٹیں اسے دکھا کر کہا۔ ”عابد کسی بچے کا باپ نہیں بن سکتا۔ یہ ڈاکٹروں نے کھا ہے۔ تم جاؤ اور اسے چکے میں پڑ کر سیدھی جیل جا رہی ہو۔ میں تمہیں اس چکر سے بچانا چاہتا ہوں۔ بچی کو گھر لے آؤ۔“

”لیکن بچی ہے کہاں؟“ وہ ابھی تک مجھے چکر دے رہی تھی۔

”جہاں تم نے اسے بھیجا ہے۔“ میں نے کہا۔ ”جہاں تم نے دودھ کی بوتل بچی کے گھر سے اور کپڑے بیچے ہیں۔ تم بچی نہیں لاؤ گی تو آج شام سے پہلے پہلے میں دہاں سے بچی کو لے آؤں گا۔ پھر تم اپنی ماں، نوکرانی اور تجمل کے ساتھ تین سال کے لیے جیل خانے میں چلی جاؤ گی۔“

اس وقت میں نے محسوس کیا کہ ڈیوڑھی میں سے گزرنے والی باہر گیا ہے۔ میں ادھر توجہ دے سکا کیونکہ فرزانہ نے بڑی زور سے چلانا شروع کر دیا۔ ”اچی اچی ادھر آنا دڑا۔ دیکھو یہ کیا کہہ رہے ہیں۔“ اس کی ماں فوراً کمرے میں آ گئی۔ تب میں نے سچے آواز دے کر اس کے ساتھ ہی کھڑی باتیں سن رہی تھی۔ میں نے اسے بھی یہی باتیں کہیں جو میں فرزانہ سے کہہ چکا تھا۔ وہ پانی کھلاڑی تھی۔ ایسی بھولی بنی جیسے بڑی ہی سیدھی عادی عورت ہو اور جیسے اسے میری کوئی بات سمجھ ہی نہ آ رہی ہو۔ تجمل اور فرزانہ کے تعلقات کے متعلق اس نے قرآن کی تسبیح کھائیں اور کہا کہ یہ نہ بولے ہن بھائی ہیں۔ یہ تو جمیلہ اور عابد نے آپ کے کان بھر دیئے ہیں۔

میں نے اس کے ساتھ آدھا گھنٹہ مفر کھپائی کی مگر یہ عورت پردوں پر پانی نہیں پڑنے دے رہی تھی۔ مجھے بہر حال یقین ہو چکا تھا کہ بچی ان دونوں نے غائب کی ہے اور

جذباتی ہو کر تھکا۔ میں نے اپنے پولیس کے فرائض سے ہٹ کر یہ سوچا کہ فرزانہ اور اس کی ماں سے کس کو وہ بچی خود ہی گھر لے آئیں اور میں اس شرط پر ان کے خلاف مقدمہ قائم نہ کر دوں گا کہ فرزانہ عابد سے طلاق لے کر تجمل کے ساتھ شادی کرے۔ ایسا اقدام میرے فرائض میں شامل نہیں تھا بلکہ فرائض کے منافی تھا۔ میں دراصل جمیلہ کو از سر نو عابد کے گھر آباد کرنا چاہتا تھا۔ دونوں ایک دوسرے کو چاہتے تھے اور عابد اپنی لغزش پیش کی سزا اچھا بچکا تھا۔

میں فرزانہ کے گھر چلا گیا۔ وہ مجھے بے تکلفی سے ملی۔ اس کی ماں بھی دوڑی آئی۔ نے اس کی ماں کو کمرے سے نکال دیا۔ میرے روئے میں اب درستی کا رنگ ناپید تھا۔ میر فرزانہ سے کہا۔ ”فرزانہ جیل جانا چاہتی ہو یا اپنی ماں کے گھر؟“ اس کے چہرے اور میں جو تبدیلی آئی وہ میں بیان نہیں کر سکتا۔ وہ کچھ کہنا چاہتی تھی، مگر ہونٹ صرف کا اس کے منہ سے کوئی بات نہ نکلی۔

میں نے اسے کہا۔ ”میری بات پورے دھیان سے سنو۔ اگر میری جگہ کوئی ہندو تھا تو یہ بتا دیتا کہ تم، تمہاری ماں، تجمل اور تمہاری نوکرانی حالات میں بند ہوتیں اور یہی برآمد ہو چکی ہوتی۔ میں مسلمان ہوں تمہیں ساری عمر کی بے عزتی سے بچھپ چاہتا ہوں۔“

”کوئی ماں اپنی بچی کو خود غائب نہیں کر سکتی۔“ اس نے کہا۔ ”عابد صا کو خدا نے بارہ سال بعد۔۔۔۔۔“

”یہ سچی عابد کی نہیں۔“ میں نے اس کی بات کاٹ دی۔ ”اس کا باپ تجما تم انگریزی پڑھ سکتی ہو؟“

وقت بچانے کا کوئی ذریعہ نہ تھا۔ میں اب ان عورتوں کو چھوڑ نہیں سکتا تھا۔ میں نے بیڈ کانٹیل سے کہا کہ ان دونوں کو زیرِ جرات سمجھ کر انہیں کمرے میں بٹھالے اور اوپر اُدھر نہ ہونے دے۔ میں خود تھکانے کی طرف دوڑا۔ مجھے کم از کم چار کانٹیلوں کی ضرورت تھی۔

نوکرانی کو گئے بہت وقت ہو گیا تھا۔ مجھے تھکانے تک پہنچنے کچھ وقت لگ گیا۔ میں نے چار کی بجائے چھ لالچی بردار کانٹیل ساتھ لیے اور اس آبادی کی طرف نکل کھڑا ہوا جہاں نوکرانی رہتی تھی۔ ایک تانگرہ روکا اور ہم سات افراد اسی میں بیٹھ گئے۔ آبادی تک پہنچے۔ کانٹیلوں کو آبادی کے راستے روکنے کے لیے بھیج دیا اور ایک آدمی سے نوکرانی کا گھر پوچھ کر میں اس کے گھر تک پہنچا۔ ایک لاغر اور مریض سا آدمی باہر کا دروازہ بند کر کے تالا لگا رہا تھا۔ میرے ساتھ والے آدمی نے بتایا کہ یہ اس کا خاوند ہے۔ میں نے اس کے ہاتھ سے تالا چھین کر برے چھینک دیا اور دروازہ کھول کر اندر چلا گیا۔ چھوٹا سا صحن اور صحن ایک ہی کمرہ تھا۔ میں نے پوچھا۔ ”وہ کہاں ہے؟“ خاوند نے معصوم بن کر جواب دیا۔ ”وہ تو صبح سے کام پر گئی ہوئی ہے۔ رات کو آئے گی۔“ میں نے اس کی بات سنی ان سنی کر دی اور کمرے میں چلا گیا۔ میں نے اس عورت کے خاوند کو کان سے پکڑ کر کھینچا اور دھکا دے کر اندر چھینک دیا۔ وہ منہ کے بل گرا۔ میں نے کہا۔ ”بچی کی جو چیزیں یہاں پڑی ہیں وہ نکال دو۔“ وہ گھبرا ہوا اٹھ رہا تھا میرے ساتھ ایک کانٹیل تھا۔ اس نے لالچی کا نیچے والا سرا اس کے سینے پر رکھ کر زور سے دبا دیا اور اسے دیوار کے ساتھ لگا دیا اور زور سے دبا تو اس کی چیخ نکل گئی۔ کانٹیل

اب انہیں ڈھیل دی تو یہ بچی کا گلا گھونٹ کر لاش جمید کے گھر پھینکنے کی کوشش کریں گی اور یہ حرکت رات کو ہی ہو سکتی ہے اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ بچی کو زندہ ہی اس کے گھر کسی طرح دکھ آئیں اور لوگوں سے کہیں کہ جمید کے گھر چل کر دیکھو، بچی کو اس نا چھپا رکھا ہے۔ یہ تو میری قیاس آرائی تھی کہ وہ بچی کو اب کس طرح استعمال کریں گی ایسے استعمال کے لیے بڑے ہی قابلِ دماغ کی ضرورت تھی۔

ماں کی ایکٹنگ دیکھ کر بیٹی بھی دلیر ہو گئی۔ اس نے کہا۔ ”اگر مجھے بتا دیں جمید نے آپ کو کیا دیا ہے تو میں اس سے دو گنا دوں گی۔ آپ نہیں اس طرح پریشان کریں۔“ میرے صبرِ متحمل اور اسلامی جذبے کی حد ختم ہو گئی۔

میرا بیڈ کانٹیل اور ایک کانٹیل باہر کھڑے تھے۔ میں نے باہر جا کر کانٹیل کو غائب کی دفتر نما دکان کا پتہ دیا اور اسے کہا کہ فوراً گھر آجائے۔ وہ دوڑتا گیا میں کمرے میں آکر مادرِ چلی خلع میں چلا گیا پھر دوسرے تین چار کمروں میں گیا۔ نوکرانی نظر نہ آئی۔ فرزانہ اور اس کی ماں بھی کمرے سے باہر آئیں۔ میں نے ان کو پوچھا۔ ”نوکرانی کہاں ہے؟“ ماں نے کہا۔ ”یہیں تھی۔“ اور اس نے آوازیں دینی شروع کر دیں۔ پھر بولی۔ ”شاید چلی گئی ہے۔“ تب مجھے یاد آیا جس وقت فرزانہ نے کمرے میں ماں کو بلایا تھا، اُس وقت کوئی ڈیڑھ گھنٹہ سے کہ باہر گیا تھا۔ میں نے ان سے پوچھا۔ ”اس وقت وہ کہاں گئی ہوگی؟“ مجھے جو ملا وہ مشکوک تھا۔ ماں اور بیٹی کالب و لہجہ بتا رہا تھا کہ ماں نے میری وہ باتیں سن گئیں جو میں فرزانہ سے کر رہا تھا۔ اس نے نوکرانی کو بھگا دیا ہے کہ بچی کو غائب دو۔ میرے پاس صرف بیڈ کانٹیل ہی تھا۔ تھکانے سے مزید کانٹیل بلانے کا

بالوں کی۔ اس نے بہت سارے نوٹ بھی ٹرنک میں رکھے اور مجھے بتایا کہ یہ بچی کے مال باپ نے دیے ہیں۔ حضور! مجھے پہلے ہی روز سے شک تھا کہ یہ کوئی اور ہی معاملہ ہے لیکن میں اس کا حکم مانا کرتا ہوں، اس سے کچھ پوچھنے کی جرات نہیں کرتا۔“

بیمار خاوند ہوشیار بیوی

میں نے اس سے مزید معلومات لینے کے لیے کہا کہ وہ تھکانے چلے بچی کی جو چیزیں برآمد ہوئی تھیں ان کا مشیر نامہ تیار کیا۔ ضروری کارروائی کی اور اسے ساتھ لے کر تمام کانسٹیبلوں کو اکٹھا کیا۔ اسے چار کانسٹیبلوں کے ساتھ تھکانے بھیج دیا اور خود کانسٹیبلوں کو ساتھ لے کر عابد کے گھر کی طرف چلا گیا۔ وہاں تک پہنچتے کچھ اور وقت لگ گیا۔ اب تو ایک ایک منٹ تمیختی تھا۔ مجھے بچی کو سچا نا تھا۔ میں سمجھ گیا کہ فرزند، اس کی ماں اور نوکرانی کو قبل از وقت پتہ چل گیا تھا کہ میں جان چکا ہوں کہ بچی نوکرانی کے گھر میں ہے چنانچہ انہوں نے فوری کارروائی کر کے بچی کو وہاں سے اٹھالیا۔ میں اپنی اس غلطی پر پچھتانے لگا کہ ان عورتوں کو مسلمان سمجھ کر ان کی عزت بچانے کا ارادہ کیا اور اپنی ڈیوٹی سے کوتاہی کی مجھے عابد کے بیان کے فوراً بعد ان تینوں کو حراست میں لے لینا چاہیے تھا یا انہیں شامل تفتیش مشتبہ قرار دے کر تھکانے لے جا کر بٹھا دیتا اور نوکرانی کو تفتیش کی ایسی چلی میں بیٹنا کہ وہ خود بھی برآمد کر دیتی۔ مگر مجھے مسلمانوں کی محبت نے مارا اور اب میں جو کر کے کی طرح جھاگ چھڑا تھا۔ میرا مسئلہ اب یہ تھا کہ بچی کو زندہ برآمد کر دوں۔ وہ حلال کی تھی یا حرام کی، میرے لیے وہ معصوم اور بے گناہ بچی تھی۔ بچی کا قتل میری برداشت سے باہر تھا۔ اوپر سے شام ہو گئی تھی۔ یہ ایک انسانی دشواری پیدا ہو گئی۔ میں نے ایک ناکام

نے کہا۔ ”سنا نہیں تو نے انہوں نے کیا کہا ہے؟“
اس نے گردن گھما کر دیکھا تو میں نے اس کے سینے سے کانسٹیبل کی لاسٹھی ہٹا دی۔ مجھے ڈر تھا کہ وہ مر ہی نہ جائے۔ وہ تو لاش کی مانند تھا۔ ہڈیوں کا ڈھانچہ۔ اس نے چپ چاپ ایک ٹرنک کھولا اور اس میں سے بچی کے چار فرک، دو سوپٹیں، ادنیٰ موٹے روڑھ کی بوزل اور دو تین اور چیزیں نکال دیں۔ میں نے پوچھا۔ ”بچی کہاں ہے؟“
اس نے ہاتھ جوڑ کر جواب دیا۔ ”وہ لے گئی ہے۔“

”کہاں؟“

”کوئی سی قسم لے لو۔ اس نے مجھے نہیں بتایا۔“ اس نے جواب دیا اور دوپڑا کھینچ لگا۔
”ایک گھنٹہ ہوا دوڑتی آئی تھی۔ بچی کو کبل اور گردے میں لپیٹ کر اٹھالیا اور مجھے کہا کہ بچی کی تمام چیزیں ٹرنک میں رکھ دو۔ میں نے رکھ دیں۔ پھر اس نے مجھے کہا کہ باہر نکلا لگا کر کہیں چلے جاؤ۔ رات کو آنا۔ میں رات دیر سے آؤں گی پھر وہ چلی گئی اور میں نے بچی کی ساری چیزیں چھپا دیں۔ میں فوراً باہر نہیں گیا۔ اب جا رہا تھا کہ آپ آگئے۔“
”تمہیں معلوم ہے کہ وہ بچی کو کہاں لے گئی ہے؟“

اس نے پھر ہاتھ جوڑ دیئے اور کہا۔ ”حضور! میں اس عورت کا خاوند ضرور ہوں۔ لیکن اس کا محتاج ہوں۔ میں دسے کا رخصت ہوں۔ دسویں محنت کرتا ہوں تو دسے کا ایسا دورہ پڑتا ہے کہ بے ہوش ہو جاتا ہوں۔ میں کوئی کام نہیں کر سکتا۔ یہ عورت نوکری چاکری کر کے مجھے پال رہی ہے۔ خدا نے تین بیٹے دیئے تھے۔ تینوں مر گئے ہیں۔ میں اس عورت کے کسی کام میں دخل نہیں دیتا ایک روز بچی کو لے آئی اور مجھے بتایا کہ اپنا کوئی بچہ زندہ نہیں رہتا۔ یہ ایسے گھر سے مانگ کر لائی ہوں جہاں پہلے ہی سات لڑکیاں ہیں۔ اسے

ہے؟“ انہوں نے بھی نوکرائی کی طرح روننا اور چیخنا شروع کر دیا۔ عابد گھر میں تھا۔ تین عورتوں کی چیخ دیکار سے محلے کی عورتیں، بچے اور پانچ چھ مرد جمع ہو گئے۔ میں نے گھر کی تلاشی لی۔ کوئی گونہ نہ چھوڑا۔ بچی کا کوئی سراخ نہ ملا۔ میرے پاس ایک کانسیبل تھا۔ مجھے اب تھل کو پکڑنا تھا اور نہ جانے کہاں کہاں چھاپے مارنے تھے اور یہ خیال بھی تھا کہ بچی شہر سے باہر بھی لے جانی جاسکتی ہے۔ ریلوے سٹیشن، لارلیوں کے اوڑے اور شہر سے باہر جانے والے راستوں کی ناکہ بندی ضروری تھی۔

میں نے محلے کے ایک آدمی کو یہ کہہ کر تھانے دوڑا یا کہ اسے۔ ایس۔ آئی۔ بیڈ کانسیبل اور چار کانسیبلوں کو فوراً بلا لائے۔ میں نے جوتا نگر روکا ہوا تھا وہ اسے دے دیا۔ ادھر تین عورتیں تماشائیں کو دیکھ کر زور زور سے دوسری تھیں جیسے ان پر ظلم ہو رہا ہو۔ میں نے ڈیوڑھی سے تماشائیں کو ہٹا دیا اور ان عورتوں سے کہا کہ اب وہ آسمان میرے سر پر چھینک دیں پھر بھی وہ قانون کے پھندے سے نہیں نکل سکیں گی۔ میں نے کانسیبل کو ڈیوڑھی میں کھڑا کر دیا اور خود اندر ٹھلے لگا۔ فرزانہ نے مجھے سر کے اشارے سے ایک کمرے میں چلنے کو کہا اور خود کمرے کے دروازے میں جا کھڑی ہوئی۔ اس کی ماں اور نوکرائی دوسرے کمرے میں چلی گئیں۔ میں فرزانہ کے ساتھ کمرے میں داخل ہوا تو اس نے دروازہ بند کر لیا۔ آگے آ کر میرے ہاتھ پکڑ لیے اور بولی۔ ”مجھے ہر وقت اپنا غلام سمجھیں۔ جب بھی اور جہاں بھی بلائیں گے میں آ جایا کروں گی۔ آئیے میں دروازہ بند کر دیتی ہوں۔“

ایسی پیش کش کبھی کبھی تھانی لاروں کو ہوا کرتی ہے۔ ایسی خوبصورت اور نوجوان لڑکی کو ٹھکانا کسی مرد کے لیے آسان نہیں ہوتا۔ دین دھرم والے روپے پیسے کی

پکڑ لیا اور اسے اپنے ساتھ رہنے کو کہا۔ اس سے رات بھر کے پیسے پوچھے تو اس نے ہاتھ جوڑ کر کہا۔ ”عالی جاہ! آپ کا اپنا ناکہ ہے۔ پیسے آپ ہی سے لینے ہیں؟“ ہماری مجبوری دیکھ کر ایسے ایسے خطرناک کیسوں کی تفتیش کے لیے ہمارے پاس ٹرانسپورٹ نہیں ہوتی تھی۔ میں نے ناکہ والے کو تعین دلایا کہ اسے پیسے ملیں گے۔ بیگار نہیں۔ وہ خوش ہو گیا۔ میرے ساتھ دو کانسیبل تھے۔ میں سوچ رہا تھا کہ بچی کو یہ لوگ جہیل کے گھر نہ چھینک دیں۔ میں نے ایک کانسیبل کو جہیل کے گھر کا آنا پتہ بتا کر کہا کہ وہ جہیل کے باپ سے کہے کہ آج رات اپنے گھر کا پہرہ دیں۔ سردیوں کی راتیں تھیں لوگ اندر سوتے تھے۔ میں نے پیغام بھجوایا کہ رات اپنی پھنتوں پر بھی نظر رکھیں اور محلے کے دو تین آدمی رات کے وقت کہیں چھت پر چھپے رہیں۔ میں نے کانسیبل سے کہا کہ وہ انہیں ساری بات بتا دے تاکہ وہ گھبرانے لگیں۔

دوسرا کانسیبل میرے ساتھ تھا۔ میں عابد کے گھر پہنچا۔ دروازے پر دستک نہ بغیر اندر چلا گیا۔ دروازے کے سامنے والے کمرے میں مجھے فرزانہ، اس کی ماں اور نوکرائی سر جوڑے ہوئے بیٹھی نظر آئیں۔ مجھے دیکھ کر گھبرا گئیں اور اٹھیں۔ نوکرائی کا ان عورتوں کے ساتھ یوں بیٹھنا سارے شکوک دفع کر رہا تھا۔ میں نے نوکرائی کی پٹیا پکڑ لی اور کچھ کر اسے لٹکی طرح گھما دیا۔ پھر اسے سیدھا کر کے پوچھا۔ ”بچی کہاں ہے؟“ اس نے بڑی زور زور سے رونا اور چیخنا شروع کر دیا۔ مجھے رحم اس لیے نہیں آیا تھا کہ یہ عورتیں مجھ سے تھیں۔ غصے کی وجہ یہ تھی کہ میں انہیں جیل خانے اور رضوائی سے بچانا چاہتا تھا اور وہ مجھے چکر دے رہی تھیں۔

میں نے فرزانہ اور اس کی ماں سے پوچھا۔ ”اب بھی وقت ہے بتاؤ بچی کدھر

عزت ٹوٹ رہا ہے۔۔۔ وہ یہی کچھ بکیتی کرے سے نکل گئیں۔ میں سمجھ گیا کہ یہ کیا چال ہے۔ انہیں غالباً یہ توقع تھی کہ میں فرزانہ کی پیش کش قبول کر لوں گا اور وہ مجھے موقع پر کھڑی لیں گی۔ فرزانہ بھی چالاک تھی۔ اس نے یہ سوچا ہوگا کہ میں اسے قبول تو کرتا ہوں مگر اس لیے ڈرامہ مکمل کرنے کے لیے شملار ہی اتار دوں۔

ان عورتوں کو یہ امید ہوگئی کہ میں ڈر جاؤں گا اور اپنے جرم کو چھپانے کے لیے ان کی شرطنیں مان لوں گا۔ لیکن میں نے کچھ بھی نہ کیا۔ وہ چغیتی رہیں، امن میں جو آیا بکیتی رہیں اور میں ان کے سامنے ٹھنڈا رہا۔ پولیس والوں کا واسطہ تو اس سے بھی زیادہ ذلیل اور خطرناک صورت حال سے بڑھ جاتا ہے۔ بڑے بڑے ڈاکوؤں، قاتلوں، فرزانہ سے زیادہ حسین اور چالاک لڑکیوں، کئی پھٹی لاشوں اور زانی گرامی استادوں سے جن کا واسطہ پڑنا ہے وہ اگر تین عورتوں سے ڈر جائیں تو قانون کا اللہ ہی حافظ ہے۔ وہ بکیتی رہیں اور میں ان کے سامنے اس طرح ٹھنڈا رہا جیسے میرے کان ہی نہیں ہیں۔ بدبختوں نے یہ بھی نہ سوچا کہ انہوں نے مجھ پر ثابت کر دیا ہے کہ وہ مجرم ہیں اور جرم سے بچنے کے اچھے طریقے بھی جانتی ہیں۔ یہ دیکھ کر یہ شخص تو پتھر ہے یا برت ہے، وہ خود ہی چپ ہو گئیں۔ اتنے میں عابد آگیا۔ اسے دیکھ کر معلوم نہیں کیوں میری ہنسی نکل گئی۔ اس کے چہرے پر گہرا ہنس تھی جو میری ہنسی سے دور ہو گئی۔ وہ مسکرایا میں نے کہا۔ ”خدا کے بندے تم تو طوائفوں کے جال میں پھنسے ہوئے ہو۔“ اسے دیکھ کر کمزور چپ ہو گئیں۔ فرزانہ نے شملار باندھ لی تھی۔ ان کا ڈرامہ غلاب ہو گیا تھا۔ میں نے عابد کو بتایا کہ یہ تینوں حراست میں ہیں۔ ابھی انہیں پولیس سٹیشن لے جا رہا ہوں۔ تم جیل کو یہاں لے آؤ۔ میں نے دیکھا کہ اہل کی آنکھوں میں آنسو آگئے تھے۔ اس

رشوت کو ٹھکرا دیا کرتے تھے لیکن ایسی دلکش رشوت سے منہ موڑنے کے لیے پتھر جیسے کردار کی ضرورت ہوتی تھی۔ یہ رشوت آج بھی چلتی ہے اور قتل، ڈاکے اور انوکھی پکڑی ہوئی وارداتیں گول ہرجائی ہیں۔ میں اس وقت جوان تھا۔ تنگی کا لیاں دبا کر تا تھا۔ آنتہائی ذلیل کپڑاں کر لیتا تھا۔ ان کے بغیر تفتیش مکمل نہیں ہوتی تھی لیکن مجھ میں یہ وصف معلوم نہیں کہاں سے آگیا تھا کہ مسلمان عورت کی خاطر اپنی نوکری کو بھی خطرے میں ڈال دیا کرتا تھا۔ کہاں یہ مسلمان بیٹی مجھے اپنا آپ رشوت کے طور پر پیش کر رہی تھی۔ میں وہ باتیں اور حرکتیں کھنا نہیں چاہتا جو اس نے مجھے گمراہ کرنے کے لیے کیں اور میرے کردار اور ایمان کو کیسی کڑی آزمائش میں ڈالا۔ یہ باتیں بہت ہی تنگی اور فحش ہیں۔ میں نہیں چاہتا کہ میری بیچیاں ایسی باتیں پڑھیں۔

میں نے اسے کچھ بھی نہ کہا۔ دروازے کی طرف چلا تو اس نے میرا دستہ روک لیا۔ میرا جسم کانپ رہا تھا اور شاید میرا داغ چکرا رہا تھا۔ مجھے آنسوں جو رہا تھا کہ یہ ہے وہ لڑکی ہے رسوائی سے بچانے کے لیے میں نے اپنے فرائض میں کوتاہی کی تھی مگر اس لڑکی نے آزار بند کھول کر اس طرح چھوڑ دیا تھا کہ اس کی شملار اس کے پاؤں میں گری ہوئی تھی۔ دروازے کی چٹختی کھلی تھی۔ میں دروازے کی طرف چلتا تو وہ مجھے روک لیتی۔ میں نے تنگ آکر اس کے سر پر ہاتھ رکھا اور اس کے بال ٹٹھی میں لے کر بڑی تندہ سے کھینچنے اور موڑنے کر لڑکی کو پرے چھینک دیا۔ لڑکی کے دانت پسنے لگے اور اس کے منہ سے ”سی“ کی جگہ سی آواز نکلی۔

اچانک کمرے کا دروازہ کھلا۔ فرزانہ کی ماں اور نوکرانی نے ہاتھ مل کر چلاتا شروع کر دیا۔ ”ہائے، یہ دیکھو کیا ظلم ہو رہا ہے۔ ہماری بیٹی پر چھوٹا زہم لگا کر اس کی

وہ جھک گیا جیسے بوی کو نہیں بلانا چاہتا۔ میں اب کسی کے ساتھ موت کرنے کے موڈ میں نہیں تھا۔ میں نے دبے سے کہا۔ ”میں نے کہا ہے کہ اپنی بوی کو بلاؤ۔“ وہ فوراً اٹھا۔ اندر گیا۔ اندر سے اس کی یہ آواز سنائی دی۔ ”تمہیں کہہ کر ہار گیا ہوں کہ اس حواضر دے کو سمجھائے یا گھر سے نکال دے۔ اب باہر آ کر پولیس کو جواب دے وہ کہاں گیا ہے۔“

خامہ آگئی۔ اس کی زبان کا پتہ رہی تھی۔ میں نے اسے کہا۔ ”تمہاری بہن، بھانجی اور اس کی نوکرانی گرفتار ہو چکی ہیں۔ اگر تم بھی ان کے ساتھ جانا چاہتی ہو تو میں تمہیں نہیں روکوں گا۔ اگر اپنی عزت عزیز ہے تو میں جو پوچھوں وہ صبح صبح بتا دو۔ نکل کس وقت گھر سے نکلا تھا؟“ اس نے تقریباً وہی وقت بتایا جس وقت میں فرزا کے کمرے میں بیٹھا تھا اور کوئی ڈیوڑھی میں سے گزر کر باہر گیا تھا۔ یہ نوکرانی تھی۔ میں نے خامہ سے پوچھا۔ ”وہ کسی کے بلائے پر باہر گیا تھا یا خود ہی نکل گیا تھا؟“

”بلا یا تو کسی نے نہیں تھا۔“ اس نے کہا۔ ”جہاں تک مجھے یاد ہے وہ خود ہی نکل گیا تھا۔“

”اس وقت باہر کا کوئی آدمی، بچہ یا کوئی عورت تمہارے گھر میں آئی تھی؟ اچھی طرح یاد کر کے بتاؤ۔“

”ہاں، فرزا کی نوکرانی آئی تھی۔“ اس نے جواب دیا۔ ”بہن تھی کہ میری بہن نے اسے بھیجا ہے کہ ان کی خیر خیریت معلوم کر آؤں۔ بہت دھن سے میری بہن مجھے نہیں ملی تھی۔“ مجھے یہ سمجھ میں دیر نہ لگی کہ نوکرانی وہاں کیوں گئی تھی۔ کسی ہوش مند پولیس آفیسر کے لیے یہ سمجھنا مشکل نہیں ہوتا۔ میں نے خامہ سے کہا۔ ”اب داغ پر دراز دروازہ اور بتاؤ

نے بتایا کہ وہ جمید کے گھر سے آ رہا ہے۔ کانسٹیبل نے وہاں بتا دیا تھا کہ رات کو اپنے گھر کا پہرہ دیں۔ عابد اپنے اس گھر کی خبر لینے آ گیا۔ میں نے اسے ساری بات بتا دی، تو اس نے کہا کہ جب میں ان تینوں کو تھانے لے جاؤں گا تو وہ جمید کے گھر چلا جائے گا۔ تاکہ وہاں نظر رکھے۔ ہم یہ باتیں کر رہے تھے کہ اسے۔ ایس مائی بشنر تھوڑی کانسٹیبل اور چار کانسٹیبل آ گئے۔ میں نے ان تینوں کو لے۔ ایس مائی کے ساتھ تھانے بھیج دیا تھا۔ مجھے آج بھی انہوں کو بتانا ہے کہ میں نے تین مسلمان عورتیں ایک ہندو کے حوالے کر دی تھیں۔ وہ باہر نہیں نکل رہی تھیں۔ انہیں گھسیٹنا پڑا اور دھکیل دھکیل کر تانگے میں بٹھا پڑا۔ ہڈیاں کانسٹیبل کو نکل کے گھر کا پتا بتا کر بھیجا کہ اسے لے آئے۔ باقی کانسٹیبلوں کو ریلوے اسٹیشن اور لاریل کے آڈے پر بھیج دیا۔ نگر ہندی کے جو انتظامات کرتے تھے، کیے اور میں عابد کے گھر بیٹھا رہا۔

تجمل کی تلاش

عابد کے ساتھ باہر ہوتی رہیں۔ مجھے تجمل کا انتظار وہیں کرنا تھا اور مجھے موت اور جواب کی توقع تھی کہ تجمل گھر نہیں ہے۔ یہ احساس میرے اندر پہنچتا ہوتا جا رہا تھا کہ بچی کا گمشدگی میں تجمل بھی شامل ہے۔ آخر یہی جواب آیا کہ تجمل گھر سے دوپہر کے بعد گیا تھا۔ ”تک واپس نہیں آیا۔ اسے خامہ نے بلا لیا تھا اور وہیں رہتا تھا۔ میں خود وہاں چلا گیا۔ رات کا وقت تھا۔ خامہ کا دروازہ خامہ کے خاندان نے کھولا۔ ادھیڑ عمر آدمی تھا مجھے دیکھ کر گھبرا گیا۔ مجھے اندازہ نہیں تھا کہ اس سے پوچھا۔“ ”جب تجمل گھر سے نکلا تھا اس وقت آپ گھر میں تھے؟“ وہ گھر نہیں تھا۔ میں نے کہا۔ ”آپ کی بوی گھر میں ہوگی۔ اسے بلاؤ

اور اس کی ماں نے خود غائب کیا ہے۔ انہیں گرفتار کر دیا گیا ہے۔ اگر آپ سچی کے متعلق کچھ جانتے ہیں تو صاف صاف بتائیں۔ آپ محفوظ رہیں گے۔ اگر مجھے تحقیقات میں پتہ چلا کہ آپ کا بھی اس میں ہاتھ ہے تو پھر سزا سے نہیں بچ سکیں گے۔ یہ سوچ لیجئے کہ آپ کو وہ بننا چاہتے ہیں یا ملزم۔ اپنی قسمت کا فیصلہ آپ کے اپنے ہاتھ میں ہے۔ بہت سی جرح کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا کہ ان لوگوں کا اس جرم کے ساتھ کوئی تعلق نہیں۔ میں نے ان سے پوچھا کہ کیا وہ تجمل کو جو جہزی وہ گھر آئے تھے انے لاسکتے ہیں؟ خالہ کا خاندان ایسی ضمانت پر آمادہ نہ ہوا۔ اس نے کہا کہ ہم اسے ہتھکڑیاں تو لگا نہیں سکتے۔ تھانے کا نام سن کر جھاگ جائے گا۔ میں نے کانسیٹیل کو اس محلے میں چھوڑ دیا اور تھانے چلا گیا۔ تینوں عورتیں حواست میں بیٹھی تھیں۔ انہیں کہا کہ وہ اتنا بوجھ کرنا چاہتی ہیں یا میں خود شہادت اور ثبوت دیتا کر دل۔ ان کے دماغ ابھی تک ٹھکانے نہیں آئے تھے۔ ابھی تک انہیں امید تھی کہ وہ مجھے الٹ بنا لیں گی۔

میں نے اتنا بوجھ پر زیادہ زور نہ دیا اور نوکرانی کے خاندان کو بلایا۔ اسے میں نے پہلے ہی تھانے بھجوا دیا تھا۔ اسے کہا کہ وہ اچھی طرح یاد کر لے کہ اس کی بیوی سچی کو کب اور کتنے بجے گھر لائی تھی، پھر اس کی پرورش کس طرح ہوتی رہی اور سچی کو کب اور کتنے بجے لے کر گئی۔ اس کے لیے میں نے دفنی اور چائے کا بندوبست کر دیا اور خود اپنے کوارٹر میں چلا گیا۔ جسم اور دماغ کا بڑا حال ہو گیا تھا۔ میں نے تینوں عورتوں کے کھانے پینے کا کوئی انتظام نہ کیا۔ میں انہیں بھوکا رکھنا چاہتا تھا اور اسی رات کے بعد ان سے بیان لینے کا فیصلہ کیا تھا۔ انہیں حوالہ میں بند کر دیا۔

پانی گرم کر کے میں نہایا اور کھانا کھایا۔ میری بیوی اس قسم کی وارداتوں میں بہت

کہ جب نوکرانی بیواں آئی تھی، اس وقت تجمل کہاں تھا۔ اگر تمہیں یاد نہ ہو تو میں تمہیں یاد دلاتا ہوں۔ تجمل کسی کمرے میں ہو گا اور نوکرانی کی آواز سن کر باہر نکل آیا ہو گا۔ تم نے شاید دیکھا نہ ہو۔ نوکرانی نے اسے آنکھ سے کوئی اشارہ کیا ہو گا اور نوکرانی کے جانے کے فوراً بعد نکل گیا ہو گا۔ میں نے بات ختم کی تو خالہ کا خاندان بول پڑا۔ اس نے اپنی بیوی سے کہا۔ ”داروغہ جی جو پوچھتے ہیں وہ سولو آئے سچ بتانا ورنہ اس بدکار کے ساتھ خود بھی ذلیل ہوگی اور مجھے بھی ذلیل کرادگی۔“

خالہ بہت ڈری ہوئی تھی۔ اس نے کہا۔ ”میں نے کوئی اشارہ نہیں دیکھا۔ یہ ضرور دیکھا تھا کہ نوکرانی باہر گئی تو تجمل بھی باہر نکل گیا تھا۔ ابھی تک واپس نہیں آیا۔“ میں نے خالہ کے خاندان سے پوچھا۔ ”آپ نے تجمل کو بدکار کیوں کہا تھا؟ وہ کیا کرتا ہے؟“

”آوارہ ہے۔“ اس نے جواب دیا۔ ”اسے ہم نے پالا ہے۔ بڑی اچھی تربیت دی تھی۔ جوان ہوا تو فرزانہ کے ساتھ لگ گیا۔ اس لوگ نے اسے پیسے دے دے کر خواب کر دیا ہے۔ فرزانہ کے ماں باپ کے گھر میں شرم تو ہے ہی نہیں۔ فرزانہ کی شادی ہوئی تو تجمل نے وہاں جانا شروع کر دیا۔ دو روز نہ جانے تو یہی نوکرانی کسی بہانے آتی ہے، بات میری بیوی سے کرتی ہے اور تجمل سمجھ جاتا ہے کہ اسے فرزانہ نے بلایا ہے۔ لوگلا کے ساتھ ہی وہ نکل جاتا ہے۔ لوگلا ہمارے ہاتھ سے نکل گیا ہے۔ خاندان کی آدمی کہہ تو رہے ہیں کہ وہ دیتی ہے۔ وہ جو کچھ پہنتا ہے وہ میں تو خواب میں بھی اسے پہنا سکتا۔“

”آپ کو معلوم ہے کہ فرزانہ کی بچی گم ہو گئی ہے؟“ میں نے اسے کہا۔ ”بچی کو فرزا

میرا انداز دوستانہ تھا۔ میں بہت خوش تھا کہ میری تفتیش ختم ہو گئی تھی۔ کھانا آ گیا۔ تھیل نے کھایا اور پھر اسے چلے پلائی۔ میں نے اس سے سچی کے متعلق کچھ بھی نہ پوچھا۔ اس نے بڑی لمبی آہ بھری اور اس کے ساتھ ہی اس کے آنسو نکل آئے۔ پھر وہ مسکرایا اور بولا۔ ”میری زندگی یہی تھی۔ نہ ماں کا پیار ملا نہ باپ کا۔ نہ کوئی بہن دیکھی نہ کوئی بھائی دیکھا اور جوان ہوئے تو جیل خانے کا دروازہ کھل گیا۔“ اس نے مجھ سے پوچھا۔ ”مجھے کتنی سزا ملے گی؟“

”یہ تمہاری بات سن کر بتا دوں گا۔“ میں نے کہا۔ اگر تم نے میرا مسئلہ حل کر دیا تو ہو سکتا ہے میں تمہیں صاف بری کراؤں۔ مگر شرط یہ ہے کہ کوئی بات چھپانے کی کوشش نہ کرنا۔“ اس نے پوچھا کہ وہ صرت اس سچی کی کشدگی کے متعلق بتائے یا اپنے متعلق بھی کچھ بتائے۔ میں نے اسے کہا۔ ”تمہارے دل میں جو کچھ ہے وہ میرے آگے رکھ دو مجھے اپنا دوست اور اپنا بھائی سمجھو۔“

پاپی کا پیار

اس نے اپنے بچپن سے بات شروع کی اور اُس رات پر آ کر ختم کی جب وہ مجرم کی حیثیت سے ایک تھانیدار کی حراست میں بیٹھا تھا۔ منتظر یہ کہ اسے باپ کی توجہ یاد ہی نہیں کہ کیسا تھا۔ ماں کا دھندلا سا تصور اس کے ذہن میں محفوظ تھا۔ وہ اُس وقت تین سال کا تھا جب اس کی ماں مر گئی تھی۔ باپ پہلے ہی مر چکا تھا۔ وہ دونوں نوجوانی میں مر گئے تھے۔ تھیل کو خالہ نے سنبھال دیا لیکن تھیل کی باتوں سے معلوم ہوتا تھا کہ خالہ نے اسے پیار سے نہیں بلکہ برادری میں ناگ رکھنے کی خاطر اسے گودی دیا تھا۔ تھیل نے

دلچسپی لیا کرتی تھی۔ میں یہ وارنٹ اسے سنانے بیٹھ گیا اور رات کے گیارہ بج گئے۔ میں نے ڈیوٹی کا نیشنل سے کہا تھا کہ مجھے رات دو بجے جگا دے۔ میں اس وقت ان جوتوں سے تفتیش کرنا چاہتا تھا۔ میں سو گیا۔ میری بیوی نے مجھے جگایا۔ کہنے لگی کہ نیشنل آیا ہے۔ میں سمجھا دو بج گئے ہیں۔ گھڑی دیکھی۔ بارہ بج کر چالیس منٹ ہوئے تھے۔ کوئی اور بات تھی۔ مجھے کوفت ہوئی کہ کوئی اور کیس آ گیا ہے۔ باہر نکلا تو نیشنل نے کہا۔ ”بچی آگئی ہے۔“ میں سمجھا، شاید خواب دیکھ رہا ہوں۔ نیشنل نے یہ کہہ کر مجھے پوری طرح بیدار کر دیا کہ مشرق اور جنوبی اسٹیک ایک لڑکے کو پکڑ لائے ہیں، بچی اس کے پاس ہے۔ مشرق اور جنوبی میرے کانٹیل تھے۔

میں کمبل لپیٹ کر اپنے دفتر میں گیا وہاں تھیل پنج پر بیٹھا تھا۔ اس نے سچی کو سینے سے لگا رکھا تھا۔ بچی چھوٹے سے کمبل میں لپیٹی ہوئی تھی اور سوئی ہوئی تھی۔ مجھے دیکھ کر تھیل اٹھا۔ سردی سے اس کے ہونٹ نیلے ہو گئے تھے۔ گرم کپڑوں میں بھی وہ کانپ رہا تھا۔ میں نے آگیتھی جلانے کو کہا۔ تھیل نے بڑے رحم طلب لہجے میں کہا۔ ”میں ساری بات بتا دوں گا۔ مجھے کھانا کھلا دیں۔ جھوک اور سردی سے مر رہا ہوں۔“ میں نے اسے کہا۔ ”اٹھو۔“ اور اسے اپنے کوارٹر میں لے گیا۔

بچی کو لیٹر میں ڈال دیا۔ وہ فوراً جاگ اٹھی اور جھوک سے رونے لگی۔ اس کے کمبل میں دودھ کی بوتل لیٹی ہوئی تھی، بوتل خالی تھی۔ میری بیوی نے بوتل میں دودھ ڈال کر اسے پلانا شروع کر دیا۔ میں نے بیوی سے کہا کہ سامان اور روٹیاں بھی ہوئی ہیں، وہ گرم گرم کر دے اور چائے بنا دے۔ تھیل کو میں نے رضائی میں بٹھا دیا اور اس کے دل سے پولیس اور جرم کا بوجھ اور غوت اتارنے کے لیے میں نے گپ شپ شروع کر دی۔

ماں کو بھی بھول گیا۔ اب وہ اپنے گھر مرٹ سونے کے لیے جاتا تھا۔

فرزانہ کی ماں بچی پاپن تھی۔ وہ جنسی عیاشی میں ڈوبی ہوئی تھی اور اس پر جائزہ لانا سخت سوار تھا۔ یہ ہاتھیں تجمل کو جھانک کر معلوم ہوئیں۔ بچپن اور لڑکپن میں فرزانہ اور اس کی ماں اس کے لیے پرہیز تھیں۔ "جیسی ماں ایسی بیٹی" بالکل صحیح مقولہ ہے۔ تیرہ سال کی عمر میں فرزانہ نے تجمل کو اپنے ساتھ جنسی لذت سے آشنا کر دیا۔ تجمل نے اسے بھی پیلا سمجھا اور اس کے بعد فرزانہ کو جب کبھی تنہائی ملتی تجمل کو بلا لیتی اور اس کے ساتھ میاں بیوی کا کھیل کھیلتی۔ تجمل نے میٹرک پاس کر لیا۔ فرزانہ مرٹ آٹھ جماعتیں پڑھ سکی تھی۔ تجمل غیر معمولی طور پر خوبصورت نکلا۔ خالو اسے اپنے کاروبار میں لگانا چاہتا تھا جو تجمل کو پسند نہیں تھا۔ اس پر دونوں میں گرامر می ہوتی رہتی تھی۔ تجمل کو اب ان کی لٹائیاں محسوس نہیں ہوتی تھیں۔ فرزانہ اسے پیسے دیتی رہتی تھی اور ماں سے کہہ کر اسے ہر عید پر نئے کپڑے بھی سلوا دیتی تھی۔ فرزانہ کی ماں کے پاس پیسے کی کمی نہیں تھی۔ اب تجمل اچھا لڑا سمجھنے لگا تھا۔ مگر وہ یہ نہ سمجھ سکا کہ بیکاری کو پیار نہیں کہتے۔ وہ یہ ضرور سمجھ گیا کہ فرزانہ کی ماں اچھے چال چین کی عورت نہیں بلکہ اس کے لیے وہ بہت اچھی تھی۔ تجمل کی عمر بیس سال ہو گئی تو ایک روز فرزانہ نے اسے یہ خبر سنائی کہ اس کی شادی ہو رہی ہے۔ تجمل کو بہت رنج ہوا۔ وہ تو یہ امید لگائے بیٹھا تھا کہ اس کے ہاں فرزانہ کی اور کہیں شادی ہو ہی نہیں سکتی اس نے فرزانہ سے شکایت کی تو فرزانہ نے اسے کہا۔ "شادی کا یہ مطلب خنڈ ہے ہی ہے کہ ہمارا تعلق ٹوٹ جائے گا۔ وہ تو نام کا خاندان ہو گا۔ میرے اصلی خاندان تو تم ہو گے۔" تجمل کی تسلی نہ ہوئی۔ فرزانہ نے اسے اصل فقہ ان الفاظ میں سمجھایا۔ "میری جن آدمی کے ساتھ شادی ہو رہی ہے وہ مجھ سے سولہ

جب ہوش سنبھالا تو خالہ کے دو بچوں نے اسے اپنا ذکر بنالیا۔ خالہ اور خالو کا رویہ بھی کچھ ایسا ہی تھا جس سے تجمل کے دل میں تیزی کا احساس شدید ہو گیا۔ اسے اس گھر سے روٹی کھانا ملتا اور رات کو سونے کے لیے بستر مل جاتا تھا۔ خالہ کے بچے اس سے کچھ بڑے تھے۔ وہ لے بیٹ بھی ڈالتے تھے اور اس کی شکایت پر خالہ انہیں کچھ بھی نہیں کہتی تھی۔ اس زمانے میں سکول جانے والے بچے کو گھر سے ایک پیسہ ملا کرتا تھا جو آج کے آٹھ آنے کے برابر تھا۔ تجمل سکول داخل ہوا تو اسے پیسہ نہیں ملتا تھا۔ خالہ اس کے سامنے اپنے بچوں کو ایک ایک پیسہ دیا کرتی تھی۔ خالو کے دل میں تو تجمل کے لیے کوئی جگہ ہی نہیں تھی۔ وہ بچہ سے جب بھی ہوتا ڈانٹا پڑٹ کے لہجے میں ہوتا تھا۔ تجمل اکیلے اکیلے رویا کرتا تھا۔ اسے مرٹ پیار کی ضرورت تھی جو اسے کہیں سے بھی نہ ملا۔

تجمل نے مجھے بچپن کے بہت سے واقعات سنائے جو خالہ کے گھر کے ظلم کو ظاہر کرتے تھے۔ اسے وہ ہر ایک موقع پر یاد تھا جب خالو یا اس کے بچوں نے پٹیا تھا۔ وہ خواہ میں مرٹ ماں کو دیکھتا رہا۔ اس نے کہا۔ "میں بھوکا اور ننگا رہ سکتا تھا۔ ان پر پھر گناہ تھا مگر پیار کے بغیر میں زندہ نہیں رہ سکتا تھا۔ مجھے ماں یاد آتی تھی تو میں گھر دور جا کر رویا کرتا تھا۔" دس سال کی عمر میں اسے پیار مل گیا۔ یہ فرزانہ سے ملا۔ اور فرزانہ کی عمر میں مختصر سے دنوں کا ہی فرق تھا۔ تجمل خوبصورت لڑکا تھا۔ فرزانہ اس سے دوستی ہو گئی۔ وہ کبھی کبھی تجمل کو ایک یا دو پیسے دیتی اور گھر میں کھانا یا چھیل فروٹ آئے تو وہ بھی اسے لادیتی تھی۔ فرزانہ اس کی دوسری خالہ بیٹی تھی۔ فرزانہ کی ماں کو بھی یہ بچہ اچھا لگا۔ اس نے تجمل سے کہا کہ اگر فرزانہ کے کھیلنا کرو۔ یہ پیار کی پہلی مہر تھی جو تجمل کی زندگی میں آئی۔ وہ سارے دکھ بچہ

ایک روز فرزانہ کی ماں نے یہ سلیم بنائی کہ بچی کو غائب کر دیا جائے اور الزام جمیلہ پر عائد کیا جائے۔ ان سب میں ایسا قابل دماغ کوئی بھی نہیں تھا جو اس سکیم کے تمام پہلوؤں کے خطروں اور مشکلات پر غور کرتا۔ ان کے دماغوں پر جائیداد، لالچ اور جمیلہ کے خلاف حسد سوار تھا۔ جرم تو کسی بھی وقت کیا جاسکتا ہے لیکن جرم کو چھپانے رکھنا اور پولیس کو گمراہ کرنا ہر کسی کے بس کا رنگ نہیں۔ یہ مرن تجربہ کار جرائم پیشہ لوگوں کا ہی کام ہے اور اس نوعیت کا جرم جو کسی دوسرے کو چھپانے یا اس سے کوئی پیچیدہ مقصد حاصل کرنے کے لیے کیا جاتا ہے فرزانہ یا اس کی ماں جیسے دماغ سے مکمل نہیں ہو سکتا۔ ان لوگوں نے ایسی ہی نوعیت کے جرم کی سکیم بنائی اور سمجھ بیٹھے کہ بس کام ہو گیا۔ بچی کو چھپائے رکھنے کی ذمہ داری نوکرانی نے لے لی۔ اس کا معاونہ اس نے پانچ سو روپیہ لیا۔ اس نے یہ یقین بھی دلایا کہ وہ اپنی آبادی کے کسی آدمی کو ساتھ ملا کر بچی جمیلہ کے گھر رکھ آئے گی۔ یہ عورتیں بچی کو جان سے مارنے اور لاش جمیلہ کے دروازے کے سامنے یا کسی اور جگہ رکھ دینے کے لیے بھی تیار ہو گئیں۔ تجمل نے یہ ڈیوٹی اپنے دوتے لے لی کہ بجائے اس کے کہ کسی باہر کے آدمی کو اس کام میں شریک کیا جائے بچی کو جمیلہ کے گھر رکھنے کا کام وہ خود کرے گا۔

میں نے جب یہ سکیم سنی تو مجھے بہت ہنسی آئی۔ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا کہ سکیم کا سیلاب ہوجاتی۔ تجمل نے یہ پیشورہ دیا تھا کہ بچی کو ہنگا ساز ہر دے کہ جمیلہ کے گھر رکھ دیا جائے گا۔ اس سے یہ ہو گا کہ انہیں جب پتہ چلے گا کہ بچی ڈیوٹی میں یا چھت پڑی ہوئی ہے تو وہ اسے ضرور اٹھائیں گے اور لوگوں کو اور پولیس کو بتائیں گے۔

سترہ سال بڑا ہے۔ وہ اولاد کے لیے دوسری شادی کرنا چاہتا ہے۔ اچھی تہ پوری جاسوسی کر لی ہے۔ یہ آدمی اولاد پیدا نہیں کر سکتا۔ اس کی بہت ساری جائیداد ہے اور اس کے پاس پیسہ بھی بہت ہے۔ میں اسے اولاد دلانے کی اور اس کی ساری جائیداد اپنے نام لکھوا دوں گی۔ اس کا پیسہ اپنے قبضے میں کر دوں گی۔ اولاد تمہاری ہوگی اور تمہیں بہت عیش کراؤں گی۔“

میرے شریف النفس دوستوں کو فرزانہ کی بات بڑی عجیب لگے گی لیکن یہ دیکھئے کہ اس نے کس ماں سے تربیت حاصل کی تھی۔ اس کے دماغ میں ماں نے مرن دو چیزیں ڈالی تھیں۔ جنس اور جائیداد۔ بیٹی کو اس نے مزید جائیداد حاصل کرنے کے لیے تیار کر دیا تھا۔ خود تو بڑی ہی بروکھی تھی۔ تجمل کو گناہ میں پیار ملا تھا۔ اس لیے اسے فرزانہ کی بات کوئی ایسی بُری نہ لگی کہ اس سے روٹھ جاتا۔ فرزانہ کی شادی عابد کے ساتھ ہو گئی۔ تجمل عابد کی غیر حاضری میں فرزانہ سے ملتا رہا۔ نوکرانی کو فرزانہ نے روپے پیسے اور اچھے اچھے کپڑوں سے مٹھی میں لے لیا۔ اس کے نتیجے میں یہ بچی پیدا ہوئی۔ فرزانہ اور اس کی ماں عابد کو اپنے حال میں بچانے کی کوشش کرتی رہتی تھیں تاکہ وہ فرزانہ کے نام اپنی جائیداد لکھ دے مگر ایک روز پتہ چلا کہ عابد نے آدمی سے زیادہ جائیداد اپنی پہلی بیوی جمیلہ کے نام رجسٹری کر دی ہے۔ اب فرزانہ اور اس کی ماں عابد کو جمیلہ کے خلاف گمراہ کرنے کی ترکیبیں سوچنے لگیں۔ انہوں نے ایک طریقہ یہ بھی سوچا کہ جمیلہ کبھی عابد کے گھر آئے، فرزانہ اور اس کی ماں اُدھر اُدھر ہو جائیں، تجمل کو بلایا جائے اور وہ جمیلہ کے ساتھ زبردستی کرے یا اسے اپنے ساتھ درغللے اور اگر ایسا ہو جائے تو اسے موقع پر پکڑا جائے۔ مگر یہ سکیم بن سکی

درج کرا دی۔ تجمل نے میری تفتیش اور سرگزشتی کے متعلق کہا۔ ”ہم سمجھتے تھے پولیس والے جاوے گا تو نہیں ہوتے، ہم انہیں گمراہ کر لیں گے لیکن آپ نے اگر ہم سب کو گمراہ کر دیا۔ آپ نے اتنی تیزی سے ہمارے سارے راستے بند کر دیئے کہ ہم سب چلا گئے۔ اُس وقت ہم نے محسوس کیا کہ بچی کو جیل کے گھر کھانا کسی صورت ممکن نہیں۔ فرزانہ اور اس کی ماں سخت پریشان رہنے لگیں۔ انہوں نے آپ کو رشوت دینے کا بھی فیصلہ کیا۔ مجھے معلوم نہیں کہ انہوں نے آپ کو رشوت پیش کی تھی یا نہیں۔ آج دوپہر کے وقت میں اپنے گھر تھا۔ نوکرائی آئی۔ اس نے میری خار سے کوئی بات کی۔ ہم نے اشارے مقرر کیے ہوئے تھے۔ میں کمرے سے باہر آیا۔ اس نے میری طرف خاص انداز سے دیکھا میں اشارہ سمجھ گیا۔ وہ چلی گئی تو میں سمجھا کہ فرزانہ نے بلایا ہوگا لیکن نوکرائی گلی کی ٹکڑ پر کھڑی تھی۔ مجھے سر سے اشارہ کیا تو میں اس کے پیچھے چلا گیا۔ آگے جا کر میں اس کے ساتھ چلا۔ اس نے چلتے چلتے کہا۔ ”پولیس کو پتہ چل گیا ہے۔ تنہا نیکار، فرزانہ اور اس کی ماں کو کہہ رہا ہے کہ بچی تمہارے پاس ہے اسے فوراً نکالو۔ فرزانہ کی ماں نے مجھے کہا ہے کہ تجمل کو ساتھ لے لو اور بچی اس کے حوالے کر کے اسے کہو کہ اسے جیل کے گھر بھیج سکتے ہو تو پھینک آؤ ورنہ ہمارے پاس یا دور کہیں جنگل میں لے جا کر مار دو اور دفن کر دو، میں نے نوکرائی سے کہا کہ ڈرنے کی کوئی وجہ نہیں ذرا حوصلہ کرو۔ اس نے مجھے وہ باتیں سنائیں جو آپ فرزانہ سے کر رہے تھے۔ اس وقت فرزانہ کی ماں اور نوکرائی کمرے کے دروازے کے ساتھ کھڑی آپ کی باتیں سن رہی تھیں۔ میں نے بھی سوچا کہ معاملہ بہت بگڑ گیا ہے۔ اب یہی راستہ ہے کہ بچی آپ کے سامنے رکھ دی جائے یا اسے اس دنیا سے ہی غائب کر دیا جائے۔“

ہلکا زہر اثر کرنے کرنے بچی ان کے ہاتھوں میں مر جائے گی پھر کوئی بھی نہیں مانے گا کہ بچی کوئی اور رکھ گیا ہے۔ سب کہیں گے کہ جیل نے حسد کی وجہ سے بچی کو اغوا کر لیا اور اب زہر دے کر مار دیا ہے لیکن بچی اُس وقت وہاں رکھی جائے گی، جب پولیس بچی کی تلاش شروع کر دے گی۔ بہر حال یہ سیکم پاس ہو گئی۔ تیسرے ہی دن نوکرائی نے جیل کو اپنے محلے کے ایک گھر میں داخل ہونا دیکھا تو فرزانہ کو بتایا۔ فرزانہ کی ماں وہیں تھی۔ اس نے کہا کہ یہ موقع اچھا ہے محلے کا ایک گھر تو یہ گواہی دے گا کہ جیل یہاں آئی تھی۔ چنانچہ نوکرائی کو اُسی وقت بچی دے دی گئی۔ بچی کا ایک ہی گدا تھا۔ یہ گدا، دودھ کی بوتل، اس کے کپڑے وغیرہ اکٹھے کر کے نوکرائی نے بچی اور ان کپڑوں وغیرہ کو ایک لحاف میں رکھا اور پیٹ کر لے گئی۔ بچی سوئی ہوئی تھی۔ باہر کسی کو شک نہ ہوا کہ لحاف میں بچی لے جاتی جا رہی ہے۔ اپنے خاوند کو جو دے کی بیماری کی وجہ سے اس غلام تھا، اس نے یہ بتایا کہ یہ بچی وہ پالنے کے لیے لائی ہے۔ اس کے ساتھ ہی اس نے خاوند کو سختی سے کہا کہ کسی کو پتہ نہ چلے دے کہ اس گھر میں بچی ہے نوکرائی کو یقین تھا کہ آج پولیس کو رپورٹ کر دی جائے گی اور کل صبح بچی کی تلاش شروع ہو جائے گی۔ الزام جیل پر عائد کر دیا جائے گا اور اس سے اگلے دن بچی زندہ یا مردہ جیل کے گھر رکھ دی جائے گی۔ ہنلا بچی کو چار دن چھپائے رکھا کوئی مشکلی نہ ہو

پیار کا صلہ

بچی کو غائب کر دیا گیا۔ عابد کو اطلاع دی گئی۔ اس نے تنہا میں پو

تجمل ایک جگہ چھپ گیا۔ نوکرانی اپنے گھر گئی اور بچی کو اٹھالائی۔ اس نے یہ عقلمندی کی کہ بچی کے لیے دودھ کی بوتل بھی بھر کر لے آئی تاکہ بچی جتنی دیر تجمل کے پاس رہے روئے نہیں اور دودھ پی کر سو جائے۔ تجمل نے بچی لے لی۔ دودھ کی بوتل چھپالی۔ وہ شہر کے اُس حصے کی طرف چلا گیا جہاں اسے کوئی پہچانتا نہیں تھا۔ تین ماہ کی بچی کو اٹھائے اٹھائے پھر ناکوئی ایسی حرکت نہیں کر سکی کہ شک کر دے۔ اس جسم کی سکیم میں یہ مشورہ تجمل نے ہی دیا تھا کہ وہ بچی کو جیلہ کے گھر چھوڑ آئے گا لیکن بچی اس کے پاس آئی تو وہ سوچ بھی نہ سکا کہ وہ دلیری کا یہ کا نامہ کر سکتا ہے۔ اس نے یہ بھی سوچا کہ بچی کو فرزانہ کے حوالے کر دے لیکن اس کے دل میں فرزانہ کی محبت جاگ اٹھی اور اس کے ساتھ ہی یہ طرہ کر گیا تھا۔ وہ یہ کہ فرزانہ کے گھر تھا نیلا بیٹھا ہوا ہے۔ وہ چلا گیا۔ اب سناٹ کا ایک ہی طریقہ رہ گیا تھا۔ وہ یہ کہ اندھیرا ہو جائے تو بچی کو شہر سے دور لے جائے اور اسے مار کر دفن کر دے یا نہر میں پھینک دے۔ میں جس وقت فرزانہ کے گھر جا کر اسے، اس کی ماں اور نوکرانی کو حراست میں لے چکا تھا اور ایک آدمی کو اپنے لئے لے آئی اور کانٹینا بول کو بلانے کے لیے بھیج دیا تھا، اس وقت تجمل بچی کو اٹھا شہر سے باہر چلا گیا تھا۔

میں نے سروس کے دوران ہزار ہا ملازموں اور گاہکوں کے بیان لیے ہیں۔ اکثر یہ ہوتا ہے کہ ایک واردات کا مقدمہ ختم ہوتے ہی اس کے تمام تر بیانات ذہن سے اڑ جاتے ہیں۔ پھر دوسری واردات کے بیانات سامنے آ جاتے ہیں۔ ریٹائرڈ پولیس آفیسر کو تو بہت سے ملازموں اور گاہکوں کی شکایں بھول جاتی ہیں، ان کے بیان کہاں یاد رہتے ہیں لیکن کچھ ملازم ایسے میرے سامنے آئے ہیں جن کے اقوالی بیانات کو میں سارے

یاد رکھوں گا۔ شاید اس لیے کہ میں جذباتی انسان ہوں۔ بات جو جذبات کو ہلاتی ہے ہمیشہ کے لیے ذہن پر نقش ہو جاتی ہے۔ تجمل کا اقوالی بیان اسی زمرے میں آتا ہے۔ اس کے الفاظ آج بھی مجھے یاد ہیں۔ میں اس کا بیان مختصر کر کے پیش کرتا ہوں:

”اب میرے ذہن میں یہ کام تھا کہ میں بچی کا کلا گھونٹ دوں اور اسے کہیں دفن کر دوں یا زندہ ہی نہر میں پھینک دوں۔ میں شہر سے دور نکل گیا تھا۔ وہاں دیکھنے والا لڑکا نہ تھا۔ اچانک بچی نے رونا شروع کر دیا۔ میں نے دودھ کی بوتل اس کے منہ سے لگادی اور وہ چپ ہو کر پینے لگی۔ میں ایک جگہ بیٹھ گیا۔ بچی دودھ پی رہی تھی اور میں سوچ رہا تھا کہ اسے کس طرح ختم کر دوں۔ اتنے میں بچی نے دودھ پی لیا۔ میں نے بوتل اٹھالی۔ سر دی پریشان کرنے لگی۔ میں نہر کے کنارے پہنچ گیا۔ میں یہ ارادہ لے کر گیا تھا کہ بچی کو فوراً نہر میں پھینک دوں گا لیکن وہاں جا کر میرے دل پر خوف طاری ہو گیا۔ میرا ایک ہاتھ بچی کے منہ کی طرف چلا گیا۔ بچی کے ہاتھ کھیل سے باہر تھے۔ اس نے میری ایک انگلی دونوں انگوٹھوں سے پکڑ لی اور منہ میں لے کر چوستے لگی۔۔۔۔

”اچانک میری آنکھوں کے سامنے میری ماں کی تصویر آ گئی۔ ایسے لگا جیسے اندھیرے میں مجھے اپنی ماں نظر آ رہی ہے اور اس کے ساتھ ہی میرے اندر ایک پیاس سی پیدا ہو گئی۔ ایسی پیاس جو پانی سے نہیں بجھتی۔ میں نے اپنے آپ سے کہا، تجمل، اس دنیا میں نیڑا کون ہے؟۔ کوئی بھی نہیں، کوئی بھی نہیں جس کی نگاہوں میں میرے آپ کاخون ہو۔ کوئی بھی نہیں جو میری ماں کے پیٹ سے پیدا ہوا ہو۔ پس وہیں بیٹھ گیا۔ بچی کے چھوٹے چھوٹے ہاتھ جو کھیل سے باہر تھے کھیل میں کر دیئے۔ بہت ٹھنڈ تھی میں نے بچی کو سینے سے لگا کر اپنا منہ اس کے منہ کے ساتھ لگا دیا۔ میرے دل سے آواز اٹھی کہ

ہیں۔ انہیں میں نے یہاں آکر حوالات میں دیکھا ہے۔ میں برآمدے میں داخل ہوا تو کوڑائی حوالت کی سلاخوں کے ساتھ بیٹھی ہوئی تھی۔ اس نے دوسروں کو بتایا تو وہ بھی اس کے پاس کھڑی ہو گئیں۔ انہیں حوالات میں بند دیکھ کر مجھے بہت خوشی ہوئی۔

تجمل بھی آکر اٹھائے برستے واپس آکر ہاتھ دے اٹھا۔ وہ اُس راستے سے شہر میں داخل ہوا، جہاں میرے دو کانسیبل مشرت اور سوہنرا سنگھ ڈیوٹی پر تھے۔ انہوں نے اسے روکا اور بچی کو دیکھ کر پوچھا کہ وہ کون ہے اور کہاں جا رہا ہے؟ اس نے بتا دیا کہ وہ بچی کو کھانے میں پیش کرنے کے لیے جا رہا ہے۔ کانسیبلوں کو پتہ چل گیا کہ انہیں اسی بچی کے لیے یہاں ڈیوٹی رکھ کر لایا گیا ہے۔ وہ تجمل کو کھانے میں لے آئے۔

میں تجمل کی مدد کرنا چاہتا تھا۔ اس نے میرے جذبات کو ہلادیا تھا۔ مدد کی یہی ایک صورت تھی کہ اسے وعدہ معاف گواہ بنالوں۔ یہ اس صورت میں ممکن تھا کہ یہ تین عورتیں اقبال جرم نہ کریں میں نے بہت غور کیا کہ ان کے اقبال جرم کے بغیر میں استغناء مضبوط بنا سکتا ہوں یا نہیں۔ ملزم کو پکڑ لینا تو اتنا مشکل نہیں ہوتا، عدالت میں اسے جرم ثابت کرنا مشکل ہوتا ہے۔

میں نے تجمل کو حوالات کے دوسرے کمرے میں بند کر دیا اور بچی کو اپنی بیوی کی تحویل میں رہنے دیا۔ صبح کے وقت دفتر میں بیٹھا اور کیس سنانے رکھ کر قانون کے تقاضوں کے مطابق شہادت اور ثبوت کا جائزہ لیا۔ فرزانہ، اس کی ماں اور کوڑائی کو میں نے بالکل نہیں کہا کہ وہ اقبال جرم کریں۔ ان سے بیان لینے کا تو وہ ابھی تک کہہ رہی تھیں کہ یہ جبریہ کی کارروائی ہے۔ میں نے اسی روز ان کا اور تجمل کا ریمانڈ لے لیا۔ پھر ضروری عدالتی کارروائی کر کے تجمل کو وعدہ معاف گواہ منظور کرا لیا۔ بچی کو عدالت میں پیش کر کے کھانے

پر میرا خون ہے۔ یہ میرے پیار کی نشانی ہے۔ یہ میری سچی ہے۔ میں اپنے پیار پر اپنے ہاتھوں نہیں ماروں گا۔ اُس وقت اس ساری دنیا کا ہر ایک انسان مجھے دھوکہ اور فریب نظر آیا۔ فرزانہ سے مجھے نفرت ہو گئی۔ مجھے پہلی بار یہ احساس ہوا کہ میں جسے پیار سمجھتا رہا وہ گناہ تھا۔ فرزانہ کو میں اس لیے اچھا لگتا تھا کہ کھانے مجھے ایسی اچھی شکل و صورت دی تھی، جو فرزانہ کو پسند آگئی تھی اور پھر میں اسے اس لیے اچھا لگتا تھا کہ اس کے نیلے گناہ کی لذت کا ذریعہ بنتا تھا۔ وہ میرے جسم کے ساتھ کھیلتی رہی۔ پھر اس نے مجھے اتنے بڑے گناہ کا ذریعہ بنایا کہ میں اتنی مصروف بچی کو قتل کرنے پر تیار ہو گیا۔...

”ماں کے بعد اگر میں کسی کو اپنا کھانا کھاتا تو وہ یہ بچی تھی جو میرا اپنا خون تھا۔ میں بچی کو سینے سے لگا کر بہت رویا۔ بہت دیر گال بچی کے گالوں سے رگڑتا رہا اور مجھے ازلطف آج میں نے پہلے کہیں نہیں پایا تھا۔ فرزانہ کا جسم یاد آتا تو مجھے اپنے آپ سے بدبو آنے لگی۔ اسے میرے ساتھ اتنا ہی پیار تھا جتنا بچے کو کھلونے سے ہوتا ہے۔ ایک کھلونا ٹوٹ گیا تو دوسرا آجائے گا۔ اس نے مجھے ایسا کھلونا بنایا کہ بچانسی کے شتخے پر کھڑا کر دیا۔ اس نے عاید کو کھلونا بنایا کہ اس سے جائداد اور دولت ملے گی۔“

”میں نے یہ بھی سوچا کہ بچی کے ساتھ ہر میں کو دو جاصل اور اس دنیا سے آزاد ہو جاؤں۔ لیکن میں بچی کو نہیں مارنا چاہتا تھا۔ یہ ایک گناہ کی پیداوار تھی لیکن یہ گناہ میرا تھا اور یہ میرا خون تھا۔ میں نے فیصلہ کیا کہ زندہ رہوں گا اور اسے بھی زندہ رکھوں گا مگر جب حقائق سامنے آئے تو میں گھبر گیا۔ لیکن میرا دلغ صاف ہو چکا تھا۔ میں نے حقیقت کو صاف دل سے دیکھا اور اس فیصلے کو بہتر سمجھا کہ کھانے جانا ہوں اور بچی دیاں رکھ کر ساری بات کہہ سنا ہوں۔ مجھے بالکل علم نہیں تھا کہ آپ ان تینوں کو پکڑا

ایک ماں ایک معصومہ

قاتل کا مرت یہ سراخ ملا کہ لاش کے انخوں میں قاتل کا خون اور گوشت کے دو ذرے تھے۔ بڑی اچھے پلن کی نہیں تھی مگر قاتل ایک معصومہ تھا۔

”پانی کا پیار میں شہر کی ایک آبادی کا ذکر آتا ہے جہاں ایک ملازم نے تین ماہ کی بچی کو اغوا کر کے چھپایا تھا۔ اس واردات کے تقریباً تین ماہ بعد اسی آبادی میں ایک نوجوان لڑکی قتل ہو گئی۔ یہ شہر کے ساتھ ملی ہوئی جھگیوں اور کچے مکانوں کی کئی تھی پاکستان کے بھی شہروں میں ایسی بستیاں موجود ہیں۔ ہندوستان کے اس شہر میں بھی ایک بستی تھی، جو پرے ٹھکانے میں آتی تھی۔ وہاں لوگوں نے خود ہی مٹی کی دیواریں کھڑی کر کے ارد پٹن، تختوں یا سرکنڈوں کی چستیں ڈال لی تھیں۔ بستی پھیلتے پھیلتے ایک سو گھروں تک پہنچ گئی تھی۔ وہاں جھگیوں کو اسے پر بھی مل جاتی تھیں۔

ان جھگیوں اور کچے مکانوں میں محنت مزدوری کرنے والے اور چھوٹی چھوٹی داریاں لے کر رہتے تھے۔ زیادہ تر آبادی مسلمانوں کی تھی۔ جانگلی سکھوں کی بھی تھوڑی سی تعداد تھی اور باقی لاکھ مزدور تھے۔ چھوٹے چھوٹے بوٹلوں اور گھروں میں نوکری کرنے والے لوگ، بھنگی اور چوکیدار اور اسی کلاس کے لوگ یہاں آباد تھے۔ اس بستی میں بڑا بھی چلتا تھا۔ بلا انسٹن شراب اور نسیم کا کاروبار بھی ہوتا تھا۔ ان لوگوں کا آپس میں بہت اتفاق تھا۔

کے علاقے کے ایک معزز فرد کے سپرد کر دی۔

آٹھویں روز تینوں عورتوں کا چالان تین تین دفعات میں عدالت میں پیش کر دیا۔ انہوں نے بڑا ہی قابل ہندو وکیل کیا جس نے میرے استغاثہ کی بنیادیں بھی ہلا دیں لیکن شہادت اور ثبوت ایسے تھے کہ وکیل مار گیا۔ تینوں عورتوں پر تینوں دفعات کے جرم ثابت ہو گئے اور ہر ایک کو مجموعی طور پر پانچ پانچ سال سزائے قید با مشقت سنا گئی۔ انہوں نے اپیل کی۔ وہ بھی مسترد ہو گئی۔ مقدمے کے دوران ہی علیہ جلیلہ کو پلا گھر لے آیا تھا۔ قتل سے قید کے بعد ملاقات نہیں ہوئی۔ عدالت نے بھی اس کو واپس دی تھی۔

بچے کے لگ جھگ گھر آیا کرتا تھا۔ اس رات وہ گھر نہیں آیا۔ جب اس کی بیوی تھانے میں آئی تھی اس وقت تک وہ گھر نہیں آیا تھا۔ یہ غیر معمولی بات تھی۔ ماں رات بھر پریشان ہی۔ صبح سویرے نکلنے سے بہت پہلے جی میں یہ خبر پھیل گئی کہ باہر ایک لڑکی کی لاش پڑی ہے۔ پھر ماں کو اطلاع ملی کہ لاش اس کی بیٹی کی ہے۔

میں اپنے ہیڈ کانسٹیبل اور وائس کانسٹیبلوں کو ساتھ لے کر موقع وار دات پر گیا۔ میرے سامنے ایک لاش زمین پر پڑی ہوئی تھی۔ اس کے اوپر کسی نے چادر ڈال دی تھی۔ چادر ہٹا کر دیکھا۔ وہ نوجوان لڑکی تھی۔ اچھی شکل و صورت والی تھی۔ لاش پیٹھ کے بل تھی۔ منہ اُدھا کھلا ہوا اور آنکھیں پوری کھلی ہوئی تھیں۔ ایک ہاتھ سینے پر اور دوسرا باہر کو زمین پر تھا۔ کانوں میں سونے کی بالیاں تھیں اور شلوار قمیض صحیح حالت میں تھی۔ ظاہری طور پر قتل سے پہلے لڑکی کے ساتھ کوئی زیادتی نہیں ہوئی تھی۔ کانوں کی بالیاں بتا رہی تھیں کہ یہ وار دات مرت قتل کی ہے۔ اس کے پیچھے نیت رہزنی اور آبروریزی کی معلوم نہیں ہوئی تھی۔ بغیر نظری معائنہ کرنے سے معلوم ہوا کہ لڑکی کا گلہ گونا گیا ہے۔ گردن پر نشان صامت تھے۔ نشان رسی کے نہیں تھے۔ چہرے پر کوئی خراش نہیں تھی۔ سر کے بال بکھرے ہوئے نہیں تھے۔ جسم پر جو کپڑے تھے، ان پر کہیں خون کا دھبہ بھی نظر نہ آیا۔ تشدد کا یا قاتل سے مقابلہ کرنے اور جان بچانے کی کوشش کا کوئی نشان نظر نہیں آیا۔ پاؤں کے چپل بھی نہیں اترے تھے۔

جیسا کہ میں اپنی پہلی کہانیوں میں بتا چکا ہوں کہ پولیس کی نظر بہت تیز ہوتی ہے۔ لاش کے ساتھ یا لاش کے ارد گرد گھاس کی ایک خشک پتی، لباس سے گرا ہوا دھاگے کا ذرا سا ٹکڑا، چھوٹا سا بال یا کوئی ایسی چیز جس پر کسی کی نظری نہ جائے، قتل کی کہانی

ان میں کوئی مذہبی تعصب نہیں تھا۔ ایک دوسرے کے جرائم پر پروہ ڈالنے دیکھتے تھے چوری کا مال دہاں غائب ہو جاتا تھا۔ ایک گھر میں چور چل رہا ہو یا شراب کشید کی جا رہی ہو تو پڑوسی چوکیداری کرتے تھے۔ دہاں کے کسی گھر پر پولیس اچانک چھاپے مارے تو کسی کامیاب نہیں ہوتا تھا۔ کچے کچے چھوٹے چھوٹے مکان انکدور کے گچھے کی طرح تھے۔ گلیاں تنگ، پیچ وادار گندی تھیں۔ ارد گرد کوئی اور آبادی نہیں تھی۔ کسی مشکوک آدمی کو بستی کی طرف آتا دیکھ کر دہاں کے بچے کانوں کان ساری بستی کو خبردار کر دیتے تھے۔ دہاں شریف قسم کے لوگ بھی رہتے تھے۔ وہ برماشوٹوں کے ڈر سے ان کے ساتھ تعاون کرتے تھے۔ گواہی کی ضرورت پڑے تو سب ہال جاتے تھے۔ دہاں کوئی وار دات ہو جائے تو پولیس پریشان ہو جاتی تھی۔ یہ لوگ پولیس کی مار پٹ اور بے عزتی کی تو پر واہی نہیں کرتے تھے۔

میری جو فرمائش آئی تو اس بستی میں ایک نوجوان لڑکی قتل ہو گئی۔ اگر یہ وار دات پاکستان کی کسی بستی میں ہوتی تو کاغذوں میں ہی غائب کر دی جاتی۔ گردہ زانہ انگلیزوں کا تھا اور اس کے ساتھ میرا اپنا ایمان بھی لپکا تھا۔ میرے لیے جنگ کی میم اور غریب بچی برا بھلاں پڑھتے۔ مقتول کی ماں دو بڑے سیدوں کے ساتھ درج کرانے آئی۔ ماں نے بیان دیا کہ لڑکی جس کی عمر اٹھارہ انیس سال تھی اور غیر شادی شدہ، شام کے بہت دیر بعد گھر سے یہ کہہ کر نکلی کہ سہیلیوں کے ساتھ باہر جا رہی ہے۔ بہت وقت گزر گیا واپس نہ آئی۔ جن لوگوں کے ساتھ ہر شام باہر جاتی تھی ان سے پوچھا۔ انہوں نے بتایا کہ ان کے ساتھ نہیں گئی۔ بستی سے آگے نکلے غیر آباد علاقہ تھا۔ شام کے بعد لوگ بیاں ذرا گھومنے پھرنے نکل جایا کرتی تھیں۔ اس لیے مقتول کا شام کے بعد گھر سے نکلنا معمولی بات تھی۔

مقتول کا باپ گھر پر نہیں تھا۔ وہ ایک اینگلہ انڈین گھرنے میں باورچی تھا۔ رات دس

کہ اسے مکمل طور پر میٹ کر دیا جائے تاکہ ہم جب مقتولہ افراد کے خون کے نمونے بھیجیں تو لفٹیشن میں مدد ملے۔

خون مقتولہ کا نہیں تھا

اس دوران لڑکی کا باپ بھی آگیا۔ ادھیڑ عمر اور مرعض سا آدمی تھا۔ بیٹی کی لاش دیکھ کر وہ پریشان تو بہت ہوا مگر اس کی آنکھوں میں آنسو نہیں آئے۔ میں نے اس کے ساتھ رسمی سی بات کی تو اس نے آہ بھر کر کہا۔ ”یہ ذات بھی میری قسمت میں لکھی تھی۔ مقتولہ کی مال بین کر رہی تھی۔ میں دونوں کو تھانے لے گیا۔ راستے میں میں یہ سوچتا گیا کہ یہاں میرے خبری کوئی سراغ لگا سکیں گے ورنہ میرے چال میں اس سیتی کا تو کوئی آدمی نہیں پھنسے گا۔ میں مقتولہ کی ماں کو اپنے کمرے میں لے گیا۔ اس سے پوچھا کہ کسی کے ساتھ دشمنی تھی؟ اس نے جواب دیا کہ نہیں۔ لڑکی کے چال چلن کے متعلق پوچھا، تو یہ عورت جھجک گئی۔ اس نے یہ تو کہہ دیا کہ ہاں، اس کا چال چلن اچھا تھا لیکن اس کا انداز بتا رہا تھا کہ وہ سچ نہیں کہہ رہی۔ لڑکی کے متعلق یہ تو پتہ چل چکا تھا کہ اس کی شادی ابھی نہیں ہوئی تھی۔ میں نے پوچھا کہ کہیں رشتہ ناطہ طے ہوا تھا یا نہیں۔ اس نے بتایا کہ ایک جگہ بات چل رہی تھی۔

میں نے مال کو اس انداز سے فارغ کر دیا جیسے اس کے بعد اس سے کچھ نہیں پوچھوں گا۔ اسے باہر بھیج کر مقتولہ کے باپ کو بلایا۔ اس نے بھی اپنی بیٹی کا چال چلن اچھا بتایا لیکن دبی زبان میں۔ رشتے کے متعلق اس نے تفصیل سے بتایا۔ درمیان میں آئے تھے۔ ایک کے ساتھ بات چلی کی تو دوسرے نے دھمکی دے دی۔ لڑکے نے یہ

بیان کر دیا کرتی ہے یا کم از کم لفٹیشن کرنے والوں کو مجھ کے گھر کا راستہ دکھا رہی ہے۔ میں نے پہلے تو لاش کو سر سے پاؤں تک دیکھا۔ مجھے لاش کے بائیں ہاتھ کی دو انگلیوں کے سرول پر ذرا ذرا سا خون لگا ہوا نظر آیا۔ دائیں ہاتھ کی دو انگلیوں کے سرول پر بھی ایسا ہی خون تھا۔ یہ خون مقتولہ کا اپنا نہیں تھا کیونکہ اس کی انگلیاں زخمی نہیں تھیں، نہ جسم پر کوئی زخم تھا۔ لاش کے ناخن بڑھے ہوئے تھے لیکن یہ آج کی طرح فیشن کے طور پر نہیں بڑھائے گئے تھے بلکہ بہت دنوں سے کاٹے نہیں گئے تھے۔ دونوں ہاتھوں کی دو دو انگلیوں کے ناخنوں کے اندر کی طرف ذرا ذرا سی کھال چپکی ہوئی تھی۔ اس سے صاف پتہ چلتا تھا کہ قاتل نے جب مقتولہ کا گلا ہاتھوں سے دبایا تو مقتولہ نے ناخنوں سے قاتل کا چہرہ یا اس کے بازو یا ہاتھ زخمی کر دیئے۔ یہ اس نے اپنے آپ کو بچانے کی کوشش کی ہوگی۔ یہ بڑے کام کا سراغ تھا۔

لاش کے ارد گرد دیکھا۔ پاؤں کے نشان نمائندگیوں کے پاؤں سے اور لاش پر چادر ڈالنے والے کے پاؤں سے ختم ہر چکے تھے۔ دراصل پاؤں کے نشان دیہاتی علاقے میں کام آیا کرتے ہیں۔ پولیس آفیسر کی نگاہ تیز ہو تو مجھ جیسے وارڈاٹ پر اپنا کوئی نہ کوئی نشانی مزور چھوڑ جاتے ہیں۔ اس لاش کے ارد گرد نگاہ دوڑائی تو ایک کوئی نشانی نظر نہ آئی۔ دو قدم دور سیپ کا ایک بٹن پڑا نظر آیا جو قیضوں کو لگایا جاتا ہے۔ ہتھکڑیاں جیسے مگر میں نے بٹن اٹھالیا۔ یہ خاصا پرانا تھا۔

جو کاغذی کارڈائی کرتی تھی وہی مکمل کی اور لاش اٹھا کر اسپتال بھیج دی۔ اس کے ساتھ جو کاغذ بھیجے ان میں لاش کی انگلیوں کے سرول پر خون کے دھبوں اور انگوٹوں کے ساتھ لگے ہوئے گوشت کے ذرے کے متعلق خاص طور پر لکھا۔ خون کے متعلق میں نے کھا

گیا تھا، اسے بھیج کر میں نے مجروح کو بلایا۔ انہیں مزید دی ہدایات دے کر یہ خاص طور پر کہا کہ کسی ایسے آدمی کو تلاش کر دو جس کے چہرے یا بازوؤں پر گہری، لمبی اور نازہ خراشیں ہوں۔ پھر انہیں رخصت کر دیا۔ میں ہسپتال کی طرف چل پڑا۔

میں برآمدے سے نکل رہا تھا کہ میرے ایک بہت پرانے سکھ کانسٹیبل سونہرا سنگھ نے کہا ”چوہدری جی! لوگوں کی جمعیتیں ہیں بڑی ہنگامی پڑتی ہیں۔ ہیرا بھڑا اچھے تھے۔ انہوں نے پولیس کو پریشان نہیں کیا تھا۔ میں اسی لائن پر سوچ رہا تھا۔ سونہرا سنگھ کے مذاق نے میرے دماغ میں شگفتگی پیدا کر دی۔ میں ڈارک کراس کے ساتھ ہنسی مذاق کرنے لگا۔ خود سونہرا سنگھ کی محبت پولیس کے لئے منگنی ثابت ہوئی تھی۔ بارہ سال قبل اس کی محبوبہ کو اس کے رقیب نے قتل کر دیا تھا اور سونہرا سنگھ نے ڈبولٹی کے دوران رات کو جا کر قاتل کو قتل کر دیا تھا اور صاف بری ہو گیا تھا۔ اس کے تھانے نے دستاویزی ثبوت مہیا کر دیا تھا کہ سونہرا سنگھ اس رات ڈبولٹی پر تھا۔

میں جب ہسپتال پہنچا تو اس خون کا معائنہ ہو رہا تھا جس کے دھبے مقتولہ کی انگلیوں کے سروں پر تھے۔ رپورٹ تیار ہوتے مزید تین گھنٹے لگ گئے۔ سوچ غریب ہونے والا تھا جب مجھے رپورٹ ملی۔ رپورٹ میں ڈاکٹروں نے کھانا کھاتہ موت لگا گھونٹنے سے واقع ہوئی ہے۔ گلابا تھوں سے دبا گیا ہے۔ جسم پر نشہ دہا کوئی نشان نہیں اور نہ ہی لڑکی کی آبروریزی کی گئی ہے۔ رپورٹ میں یہ بھی لکھا گیا کہ لڑکی کنواری نہیں تھی۔ انگلیوں والے خون کا گروپ بھی لکھا گیا اور یہ بھی کہ یہ خون مشتعلہ کا نہیں ہے۔ مقتولہ کے خون کا گروپ مختلف تھا۔ گزشتہ کے وہ باریک سے لکھے جو مقتولہ کے ناخنوں میں چھپے ہوئے تھے مقتولہ کے جسم کے نہیں تھے

الفاظ کہتے تھے۔ ”تمہاری لڑکی کی ڈولی نہیں جنازہ اٹھے گا۔“ باپ ڈر تو گیا مگر بات بچی گئی۔ تھوڑے دنوں بعد جن سے بات بچی ہوئی تھی انہوں نے لڑکی کو قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ میں نے پوچھا کہ انہوں نے انکار کیوں کیا تھا تو اس نے جواب دیا کہ انہوں نے وجہ نہیں بتائی، وہ لوگ شاید دوسرے گھرانے کی دھمکی سے ڈر گئے تھے۔ میں نے باپ سے پوچھا کہ وہ رات کہاں تھا۔ اس نے بتایا کہ صاحب کے گھر پر ہو گئی تھی پھر وہیں سو گیا۔ اس نے میرے سوال کا جواب دیتے ہوئے یہ بھی بتایا کہ وہ رات دس بجے کے ادھر ادھر گھر جایا کرتا ہے۔ میں نے اس بات کو خاص طور پر ذہن میں رکھا کہ باپ قتل والی رات گھر نہیں آیا۔

مقتولہ کی ماں اور باپ نے لڑکی کا چال چلن بتاتے وقت جو امانت اختیار کیا تھا، اس سے صاف پتہ چلتا تھا کہ لڑکی اچھے چال چلن کی نہیں تھی۔ کوئی بعید نہیں تھا کہ باپ نے ہی اسے قتل کر دیا ہو۔ یہ شخص شک تھا۔ البتہ میرا یہ شک پختہ ہو رہا تھا کہ لڑکی اپنے آشنا کے رقیب کا شکار ہوئی ہے۔ شہروں کے تہذیب یافتہ اور ادریچے گھرانوں میں مارے ہوئے رقیب فلمی گانے گاتے یا آہیں بھرتے یا غلط لکھتے ہیں مگر جن لوگوں کی بستی میں قتل کی یہ واردات ہوئی تھی وہ اغواء قتل اور خودکشی کے نیچے کوئی اور اقدام نہیں سوچ سکتے۔ اس بستی کے مارے ہوئے رقیب آہیں نہیں بھرتے بلکہ دھمکیاں دیا کرتے اور سنگین وارداتیں کرتے تھے میں نے اپنے اے، ایس، آئی کو دو سوالوں کا جواب لاتے کے لئے بھیج دیا۔ ایک یہ کہ جن لڑکیوں کے ساتھ مقتولہ ہر شام باہر نکلا کرتی تھی، ان سے پوچھ کر کہے اور پھر مقتولہ کے باپ کے متعلق یہ معلوم کرے کہ کیا واقعی اینگلا اینڈین صاحب کے گھر سو

باپ سے سنی بہت ماری: میں پر پی۔ میں جو مختصر آریہ ہیں کہ یہ آدمی اکثر پریشانی اور کھو یا کھو یا رہتا تھا۔ اس نے اپنے صاحب سے یہ بھی کہا کہ اسے جنگلے میں رہنے کی جگہ دے دے یا قریب کوئی رہائش کا بندوبست کر دے۔ پہلے تو وہ یہ کہتا رہا کہ جہاں وہ رہتا ہے وہ جگہ تنگ ہے اور وہاں کو فرنگی اور بد معاش رہتے ہیں۔ پھر اس نے پریشانی ہو کر بتادیا کہ اس کی بیٹی وہاں خراب ہو گئی ہے۔ جنگلے میں کوئی جگہ نہیں تھی، مقتولہ کا باپ بہت ہی پریشان رہنے لگا تھا۔ اس کی طبیعت میں غصہ بھی بہت تھا۔ ان معلومات کی روشنی میں مجھے اپنا کام آسان ہوتا نظر آیا۔ میں نے صبح کا انتظار نہ کیا۔ اسی وقت مقتولہ کی ماں اور اس کے باپ کو بلا لیا۔ جس کا ٹیبل کو میں نے انہیں لانے کے لئے بھیجا تھا، اسے کہا تھا کہ ان دونوں کو وہ آپس میں راستے میں کوئی بات نہ کرنے دے۔

میں ماں کو اپنے کمرے میں لے گیا۔ باپ کو باپ سے میں بٹھائے رکھا۔ میں نے اس سے کہا۔ ”تمہاری سچی جیسی کیسی بھی تھی تمہاری سچی تھی۔ اسے کسی نے قتل کر دیا ہے۔ تم ضرور چاہو گی کہ قاتل پکڑا جائے اور اسے پھانسی ملے۔ مگر جب تک مجھے کوئی اندر کی بات نہیں بتاؤ گی قاتل نہیں پکڑا جائے گا اور اگر تم کچھ نہیں بتاؤ گی تو ہم تمہیں اور تمہارے خاوند کو پکڑیں گے۔ تم دونوں، میاں بیوی، مجھ سے وہ باتیں چھپا رہے ہو مجھے معلوم ہیں اور باقی معلوم ہو جائیں گی، میں جو پوچھوں سچ سچ بتا دو۔“

غریب سی عورت بیٹی کے قتل سے پریشان تھی اور خوفزدہ بھی۔ میری باتوں سے وہ اور زیادہ ڈری۔ میں نے اسے برسنے کی ملت نہ دی اور پوچھا۔ ”تمہاری بیٹی کی آشنائی کس کے ساتھ تھی؟ گھراؤ نہیں۔ مجھے اپنا بھائی سمجھو۔ اس میں تمہارا کوئی نقص نہ ہوگا۔ اولاد باہر نکل کر گمبھ جاتی ہے۔“

میں نے ڈاکٹروں سے ایک سوال پوچھا جس کے جواب میں انہوں نے کہا کہ یہ بتانا ناممکن ہے کہ یہ گوشت مرد کا ہے یا عورت کا۔ موت کا وقت رات آٹھ اور نو بجے کے درمیان لکھا گیا۔

اس رپورٹ سے راضی ہو گیا کہ یہ زبردستی آبروریزی کا جرم نہیں ہے اور یہ بھی کہ لڑکی اچھے اخلاق کی نہیں تھی۔ ڈاکٹروں نے اسے نشادی شدہ کھانا کھا حالانکہ وہ غیر نشادی شدہ تھی۔ میں جب تھکانے میں گیا تو میرے اے۔ ایس۔ آئی نے مجھے بتایا کہ مقتولہ تقریباً ہر شام چار سہیلیوں کے ہمراہ باہر سیر پاٹے کے لیے جاتا کرتی تھی قاتل کی شناسامی اس نے ایک لڑکی سے کہا تھا کہ آج شام نہیں آؤں گی۔ ماں کے پیار کے مطابق وہ اسے یہ کہہ گئی تھی کہ لڑکیوں کے ساتھ باہر جا رہی ہوں۔ اس سے بہت چلتا تھا کہ وہ اپنے آشنائے ملنے گئی تو جس کسی کو اس نے دھتکار دیا تھا اس کے ہاتھ مار گئی یا اسے آٹھانے ہی کسی اور کے ساتھ تعلقات قائم کرنے کے شبہ میں مار ڈالا میرے اے۔ ایس۔ آئی نے یہ بھی بتایا کہ مقتولہ کا باپ رات اپنے اینگلو انڈین صاحب کے گھر نہیں تھا۔ صاحب نے بتایا کہ مقتولہ کا باپ شام کو بہت جلدی آ گیا، وہ چھٹی، آگاہ رہا تھا۔ اس نے وقت سے بہت پہلے کھانا تیار کیا اور چلا گیا تھا۔ اس کے بیان کے مطابق وہ سات بجے چلا گیا تھا۔ یہ اکتشاف بڑے کام کا شک پیدا کرتا تھا۔ لڑکی آٹھ اور نو بجے کے درمیان قتل ہوئی۔ باپ سات بجے چھٹی کر کے آ گیا اور پھر گھر نہیں آیا۔ اس نے جھوٹ بولا کہ رات صاحب کے گھر ہو گیا تھا اور اب اپسٹا رپورٹ نے یہ نثر ثابت کر ہی دیا تھا کہ لڑکی اچھے چال چلن کی نہیں تھی۔

میرے اے۔ ایس۔ آئی نے میری ہدایت کے مطابق اینگلو انڈین سے مقتولہ

ناخول میں گوشت کس کا تھا؟

یہ مقتولہ کی ماں کے بیان کی موٹی موٹی باتیں ہیں جن سے میرے سامنے دو مشتبہ افراد آئے۔ مقتولہ کا باپ یا اطہر زیادہ تر شبہ باپ پر تھا۔ وہ برآمدے میں بیٹھا تھا۔ اسے اندر بلایا اور اس کی بیوی کو باہر بھیج دیا۔ باپ کو اس وقت اینگلو انڈین صاحب کے گھر جانا چاہیے تھا لیکن اس کی بیٹی کی لاش گھر آچکی تھی۔ اس لئے کام یہ نہیں کیا۔ میں نے اس سے پہلا سوال یہ کیا۔ ”قتل کی رات تم اپنے صاحب کے گھر سے جلدی نکل گئے تھے۔ رات کہاں گزاری تھی؟“

وہ سمجھ گیا کہ اس کا جھوٹ پکڑا گیا ہے۔ ہاتھ جوڑ کر بولا۔ ”صنوار مجھے بخش دیں۔ میں نے جھوٹ بولا تھا۔ میں نے رات کرم سنگھ کے ٹھیکے میں گزاری تھی۔ اتنی پی پی لی تھی کہ بے ہوش ہو گیا تھا۔ رات بھر وہیں پڑا رہا۔“ ٹھیکے سے اس کی مراد دیسی شراب کی دکان تھی۔ انس یافتہ دیسی شراب کی دکانوں کے باہر لورڈنگ ہوتا تھا۔ ”ٹھیکہ شراب دیسی۔ انس انس نبر۔“ اس نے کہا۔ ”آپ کرم سنگھ کو بل کر پوچھ لیں۔“

”اب جھوٹ نہ بولنا۔ میں نے اسے کہا۔“ تمہاری بیوی اپنی بیٹی کے متعلق ساری باتیں بتا گئی ہے۔ میں نے اس کا چہرہ دیکھا۔ ہاتھ، بازو اور گردن دیکھی۔ مجھے کہیں کوئی خراش نظر نہ آئی۔ اس کی قمیض اتروا کر دیکھی۔ کوئی خراش نہیں تھی۔ قمیض کا کوئی ٹٹن لٹا ہوا نہیں تھا۔ میں نے اس کی بیوی کے بیان کی روشنی میں اس سے جو بھی بات پوچھی اس نے صحیح بتا دی مگر جہاں بھی اسے اشارہ ملا کہ میں اس پر قتل کا شبہ کر رہا ہوں، اس نے جھوٹ بول کر بات گول کر دی۔ مثلاً میں نے اس سے پوچھا کہ تم نے

وہ کچھ دیر جھگڑتی رہی۔ میں نے اس کی حوصلہ افزائی کی اور اشاروں اشاروں میں ڈرایا بھی تو اس نے بولنا شروع کر دیا۔ اس نے یہ بتایا کہ اطہر نام کے ایک نو جوان اور غیر شادی شدہ آدمی کے ساتھ مقتولہ کا میل جول تھا۔ لڑکی اطہر کو بہت پسند کرتی تھی۔ ماں کا ارادہ تھا کہ لڑکی کا رشتہ اطہر کو ہی دے دیا جائے لیکن باپ نہیں ماننا تھا۔ اطہر کے والدین نے رشتہ مانگا تو باپ نے انکار کر دیا۔ اطہر نے دھمکی دی کہ وہ لڑکی کو زندہ نہیں چھوڑے گا۔ رشتہ دوسری جگہ دے دیا گیا۔ لڑکی کو وہ پسند نہیں تھا۔ وہ اب اتنی منہ چھٹ ہو گئی تھی کہ اس نے باپ تک سے کہہ دیا تھا کہ وہ اس جگہ شادی نہیں کرے گی۔ باپ نے اسے دذین باز مارا پٹایا تھا۔ اس سے پہلے لڑکی کے ماں باپ کو یہ بھی پتہ چل چکا تھا کہ اس نے ایک اور آدمی کے ساتھ بھی تعلقات قائم کر رکھے ہیں۔ ماں نے میرے کریدنے پر نیا لڑکا باپ لڑکی کے متعلق بہت پریشان تھا اور یہ تو اس نے کئی بار کہا تھا کہ یہ لڑکی مر ہی جائے تو اچھا ہے۔ اگر اس نے میری بات نہ مانی تو میں اسے اپنے ہاتھوں ختم کر دوں گا۔ ایک روز اس نے لڑکی کا گلہ دار دیا تھا۔ ماں نے بڑی مشکل سے چھڑایا۔

ماں نے یہ الفاظ ذکر کر کے۔ ”لوگوں نے تو یہ بھی مشہور کر دیا تھا کہ اس لڑکی سے ماں باپ خود عصمت فرمائی کر رہے ہیں۔ خود ہی دوستی لگا کر بے ہودہ رہتے ہیں۔ یہی وجہ تھی کہ جہاں ہم نے رشتہ دیا تھا، وہاں سے جواب مل گیا۔ ان لوگوں نے ماں کو دیا کہ لڑکی داغدار ہے، ہم نہیں لیں گے۔ اس کے بعد اطہر نے پھر رشتہ مانگا تو لڑکی کے باپ نے ہر کی بے عزتی کر دی۔ اس نے اطہر سے یہ بھی کہا کہ اپنی بیٹی کسی جھگی کو دے دوں گا نہیں نہیں دوں گا۔ اس کے جواب میں اطہر نے کہا تھا کہ تمہاری بیٹی کی لاش جھگی ہی اٹھائیں گے۔ اس کی ڈولی نہیں جائے گی۔“

ایک روز اس کا گلاب یا تھا تو کیا تم اسے مار ڈالنا چاہتے تھے؟ اس نے جواب دیا۔
”نہ حضور، اپنی اولاد کو کون قتل کر سکتا ہے۔ میں تو اسے ڈرا رہا تھا۔ پڑوسی نہ آجائے
بھی میں اسے چھوڑ دیتا۔“

اس کی بیوی نے بیان دیا تھا کہ اپنی بیٹی کو باپ کے ہاتھوں سے اس نے چھڑایا
مگر یہ کہ رہا تھا کہ پڑوسی آگئے تھے۔ مجھے شک ہوا کہ گلاب دبانے کا واقعہ ایک سے زیادہ
مرتبہ ہوا ہے۔ میں نے اسے گھبرنے کے لئے کہا۔ ”میں اس روز کی بات نہیں کر رہا
اس روز کی بات کر رہا ہوں جب تمہاری بیوی نے تمہارے ہاتھ سے تمہاری بیٹی کا
گردن چھڑائی تھی۔ پڑوسیوں نے جس روز آکے چھڑایا وہ کسی اور دن کی بات ہے۔
نے تو کئی بار بیٹی کی گردن دہائی تھی۔“

”کئی بار نہیں حضور۔“ اس نے کہا۔ ”کوئی چار یا پانچ مرتبہ ایسے کیا تھا۔ کیا کار
لڑکی منہ پھٹ رہی تھی اور ہاتھ سے نکلی جا رہی تھی۔“

میں نے دماغ پر بہت زور دیا کہ اسے حراست میں لے لوں؟ میرے پاس مزہ
جواز تھا کہ وہ اپنی بیٹی سے تنگ آچکا تھا۔ اس نے جب بھی غصے کا اظہار کیا تو
گردن ہاتھوں میں دبا کر کیا۔ یہ اس کی عادت بن گئی تھی۔ آخر اس نے بیٹی سے باہر
جگہ لڑکی کو کسی کے ساتھ دیکھ لیا اور اس کی گردن دبا کر اسے مار ڈالا۔ مگر لڑکی کوئی
پر خون کس کا تھا؟ اس کے ناخنوں میں گوشت کس کا تھا؟

میرے پوچھنے پر اس نے بتایا کہ وہ شراب کا عادی نہیں۔ کبھی کبھار ایک
گھونٹ پی لیتا ہے۔ مجھے اس پر بھی غور کرنا تھا کہ قتل کی رات اس نے اتنی زیادہ
پی لی کہ بے ہوش ہو گیا؟ اس نے یہ جواب دیا کہ اس شام وہ بیٹی کے کمرے سے

تدریجاً نشان تھا کہ اس نے بہت زیادہ پی لی۔ میں نے بہت سوچا، آخر اس نتیجہ
پر پہنچا کہ اس آدمی کو جھٹکنے کے لئے کچھ دن چھوڑ دوں۔ یہ خیال بھی آگیا کہ اس کی
بیٹی کی لاش گھر پر رکھی ہے۔ اس کے کفن و دفن کا بندوبست بھی اسی کو کرنا ہے چنانچہ
میں نے اسے باتوں سے یہ تاثر دیا کہ مجھے اس پر کوئی شبہ نہیں اور آئندہ اسے
شناہ تھا نے نہ بلاؤں۔ اسے جلنے کی اجازت دے دی اور اپنے اسے۔ ایس آئی
سے کہا کہ اس آدمی کا ہر لمحہ پیچھا کرنے کا بندوبست کرے مگر یہ بندوبست ہونے سے
پہلے ہی اس آدمی نے ایسا بندوبست کر لیا کہ میں منہ دیکھتا رہ گیا۔

باپ گیا آشنا آیا

واقعہ یوں ہوا کہ صبح سویرے اطلاع ملی کہ ایک آدمی ریل گاڑی کے نیچے
اگرٹ گیا ہے۔ جا کر دیکھا۔ وہ مقتول کا باپ تھا۔ اس کی بیٹی کی لاش گھر میں پڑی
تھی۔ اگلے روز دفن کرنا تھا۔ وہ رات کے پچھلے پر گھر سے نکل گیا۔ پھر اس کی بیوی
نے اور بستی والوں نے اسے اس حالت میں دیکھا کہ اس کا جسم چار ٹکڑوں میں کٹا ہوا
ریلوے لائن پر پڑا تھا۔ کسی مشتبیہ کی خودکشی پولیس کے لئے باعث رحمت ہو کر رہی
ہے۔ پولیس کچھ تنہا دتیں تیار کر کے اس رپورٹ پر قتل کی تفتیش کو ل کر دیتی
ہے کہ قاتل نے خودکشی کر لی ہے۔ اسے۔ ایس آئی اور سیڈ کانسیبل نے مجھے مشورہ
دیا بھی کہ چلو ملک صاحب چھٹی ہوئی۔ تنہا دتیں ہم لے آتے ہیں۔ مقتول کی ماں تک سے
بیان لے لیں گے کہ اس کی بیٹی کو اس کے خاوند نے قتل کیا تھا اور وہ مر گیا ہے مگر میں
نے شکست قبول نہ کی اور میں بددیانتی کے لئے تیار نہ ہو سکا۔

اوپر پہلی سی دوائی لگی ہوئی تھی، چونکہ مجھے یقین ہو گیا تھا کہ قاتل یہی ہے، اس لیے میں سوال اس قسم کے سوچنے لگا جو مجھے ثبوت اور شہادت مہیا کرنے میں مدد دیں۔
 ”مقتولہ کے ساتھ تمہارے تعلقات کتنا عرصہ رہے؟“ میں نے پوچھا۔
 ”میرا اس کے ساتھ کوئی تعلق نہیں تھا۔“ اس نے جواب دیا۔

”دیکھو میرے دوست!“ میں نے دوستانہ لہجے میں کہا۔ ”تم اس وقت لاریوں کے اڈے پر یا جواریلوں کے اڈے پر نہیں ہو۔ یہ ٹھکانہ ہے۔ کہہ دو تمہاری ایک ایک دن کی ملازمتیں سناروں۔ میری مدد کرو گے تو میں تمہاری مدد کروں گا۔ مجھے چکر دو گے تو چکیاں بلائیں جاؤ گے۔ آؤ۔ دوستوں کی طرح باتیں کریں۔“ یہ گردن پر زخم کیے آئے ہیں ہمارے ان کے سلام کرتے ہیں۔

”لڑائی ہو گئی تھی“

”کہاں؟“

”لاریوں کے اڈے پر“

”کب؟“

”پیرسوں“

”کسی نے چھڑا لیا تھا؟“

”جی ہاں“

”مرت دو آدمیوں کے نام بتا دو۔“ میں نے کہا۔ ”اور اس آدمی کا نام بھی بتاؤ جس نے لڑائی ہوئی ہے۔“

وہ گھبرا گیا اور اچانک سنبھل کر بولا۔ ”درس جی بات یہ ہے کہ لڑائی جواریلوں کے اڈے

مقتولہ کے باپ کی خودکشی کا باعث یہ بھی ہو سکتا تھا کہ اپنی بیٹی کو اسی نے قتل کیا ہے جسے ہم نے گنے کے لئے پہلے تراس نے اتنی شراب پی کہ ساری رات بے ہوش پڑا رہا اور اس کے بعد خون سر چٹھا تراس نے خودکشی کر لی لیکن اس کی وجہ یہ بھی ہو سکتی تھی کہ وہ یہ ذلت برداشت نہ کر سکا کہ اس کی بیٹی پہلے بدنام ہوئی پھر قتل ہو گئی۔ اس کا ایک فقرہ مجھے یاد آیا۔ بیٹی کی لاش دیکھ کر اس نے آہ بھر کر کہا تھا۔ ”یہ ذلت بھی میری قسمت میں کبھی تھی۔“ تاہم میں نے اس نفلے کو سامنے رکھا کہ مقتولہ کا قاتل یہی شخص ہو سکتا ہے مجھے بہر حال ثبوت کی ضرورت تھی۔ ابھی مجھے اس آدمی سے تحقیقات کرنی تھی جسے مقتولہ کا رشتہ نہیں دیا گیا تھا۔

مقتولہ کے باپ کی لاش کے ٹکڑے پر سٹ مارٹم کے لئے بھیجا کر میں نے اس کی خودکشی کی تحقیقات اپنے اے۔ ایس۔ آئی کے حوالے کر دی اور اطہر علی نام کے آدمی کو بلا دیا۔ مقتولہ کی ماں نے بتایا تھا کہ اس شخص کے ساتھ مقتولہ کا سیل جوتھا اور مقتولہ اسے بہت پسند کرتی تھی۔ وہ ٹھکانے میں آیا۔ گٹھے ہوئے جسم کا خوبود جوان تھا۔ اس کی کشش تھی۔ کسی لڑکی کا اسے پسند کرنا قابل فہم تھا۔ وہ لاریوں کے اڈے پر کام کرتا تھا اس کے متعلق فخریوں سے میں رپورٹ لے چکا تھا۔ اس کی ہسٹری ٹھکانے میں تو نہیں تھی لیکن وہ کوئی نیک نام آدمی نہیں تھا۔ یعنی میں اس کا رعب تھا۔ لڑائی مارکشی کا عادی تھا۔ بچا بھی کھیلتا تھا اور عورتوں کا شکاری تھا۔

وہ جوں ہی میرے سامنے آیا میری نظر اس کی گردن پر پڑی۔ اگر میں اپنے آپ پر قابو نہ کرتا تو میں کسی سے اچھل کر فخر لگاتا۔ ”قاتل مل گیا۔“ اس کی گردن کے دائرے اور بائیں طرف چوڑی خراشیں تھیں جو ایک ایک اپنے لمبی تھیں۔ ان پر خون جما ہوا تھا اور

پر زہری تھی۔ میں بتانا نہیں چاہتا تھا۔ وجہ آپ کو معلوم ہے۔“

”چلو۔“ میں نے کہا۔ ابھی وہاں چلتے ہیں۔ میں اس آدمی کو دیکھنا چاہتا ہوں۔
سے لڑائی ہوئی تھی اور صرت وہ ایسے آدمیوں کو جنہوں نے بیچ بچاؤ کیا تھا۔“

وہ کھسیانہ سی منہی ہنس پڑا۔ میں جانتا تھا کہ وہ جھوٹ بول رہا ہے۔ میں نے سرکاری
کے نام چٹھی لکھی اور راجہ کو مہیدہ ٹیبل کے ساتھ ڈاکٹر کے پاس بھیج دیا۔ میں اس کے خون
معلوم کرنا چاہتا تھا۔ میں نے چٹھی میں لکھا کہ اس کا خون اُس خون کو سامنے رکھ کر ٹیسٹ
جائے جو مقتولہ کی انگلیوں کے ساتھ لگا ہوا تھا۔ ان کے جانے کے بعد میں اظہر کے

گیا۔ اس کی ماں اور باپ سے پوچھا کہ اسے زخم کب آیا تھا۔ ماں نے وہی رات بتائی
رات نسل بٹھا تھا۔ وقت بھی وہی بتایا۔ میں نے پوچھا کہ وہ مقتولہ کا رشتہ چاہتے تھے
انہوں نے بتایا کہ یہ اظہر کی ضد تھی رشتہ وہ تو بالکل پسند نہیں کرتے تھے کیونکہ لڑکی بکا
وہاں سے ہیں ان کے ہاں کیا جنہیں مقتولہ کے رشتے کا وعدہ دیا گیا تھا مگر
انہوں نے رشتہ لینے سے انکار کر دیا تھا۔ گھر میں وہ لڑکا بھی مل گیا جس کے لئے رشتہ

تھا۔ اس کے بڑے بھائی نے میرے اس سوال کے جواب میں کہ انہوں نے رشتہ خود
بعد میں قبول کرنے سے انکار کر دیا تھا، کہا کہ پہلے صرت سنتے تھے کہ لڑکی خراب
مگر ہم نے یقین نہیں کیا تھا۔ بعد میں ثبوت بھی مل گیا۔ اس آدمی نے اپنی آنکھوں
لڑکی کو اظہر کے ساتھ بالکل اس جگہ اکٹھے رکھا تھا جہاں وہ قتل ہوئی تھی۔ یہ قتل
دن پہلے کا واقعہ ہے۔ پھر اس آدمی نے اپنی آنکھوں لڑکی کو اس جگہ سے خنجر پر
کے ایک اور نوجوان کے ساتھ لعل گیری کی حالت میں کھڑے دیکھا۔ یہ قتل سے
دن پہلے کا واقعہ ہے۔ یہ آدمی (لڑکے کا بھائی) دراصل لڑکی کا چال چلن معلوم کرنے

اس کا پیچھا کرتا رہتا تھا۔

اس کے علاوہ اظہر نے انہیں دھکی دی تھی کہ اگر انہوں نے اس لڑکی کے ساتھ
شادی کی تو ان کے لئے اچھا نہ ہوگا۔ یہ لوگ اس دھکی سے ڈر گئے۔ وہ جانتے تھے
ماظہر معاش ہے اور وہ اپنی دھکی پوری کر دکھائے گا۔ اس آدمی نے یہ بھی بتایا
نہوں نے جب لڑکی کے باپ سے کہا تھا کہ وہ اس کی لڑکی کا رشتہ نہیں لیں گے تو
وہ رو پڑا تھا اور اس نے کہا تھا ”اب لگتا ہے کہ یہ لڑکی میرے ہاتھوں ختم ہوگی۔“
یہ شک تو میرے دل میں پہلے ہی تھا کہ باپ کا بیٹی کے قتل میں ہاتھ ہے۔ زیادہ

بچتہ شبہ اظہر پر تھا۔ اب اس لڑکے کے بھائی نے ایک اور نوجوان میرے سامنے کھڑا
لڑا جس کے ساتھ اس نے مقتولہ کو دیکھا تھا۔ اس سے یہ شبہ بچتہ ہوتا تھا کہ ظہر
نے لڑکی کو رقابت کے جوش میں قتل کیا ہے۔ اس سے یہ بھی ثابت ہوا کہ لڑکی خود
شکاری تھی۔ وہ بیک وقت ایک سے زیادہ آدمیوں سے دوستی لگائے ہوئے تھی۔
ان نے اس نوجوان کا اتنا پتا معلوم کر لیا لیکن اسے اس وقت بلانا مناسب نہ سمجھا میں
پہلے اظہر کے ساتھ بات مکمل کرنا چاہتا تھا۔

تھانے میں گیا تو چند منٹ بعد اظہر اور اس کے خون کی رپورٹ آگئی۔ خون کا
رپ وہی تھا جو لڑکی کی انگلیوں پر پائے جانے والے خون کا تھا۔ خون کی دیگر
تفصیلات بھی اس خون سے ملتی تھیں۔ ڈاکٹر نے لکھا تھا کہ خون جو لاش کی انگلیوں پر
لگا ہوا تھا اور خون جو مسمی اظہر علی کے جسم سے لیا گیا، ایک ہی معلوم ہوتا ہے۔ میرا
محققین میں بدل گیا۔ قاتل اظہر تھا۔ اب وہ میرے سامنے آیا تو بہت گھبرا ہوا تھا۔
انے حیرت اور خوف سے پوچھا۔ ”جناب! میرا خون کیوں ٹیسٹ کیا گیا ہے؟“

”ابھی تم تھلا اور نہ جانے کیا کیا ٹیسٹ کریں گے“ میں نے جواب دیا۔ ”میں نے تم
 کہا تھا کہ یہ لاریوں یا جواریوں کا ڈھ نہیں، پولیس سٹیشن ہے۔“
 ”لیکن حضور والا، میرے سامنے آپ سیدی سی بات کریں۔“ اس نے جھنجھلا کر کہا۔
 ”سنو دوست!“ میں نے اس کے کندھوں پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ ”تمہاری گردن؟
 زخم ہیں یہ لڑکی کے ناخنوں کے زخم ہیں اور اب تم چھانسی کے تختے پر کھڑے ہو سلا
 بات خود بیان کر دو تاکہ میں شکریے کے طور پر تمہیں چھانسی کے تختے سے انار لوں۔“
 ”ہاں حضور انور۔“ اس نے کہا۔ ”آپ ٹھیک کہتے ہیں۔ یہ لڑکی کے ناخنوں کے
 ہیں لیکن لڑکی نے مجھے زخمی کیا ہے، میں نے اسے ہلکی سی ضرب بھی نہیں پہنچائی تھی۔ اُ
 مجھے چھانسی کے تختے پر کیوں کھڑا کر رہے ہیں؟“
 ”اس لیے کہ تم نے اسے گلا گھونٹ کر مار دیا ہے؟“
 ”میں نے مار دیا ہے؟“ اس نے اچھل کر کہا۔ ”خدا کی قسم، وہ زندہ ہے۔ ہیں اُ
 ساتھ لے جا کر دکھا سکتا ہوں۔ میں تو اس سے جان چیرا کر جھا کا تھا۔ وہ تو چڑیل ہے۔“
 میں سمجھا کہ خوف سے اس کا دماغ یگو گیا ہے۔ وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ میں منتزا
 سلے میں اس سے پوچھ گچھ کر رہا ہوں۔ میں نے اس کی تصحیح نہیں کی اور سوچا کہ اگر
 ہو گیا ہے تو بہتر ہے، دل کی باتیں اُگل دے گا نہیں نے اس سے پوچھا۔ وہ لڑکی کہاں
 ”دور نہیں ہے جناب والا۔“ اس نے جواب دیا۔ ”ابھی میرے ساتھ چلو
 ہماری آبادی سے تقریباً آدھا میل دور اُن کے ڈیرے ہیں۔ اس کا نام ہاتھ
 بد بخت بہت خوبصورت لڑکی ہے۔“
 ”کون سے ڈیرے؟“ میں نے جبران ساہو کے پوچھا۔ کس کے ڈیرے؟

”خانہ بدوشوں کے ڈیرے کی بات کر رہا ہوں حضور والا۔“ اس نے کہا۔ ”میں ایک خانہ
 بدوش لڑکی کی بات کر رہا ہوں جس کا نام ہاتھ ہے۔ اس ڈائن کو کون قتل کر سکتا ہے۔ وہ تو
 مجھے قتل کرنے لگی تھی۔ خدا کی قسم بڑی مشکل سے گردن چیرا کر جھا کا۔“
 میں نے غصے میں اُکڑ کر اسے گالی دی اور کہا۔ ”میں اس لڑکی کی بات کر رہا ہوں
 جس کا نام زرنیب تھا اور جس کے رشتے کے لیے تم نے کوشش کی تھی اور جو کل رات قتل
 ہو گئی ہے۔ اس کی بات کر۔ تھلا دماغ ٹھکانے ہے یا نہیں؟“
 ”قرآن لے آؤ حضور انور!“
 ”تم جیسے پلید آدمی کے آگے میں کلام پاک نہیں رکھوں گا۔“ میں نے غصے سے کہا۔
 ”تمہاری گردن پر زرنیب کے ناخنوں کے زخم ہیں۔“
 ”عالی جاہ!“ اس نے کہا۔ ”مجھے اجازت دیں کہ ساری بات سنا دوں۔ قرآن
 پاک کی قسم ہے، جھوٹ نہیں بولوں گا۔“ میرے کہنے پر اس نے جو بات سنائی وہ اس کے
 الفاظ میں مختصر آئیں ہے۔ ”میری گردن پر یہ نشان ایک خانہ بدوش لڑکی کے ہیں۔ آپ
 خود جا کر بلا اسے یہاں بلا کر پوچھ سکتے ہیں۔ زرنیب (منقولہ) کے ساتھ تعلقات سے پہلے
 میری دوستی اس خانہ بدوش لڑکی کے ساتھ ہو گئی تھی۔ میں اسے بہت مال کھانا مارا۔ وہ ایسی
 بُری طرح مجھ پر نفیر ہوئی کہ لاریوں کے اوٹے پر بھی کبھی آجایا کرتی تھی۔ پھر اس نے
 مجھے مجبور کرنا شروع کر دیا کہ اس کے ساتھ شادی کروں۔ وہ انسان کی بی بی نہیں، پوری
 حیوان ہے۔ یہ تو اس نے کئی بار کہا تھا کہ تم نے کسی دوسری لڑکی کی طرف نظر بھی اٹھائی تو
 زہمیں زندہ چھوڑ دوں گی نہ اسے۔ سچی بات ہے کہ میں اس سے ڈرنے لگا تھا۔ وہ چونکہ
 خوبصورت تھی اس لیے میں اسے چھوڑنا بھی نہیں چاہتا تھا لیکن میں اس کے ساتھ شادی

”وہ بچکتا آگ بگولا ہوگئی۔ میں چل پڑا تو اس نے لپک کر میرا بازو پکڑ لیا اور بولی۔ ”جاتے کہاں ہو، مجھے اپنے ساتھ لے چلو یا تم میرے ساتھ چلو۔“ وہ اب ذانت پیس پیس کر بات کرتی تھی۔ میں نے غصے سے پاگل ہو کر اس کی کٹائی پکڑی اور اسے پرے کرتے ہوئے کہا۔ ”میں اپنے ساتھ تجھے چڑیل کو لے جاؤں گا؟ کوئی اچھی لڑکی نہیں ملتی بھلا؟“۔۔۔

”اس نے اچانک دونوں ہاتھوں سے میری گردن پکڑ لی اور اتنی زور سے دبا لی کہ میرا دم گھٹ گیا۔ میں آخر مر رہا تھا۔ میں نے اس کے انگوٹھوں کو دونوں ہاتھوں سے جکڑ کر زور سے پیچھے کو انگوٹھے کھینچے تو اس کے ہاتھ تو اکھڑنے لگے لیکن مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے میری گردن دونوں طرف سے کاٹی جا رہی ہو۔ اس کے ناخن ہری کھال میں اتر گئے تھے۔ میں نے اس کے ہاتھ اکھاڑ دیئے اور اس نے میری کھال ادھیڑ لی۔ میں نے اسے زور سے دھکا دیا۔ وہ گر پڑی اور میں وہاں سے بھاگ اٹھا۔ میں بازار میں چلا گیا۔ گردن سے خون بہہ رہا تھا۔ ایک کٹر کے پاس چلا گیا۔ وہ میری گردن کو ٹی میں کٹے لگا تو میں نے اسے کہا کہ پیٹی نہ بانڈو، صوف دروائی لگا دو۔ میں ٹی سے اس لئے ڈرتا تھا کہ ہر کسی کی نظر میں آجائے گی اور سب پوچھیں گے کہ کیا ہوا ہے۔ ڈاکٹر نے خون روک کر دروائی لگا دی اور بوتل میں بھی ڈال دی۔ کلی سے میں بہت ہڈیا ہوا ہوں۔ وہ چڑیل جہاں ملی مجھے پکڑے گی۔“

یہ لڑکی حیوان نہیں درندہ تھی!

میں نے اسی دقت ہیڈ کا سب کو درد کا ٹیبل رے کرنا بدوشوں کے ڈیرے

کرنے کے لیے کسی قیمت پر تیار نہیں ہو سکتا تھا۔ میں نے آہستہ آہستہ اس سے دور ہٹنے کی کوشش شروع کر دی اور زینب سے دوستی کر لی۔ یہ لڑکی بھی میری غلام ہوگئی، ہماری دوستی کا چرچا ہونے لگا۔ ہماری دوستی پاک صاف نہیں تھی۔ زینب کے باپ کو بھی پتہ چل گیا، انہوں نے ایک روز مجھے کہا کہ میں اس کی بیٹی سے ملنا چھوڑ دوں۔ میں نے اسے کہا کہ تم اپنی بیٹی کی شادی میرے ساتھ کر دو۔ اس نے انکار کر دیا اور کہا کہ میں اپنی بیٹی کی شادی کسی آدمی اور بد معاش آدمی سے نہیں کروں گا۔ یہ سن کر مجھے لعین آگیا اور میں نے اسے دھمکی دی۔۔۔ ”اسے نہ پایا معلوم تھا کہ میں کیٹی میری ہی طرح آدمی اور بد معاش تھی۔ مجھ سے پہلے تو نوجوان مردوں سے دوستی لگا چکی تھی۔ پھر بھی میں نے فیصلہ کیا تھا کہ اس کے ساتھ ملنا نہ کروں گا مگر اس نے مجھ سے پرے ہٹنا شروع کر دیا۔ مجھے اس کا کوئی افسوس نہیں۔ یہ بیلا جنہوں والی محبت غمخوڑے ہی تھی کہ میں اس کا غلام ہو جاتا۔ میں اس دوران خانہ بدوش لڑکی سے نہ ملا۔ وہ دو دفعہ لاریوں کے اڈے پر آئی تو میں نے اسے ہٹا دیا۔۔۔

”کل شام کی بات ہے کہ میں اڈے سے واپس آ رہا تھا کہ یہ خانہ بدوش لڑکی مجھے راستے میں مل گئی۔ میرے تعلقات زینب کے ساتھ ختم ہو چکے تھے۔ بیس سچیس روز سے اس نے ایک اور نوجوان کے ساتھ دوستی کر لی تھی۔ خانہ بدوش لڑکی مجھے راستے میں مل گئی تو میں نے جان چھڑانے کی کوشش کی۔ وہ شاید سمجھ گئی تھی کہ میں اسے دھتکار رہا ہوں۔ اس نے مجھے گالیاں دینی شروع کر دیں۔ مجھے بھی غصہ آگیا۔ میں نے گالیوں کا جواب گالیاں سے دیا۔ میں سمجھتا تھا کہ یہ لڑکی ہے، ڈر جائے گی مگر وہ اور تیز ہوگئی۔ لوگ ہمیں دیکھنے لگے۔ میں اسے الگ لے گیا اور بتا دیا کہ میں اب اس سے نہیں ملا کروں گا اور وہ اب میرے پیچھے نہ آیا کرے۔۔۔۔

کا انا پتا بتا کر ہاشو نام کی لڑکی کو تھانے میں لانے کے لیے بھیج دیا۔ بہت سے تارکین نے خانہ بدوش جنہیں جیسی کہتے ہیں، نہیں دیکھے ہوں گے۔ پاکستان کے بڑے بڑے شہروں کے قریب آپ نے ایک مخلوق دیکھی ہوگی جو غمیوں میں رہتی ہے۔ یہ لوگ غمناک و عرصہ ایک جگہ رہ کر کہیں اور چلے جاتے ہیں۔ وہ کوڑے کوڑے کے ڈھیروں سے غلیظ کپڑوں کے ٹکڑے اکٹھے کرتے رہتے ہیں اور انہیں نہروں یا دریاؤں میں دھو کر فیصلہ کیوں میں تول کر بیچتے ہیں۔ یہ کپڑے مشینیں صاف کرنے کے کام آتے ہیں۔ ان کی جوان عورتیں شہروں میں بھیک بھی مانگتی ہیں۔ چوریاں بھی کرتی ہیں اور عصمت فروشی بھی کرتی ہیں۔ انہیں لوگ خانہ بدوش کہتے ہیں لیکن یہ ان خانہ بدوشوں سے بہت مختلف ہیں جو ہمارے زمانے میں دیکھنے میں آتے تھے۔ آج کل کے خانہ بدوش جو آپ کو شہروں کے ارد گرد نظر آتے ہیں، یہ دراصل بھکاری اور مزدور ہیں۔ اصلی خانہ بدوش ایک پراسرار مخلوق ہوا کرتی تھی۔

ان خانہ بدوشوں کا ایک گروہ دس دس بارہ کنہوں پر مشتمل ہوتا تھا۔ ان کے پاس چند ایک گدھے اور ایک دو خچر ہوتی تھیں۔ ان کے خیمے اوپر سے گول ہوتے تھے جو چاند کی شکل کے بانسوں پر کھڑے کئے جاتے تھے۔ ان کے ساتھ تین چار کتے ضرور ہوتے تھے جو بھڑ بھڑے لگتے تھے۔ بڑے ہی خوشنور کتے ہوا کرتے تھے۔ یہ رکھوالی کے لیے مہرتے تھے۔ ان لوگوں کو چوری چکاری کا تو کوئی خطرہ نہیں تھا۔ وہ چونکہ جنگلوں میں رہتے تھے اس لیے درندوں سے بچاؤ کے لیے بھیڑیوں کی نسل کے خوشنور کتے ساتھ رکھا کرتے تھے۔ ان لوگوں کا کوئی کتابی مذہب نہیں تھا۔ وہ گیدڑ مار کر کھالیا کرتے تھے۔ نیوے اور اودھ بلاؤنگ کو کھا لیتے تھے۔ پرندوں میں چیل اور گھنٹھ بھی ان کی غذا میں شامل تھے۔

ان کی عورتیں حفا کش، طاقتور اور خوبصورت ہوا کرتی تھیں۔ یہ لوگ بھیک نہیں مانگتے تھے اور نہ ان کی عورتیں عصمت فروشی کرتی تھیں۔ لوگ ان سے ڈرتے تھے۔ ان کے متعلق مشہور تھا کہ شہروں سے بچوں کو اٹھالے جاتے ہیں اور انہیں اسٹاکا کر نیچے آگ جلاتیں تھیں بڑی دیر بعد بچے کے سر میں سے قطرے گرنے لگتے ہیں جسے مومیائی کہا کرتے تھے۔ مشہور تھا کہ مومیائی ہر مرض کی دوا ہے اور انسان کے جسم کو نوا دینا دیتی ہے۔ لیکن لوگ انہیں آدم خور بھی سمجھتے تھے۔ ان کے متعلق بڑی خوفناک اور پراسرار کہانیاں مشہور تھیں۔

ان کی عورتوں کی ڈیل ڈول اور خوبصورتی بھی پراسرار سی ہوتی تھی۔ اگر کوئی شہری کسی خانہ بدوش عورت کو چھیڑ بیٹھے تو وہ مرنے مارنے پر آمادہ ہوتی تھی۔ جان چھڑانا مشکل ہو جاتا تھا۔ یہ عورتیں شہروں میں چھریاں اور چاقو بیچنے آیا کرتی تھیں۔ بہت دلیبر عورتیں تھیں اور اگر کوئی خانہ بدوش عورت کسی شہری پر نظر رکھے تو اسے اپنے قبضے میں لے کر ہی دم بیتی تھی۔ مگر ایسے واقعات بہت کم دیکھنے میں آتے تھے۔ میرے شہتیبہ اطہر علی نے جب مجھے ایک خانہ بدوش لڑکی کا واقعہ سنایا تو میں بالکل حیران نہیں ہوا۔ میں نے یہ بھی سوچا کہ مقتول کو قتل کرنے والی ہی لڑکی ہے۔ اس خیال کے پیش نظر میں نے اطہر سے پوچھا۔ اس لڑکی نے زینب کو دیکھا تھا، وہ جانتی تھی کہ تم نے اب زینب سے دوستی کر لی ہے؟

”نہیں“ اطہر نے جواب دیا۔ اس نے زینب کو کبھی نہیں دیکھا تھا۔

میں اطہر سے باتیں پوچھتا اور سناتا رہا۔ اس سے اس نوجوان کا بھی انا پتا معلوم کیا۔ جس کے متعلق اس نے بتایا تھا کہ زینب نے دوستی کر لی ہے۔ دو اڑھائی گھنٹوں بعد بیٹھ

سے دانت اکھاڑے۔ میں پہنچ تو گیا جس میں زیادہ سے زیادہ دو سیکنڈ لگے ہوں گے۔ اتنی دیر میں لڑکی اسے گرا چکی تھی۔

میں نے لڑکی کو کمر سے پکڑ کر اٹھانے کے لیے زور لگایا مگر اس کے دانت اٹھر کے گال میں اترے ہوئے تھے اور لڑکی اسے بھیڑیے کی طرح بھینچوڑ رہی تھی۔ میرے دو کانسیٹل اندر آ گئے۔ میں نے لڑکی کی ناک دبا لی اور دوسرا ہاتھ اس کی شاہرگ پر رکھ کر دبا دیا۔ دم گھٹنے سے لڑکی کا منہ کھل گیا۔ ہم نے اسے قابو کر لیا لیکن وہ ہمارے ہاتھوں سے نکلی جا رہی تھی۔ میں نے اسے حوالات میں بند کرنے کی دھکی بھی دی مگر اس نے کہا کہ میں پھانسی لے لوں گی، اسے ختم کر دوں گی۔ اٹھر کا گال دیکھا۔ اس کی بوٹی باہر آ گئی تھی۔ خون ابل ابل کر نکل رہا تھا۔ میں نے اسے ہیڈ کانسیٹل کے ساتھ ہسپتال بھیج دیا۔ اس کا اتنا تندرست اور خوبصورت چہرہ ہمیشہ کے لئے بھٹا ہو گیا۔ قتل کا یہ کیس جب عدالت میں گیا تو میں نے اٹھر کو دیکھا۔ اس کا زخم ٹھیک ہو گیا تھا لیکن زخم کا نشان ایسا بھتا تھا کہ دیکھنے والا فوراً تنگا میں بٹالیتا تھا۔ آنکھ کے ذرا نیچے سے ہونٹوں کے کونے تک یعنی ایک طرف سے چہرہ بری طرح بے ڈھب ہو گیا تھا۔ اس کے اسی چہرے پر روکیاں مارا کرتی تھیں۔

اسے ہسپتال بھیجا تو میں نے لڑکی کو بری ہی مشکل سے ٹھنڈا کیا۔ اسے یہ دم تھا کہ اٹھر نے اس کے خلاف رپورٹ کی ہے اس لیے اسے قتلانے بلایا گیا ہے۔ میں نے اس کا یہ دم دور کیا اور بتایا کہ ایک لڑکی قتل ہو گئی ہے۔ یہ اٹھر کی دوست تھی۔ اس کی تفتیش کے لیے اسے بلایا گیا ہے۔ میں نے لڑکی سے پوچھا۔ ”اسے کل تم نے زخمی کیا تھا؟“ اس نے فہر سے جواب دیا۔ ”ہاں، میں نے کیا تھا۔ میں اسے

کانسیٹل خانہ بدوش لڑکی کو ساتھ لے کر آ گیا۔ اس کے ساتھ تین آدمی اور دو عورتیں تھیں۔ میں نے انہیں باہر والے چھانک سے اندر آنے دیکھا تو کمرے سے نکل کر ان تک گیا۔ انہیں میں نے تسلی دی کہ وہ کوئی فکر نہ کریں۔ کوئی خطرناک بات نہیں ہے۔ لڑکی نے ایک واردات کے سلسلے میں گواہی یعنی ہے۔ وہ بہت پریشان تھے لیکن ان لڑکی مجھے رہی تھی۔ وہ ذاتی خوبصورت اور بڑے ہی دلکش جسم والی لڑکی تھی۔ میں نے اس کے ساتھ آئے ہوئے مردوں اور عورتوں کو چھانک کے قریب بٹھا دیا اور لڑکی کو اپنے ساتھ لے اٹھر میرے کمرے میں بیٹھا ہوا تھا۔

لڑکی میرے پیچھے پیچھے کمرے میں داخل ہوئی۔ میں اپنی میز سے گھوم کر اپنی کرسی پر بیٹھ رہا تھا جب لڑکی کی نظر اٹھر پر پڑی۔ مجھے لڑکی کے چہرے کے تاثرات آج تک باہر ہیں۔ اس کا رنگ اچھا خاصا تھا مگر یہ رنگ سرخ ہو گیا۔ وہ غصے سے لیے لیے سانس لے لگی۔ اس کی نظر اس اٹھر پر جمی ہوئی تھیں۔ اٹھر اسے چپ چاپ دیکھ رہا تھا۔ لڑکی نے ڈا پیس کر بڑی غلیظ گالی دی اور بولی۔ ”اسے میں مرد کی اولاد سمجھتی تھی۔ یہ اب بے قید کرانے گا۔“

اس نے میری طرف دیکھ کر کہا۔ ”مجھے قید کرنا۔ اس کو میں نے زخمی کیا تھا۔ لیکن یہ تھوڑی سی قید نہیں لوں گی۔ بہت ساری ہوں گی۔“ یہ کہہ کر وہ زخمی پٹی کی طرح اس تو تیزی سے اٹھر پر چا پڑی کہ میں حیران رہ گیا۔ اس نے ایک ہاتھ کی مٹھی میں اٹھر کے سر کے بال پکڑ لیے۔ دوسرا ہاتھ اس کی شاہرگ پر رکھ دیا اور دانت اس کے گال میں گاڑ دیے۔ ا جیسے توند مند آدمی کی چیخ نکل گئی۔ وہ بلبلا کر اٹھا۔ لڑکی نے اس کی گردن کو ایسا موڑا دیا کہ وہ پیٹھ کے بل گر پڑا۔ لڑکی اس کے اوپر گری۔ لیکن اس نے نہ اس کے بال چھوڑے نہ گالا

قتل کرنا چاہتی تھی۔“

اس لڑکی کو دیکھ کر مجھ پر عجیب سا اثر ہو رہا تھا۔ اس کے ہونٹ اطہر کے خور سے لال تھے۔ خون اس کے منہ میں چلا گیا تھا۔ زبان بھی لال تھی۔ ناک پر بھی خون تھا۔ اس کے ہونٹوں کے ارد گرد نیچے ٹھوڑی ناک خون تھا۔ یہ بھی ہو سکتا تھا کہ اس نے اچھا کچھ خون پی بھی لیا ہوگا۔ وہ مجھے ایک حسین چڑیل نظر آ رہی تھی جو انسانوں کو کھاتی اطہر نے کہا تھا کہ یہ لڑکی میدان ہے لیکن میری نظر میں وہ درندہ تھی۔ میں نے اسے کہا مرنے مارت کرلو۔ اس نے بڑے غصے سے اپنا بازو اپنے ہونٹوں پر مل دیا جس سے خور اس کے چہرے پر اور زیادہ پھیل گیا۔

”اس نے تمہارا کیا بگاڑا ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”کیا بگاڑا ہے؟“ اس نے شدید غصے کے لہجے میں جواب دیا۔ ”اس نے مجھے بلیا ہے۔ یہ مجھے بہت اچھا لگتا تھا۔ اس نے مجھے کہا تھا کہ تمہارے ساتھ شادی کروں؟“ مجھ کو پیسے دیتا تھا۔ میں نے اس کو اپنی عزت دے دی۔ وہ میرے ساتھ کھیلتا رہا۔ نے اعتراض نہیں کیا کیونکہ یہ میرا خاندان بننے والا تھا۔ میں نے اپنے باپ سے مار کھا لیکن اس آدمی کا ساتھ نہیں چھوڑا۔ پھر اس نے مجھ کو دھوکا دیا اور مجھ سے بھاگنے کا میں اس کو عزت دے چکی تھی۔ میں نے اس کو کہا کہ تم میرے خاندان بن گئے ہو۔ اب کہہ جاتے ہو۔ اس نے کہا کہ تم جنگلی ہو۔ میں شہر کی لڑکی کے ساتھ شادی کروں گا۔ میں نے اسے پوچھا کہ شہر کی لڑکی کون ہے؟ اس نے نہیں بتایا۔ اگر بتا دیتا تو میں اس کو جہان سے مار دیتی اور اس آدمی کو بھی۔ یہ میرے ہاتھ سے نکل گیا۔ اب مجھ کو تیرک کرلو۔“

میں اسے تیرک کر سکتا تھا۔ اس نے تھا نے میں ایک آدمی پر حملہ کر کے اسے زہ

لڑا تھا لیکن اس نے جس وجہ سے حملہ کیا تھا وہ معقول وجہ تھی۔ اس نے کسی بے گناہ پر حملہ نہیں کیا تھا لڑکی کا اشتعال بجا تھا۔ میں نے لڑکی کو جانے کی اجازت دے دی۔ اس سے یہی تصدیق کرانی تھی کہ اطہر کی گردن پر جو خراشیں ہیں وہ اسی لڑکی کی ہیں۔ میں نے لڑکی کے ساتھ آتے ہوئے مردوں کو بلا کر کہا کہ اس لڑکی کو قابو میں رکھو۔ انہیں بتایا کہ اس نے کیا کیا ہے اور یہ بھی کہا کہ میں اسے حوالات میں بند کر سکتا ہوں۔ اگر اس نے کوئی اور ایسی حرکت کی تو میں اسے نہیں چھوڑوں۔ گل دوسرے دن مجھے اطلاع ملی کہ خانہ بدوش اس شہر سے چلے گئے ہیں۔

میں نے مقتول کی ماں کو ایک بار پھر بلایا۔ چند ایک چھوٹی چھوٹی باتیں پوچھیں۔ اب تو میں تنکوں کے سہارے ڈھونڈ رہا تھا۔ باپ پر قتل کا شبہ تھا۔ اس نے خود کشی کر لی تھی۔ اطہر کو دیکھا تو میں نے اسی کو قاتل سمجھا مگر یہ کچھ اور ڈرامہ نکلا۔ اطہر کو میں نے مشتبہ افراد کی فہرست سے نکال کر گواہوں کی فہرست میں شامل کر لیا۔ لڑکی کے چال چلن کے سلسلے میں اس کی گواہی ضروری تھی۔ اب میں پھر اس لائن پر آ گیا کہ مقتول کا قاتل اس کا باپ تھا۔ کچھ معلومات ابھی اندھیرے میں تھیں۔ مقتول کی ماں کے سوا مجھے کوئی بھی شہابی نہیں دیکھ سکتا تھا۔ میں نے اسے صاف الفاظ میں کہہ دیا۔ ”تمہارا خاندان مر چکا ہے۔ اب اگر یہ ثابت ہو جائے کہ اپنی بیٹی کو اس نے قتل کیا ہے تو کوئی فرق نہیں پڑتا۔ مجھے کاغذوں کا پیٹ بھرنے کا پتہ ہے یا قاتل کو پکڑ لیں گے۔ تم اس روز سے جس روز تمہارے خاندان کو پتہ چلا تھا کہ بیٹی خواب ہو گئی ہے، قتل کی شہادت تک چھوٹی چھوٹی باتیں یاد کرو اور مجھے بتاؤ۔“ میں نے اس منظم اور غمزہ عورت کو کھانا کھلایا۔ چائے پلائی اور اس کے دل سے پولیس کا خوف نکال دیا۔ وہ مجھے چھوٹی بیٹی باتیں سنائے گی۔ میں بڑے غور

سے سننا رہا اور سوال کرتا رہا۔

ایک ماں ایک معصوم

شہانزیں گھنے ٹکڑے تھے۔ میں نے اتنی طویل گفتگو سے یہ نتیجہ نکالا کہ بیٹی کا تار باپ ہی تھا۔ وہ اپنی بیوی کو اکثر کتا تھا کہ اپنی لڑکی کو یا تو موت آجائے یا اسے اپنے ماتحتوں ختم کر دیا جائے۔ دو مرتبہ اس نے کہا تھا کہ میں کوئی ایسا زہر تلاش کرتا ہوں جو اپنا کام بھی کر جائے اور کسی کو شک بھی نہ ہو۔ لڑکی کا گلا باپ نے چار مرتبہ دبایا تھا۔ ان باتوں سے یقین سمجھنے والے لگتا تھا کہ باپ اپنی لڑکی کو قتل کرنے کی ترکیبیں سوچتا رہتا تھا اور ماں رو رو کر پائل ہوتی رہتی تھی۔ وہ اپنی بیٹی کو سمجھاتی سمجھاتی رہتی اور اسے باپ سے بچانے کی کوشش کرتی رہتی تھی۔ مگر مجھے ایسی کوئی مشہادت ہمیں مل رہی تھی جس سے یہ پتہ چلتا کہ کیا باپ کو معلوم تھا کہ لڑکی نکل دنت باہر نکلے گی اور وہ اس کی گھات میں بیٹھا ہوا تھا؟ کام سے تو وہ جلدی آگیا تھا۔ اس نے بیان دیا تھا کہ وہ کرم سنگھ کے ٹھیکے پر چلا گیا تھا۔

کرم سنگھ سے میں نے پوچھا تھا۔ اس نے بتایا تھا کہ اس آدمی کو اس نے اُس وقت ٹھیکے میں بے ہوشی کی حالت میں دیکھا تھا جب سارے گاہک جا چکے تھے اور وہ اکیلا پڑا رہ گیا تھا۔ کرم سنگھ کو بالکل معلوم نہیں تھا کہ وہ اس کے ٹھیکے میں کس وقت داخل ہوا تھا۔ اس سے بھی یہی ظاہر ہوتا تھا کہ وہ بیٹی کو قتل کر کے شراب خانے میں گیا تھا۔ یہ حال یہ شبہ تھا یا یقین، ثبوت کوئی نہیں تھا۔ میرے لئے کوئی وجہ نہیں تھی کہ میں یہ رپورٹ لکھ دوں کہ قاتل نے خودکشی کر لی ہے۔

مقتولہ کی ماں نے نئی بات یہ بتائی کہ پہلے اڈا کو پسند کرتی تھی پھر اس نے قتل سے کچھ دن پہلے ایک اور لڑکے کا نام لینا شروع کر دیا تھا۔ ماں کو وہ کہتی تھی کہ یہ لڑکا بہت ہی شریف ہے۔ ماں نے لڑکے کو دیکھا۔ لڑکی اس سے ملتی رہتی تھی۔ ماں نے لڑکی سے کہا کہ ہم خود بات کرتے اچھے نہیں لگتے۔ لڑکے سے کہو کہ وہ اپنی ماں کو میرے پاس بھیجے لیکن لڑکے کی ماں نہیں آئی۔ اتنے میں لڑکی قتل ہو گئی۔ میں نے مقتولہ کی ماں سے پوچھا کہ یہ بات اس نے پہلے کیوں نہیں بتائی؟ اس نے جواب دیا کہ بات ابھی شروع ہی نہیں ہوئی تھی اس لیے اس نے اس کا ذکر کرنا ہی کیا تھا۔

میں نے سوچا کہ اس لڑکے سے بھی پوچھ گچھ کر لی جائے۔ ہو سکتا ہے اس کے اور اطہر کے درمیان یا مقتولہ کے کسی اور دوست کے ساتھ رقابت چل پڑی ہو اور اس کا شکار لڑکی ہوئی ہو۔ میں نے مقتولہ کی ماں سے اس لڑکے کا نام پوچھا، تو یہ وہی نوجوان نکلا جس کے متعلق مجھے اطہر بنا چکا تھا اور ایک اور آدمی نے بھی بتایا تھا کہ رات اس نے مقتولہ کو اس نوجوان کے ساتھ بغل گیری کی حالت میں دیکھا تھا۔ اس کے متعلق پتہ چلا کہ ایک کارخانے میں رات کی شفٹ میں کام کرتا ہے۔

میں نے اسے ختانے بلوایا۔ وہ بیس بائیس سال کی عمر کا جوان تھا۔ اس کے چہرے پر بچوں کا بھولپن تھا۔ چہرے سے پتہ نہ چلے کی بنا پر میں نے اپنے آپ سے کہا کہ یہ لڑکا قاتل نہیں ہو سکتا قتل ہو سکتا ہے۔ وہ دُرا ہوا مزدور تھا لیکن اس نے بڑے وقت ذرہ بھر جھمک کا مظاہرہ نہیں کیا۔ میں نے اس سے پہلا سوال یہ کیا۔ ”مقتولہ کے ساتھ تمہارے تعلقات کب سے تھے؟“ اس نے سوچ کر جواب دیا۔ ”میرا خیال ہے ابھی ایک ہفتہ پرانے ہوئے تھے۔“ میں نے پوچھا۔ ”قتل کی رات تم کہاں تھے؟“ اس نے جواب دیا۔

”میں درکشاپ میں چلا گیا تھا۔ صبح پتہ چلا کہ زینب قتل ہو گئی ہے۔“
”تمہیں وہ آخری بار کب ملی تھی؟“

”اسی شام۔“ اس نے اعتماد سے جواب دیا۔ ”میں یہ بھی کہہ سکتا ہوں کہ مجھ سے مل کر وہ گھر نہیں جاسکی۔ میں درکشاپ کی طرف چلا گیا تھا اور وہ وہیں کھڑی مجھے کیچتی رہی تھی۔“
”تمہیں معلوم تھا کہ روٹکی کی دوستی کچھ اور مردوں کے ساتھ بھی تھی؟“ میں نے پوچھا۔ ”کبھی ایسا سنا ہے کہ ان میں سے کسی نے تمہیں ڈرا دھمکایا ہو؟“
”مجھے معلوم تھا کہ روٹکی پاک نہیں۔“ اس نے جواب دیا۔ ”پھر بھی میں نے اسے پسند کیا۔“
”کبھی نے کبھی ڈرا دھمکایا نہیں تھا۔“

”روٹکی نے کبھی نہیں بتایا تھا کہ کوئی آدمی، خصوصاً اظہارام کا ایک آدمی اسے دھمکیاں دیتا ہے یا اسے تم سے ملنے سے روکتا ہے؟“
”کبھی ایسی بات نہیں ہوئی تھی۔“ اس نے جواب دیا۔ ”اس روٹکی کے ساتھ میرے تعلقات ویسے نہیں تھے جیسے دوسروں نے اس کے ساتھ رکھے تھے۔ میں نے اسے کہہ دیا تھا کہ میری محبت پاک رہے گی میں اس کے ساتھ شادی کرنا چاہتا تھا۔“

میں نے اس روٹکے سے جس کا نام اکمل تھا، کچھ ایسی باتیں پوچھیں جن کے متعلق میرا خیال تھا کہ وہ نہیں بتائے گا یا جھینب جلے گا لیکن اس نے بلا جھجک ہر ایک بات بتا دی۔ اس سے ظاہر ہوتا تھا کہ اس کے ضمیر پر کوئی بوجھ نہیں اور نہ اسے کوئی خطرہ ہے۔ میں نے سوال کرنے کی بجائے اسے کہا کہ وہ اپنے متعلق، روٹکی کے متعلق اور دیگر تمام باتیں جو اس کے ذہن میں آئیں مجھے سنا دے۔ اس نے اپنی تمام تر زندگی کی جو کما فی سنائی وہ اس کے الفاظ میں اس طرح کہے:

اس نے ہمارے شہر سے کوئی ایک سو دس میل دور کے ایک اور شہر کا نام لے کر کہا۔ ”میں اس شہر میں پیدا ہوا تھا۔ باپ بچپن میں مر گیا تھا۔ مجھے کچھ یاد نہیں کہ میری عمر کیا تھی۔ میری عمر دس سال ہوئی تو ایک روز ایک عورت آئی جسے میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ اس نے آتے ہی مجھے اپنے سینے سے لگا لیا اور منہ چوم چوم کر مجھے پریشان کر دیا۔ میں اُس وقت تیسری جماعت میں پڑھتا تھا۔ یہ عورت آئی تو مجھے بتایا گیا کہ یہ تمہاری ماں ہے اور اب تم اس کے ساتھ رہو گے۔ میں بہت حیران ہوا۔ میں تو اس عورت کو اپنی ماں سمجھتا تھا جس نے مجھے پالا تھا۔ میں نے ہوش اس عورت کی گود میں سنبھالا تھا۔ میرے بعد اس عورت کے دو بچے پیدا ہوئے جنہیں میں اپنے بھائی سمجھتا تھا۔ گھر میں جو آدمی تھا اسے میں آبا کہا کرتا تھا۔ اس عورت کے آنے کے بعد مجھے ان دونوں عورتوں نے پاس بٹھا کر بتایا کہ جس عورت نے مجھے پالا ہے وہ میری خالہ ہے اور یہ عورت بوجا چانک کہیں سے آگئی ہے میری ماں ہے اور میرا باپ اُس وقت مر گیا تھا جب میں ڈیڑھ سال کا تھا۔ یہ معتمد مجھے سمجھ نہ آیا تو میں رو پڑا۔ یہ عورت ہمارے گھر میں رہنے لگی۔ وہ میرے ساتھ باگلوں کی طرح پیار کرتی تھی۔ رات مجھے اپنے ساتھ سلاتی تھی۔ سکول سے چھٹی کے وقت وہ سکول سے باہر کھڑی ہوتی اور میرا ہاتھ اٹھالیتی....

”میں نے تسلیم کر لیا کہ یہ واقعی میری ماں ہے۔ خالہ نے میرے ساتھ اپنا پیار کبھی تمہیں کیا تھا بلکہ میں یہ کہوں گا کہ جب ماں نے مجھے دیوانہ وار پیار کیا تو مجھے محسوس ہوا کہ اس سے پہلے میں پیار سے محروم رہا ہوں۔ یہ بات پیار نے میرے دل میں پکی کر دی کہ یہ عورت میری ماں ہے اور جس نے مجھے پالا ہے وہ خالہ ہے اور اس کا خاندان میرا باپ نہیں۔ میں چونکہ بچہ سمجھتا اس لیے اس کے پیار میں الجھ گیا۔ یہ سوال میرے دماغ میں آیا ہی نہیں کہ ماں سے پوچھوں

کہ وہ آئنا عرصہ کہاں رہی ہے

”میں نے تیسری جماعت پاس کر لی تو ماں مجھے اسی شہر میں اسی طرح کے ایک کچے مکان میں لے گئی جس کا ایک ہی کمرہ تھا۔ ہم غریب لوگ تھے۔ میری خالہ کا خاوند مستری تھا۔ ماں نے ایک گھر میں نوکری کر لی اور مجھے پالنے اور پڑھانے لگی۔ میں بڑا ہونے لگا اور یہ سوال میرے دماغ میں ابھرتا گیا کہ ماں آئنا عرصہ کہاں رہی مگر پوچھنے کی معلوم نہیں کیوں جرأت نہیں ہوتی تھی۔ ماں سوائے پیار کے اور کوئی بات کرتی ہی نہیں تھی۔ میں نے ایک بار اس سے اپنے باپ کے متعلق پوچھا تو اس نے حقارت سے جواب دیا۔ ”اس مردود کا نام نہ لو۔ بہت برا آدمی تھا۔ اچھا ہوا کہ مر گیا۔ زندہ ہوتا تو ہم دونوں کو مارتا پٹیتا ہی رہتا۔“ اس کے بعد بھی اس نے میرے باپ کے متعلق ایسی ہی بُری بُری باتیں سنا کر میرے دل سے باپ کی یاد نکال دی

”میں نے آٹھ جماعتیں پاس کر لیں تو ماں نے مجھے خالہ کے حوالے کر دیا۔ اس نے مجھے اس درکشاپ میں جہاں وہ ملازم تھا مجھے موٹر کینک کا کام سکھانا شروع کر دیا۔ مجھے کوئی تنخواہ نہیں ملتی تھی۔ دو سال بعد مجھے آٹھ آنے روز ملنے لگے۔ یہ تنخواہ مجھے ایک سال ملتی رہی۔ میری عمر بیس سال ہو چکی تھی۔ ایک روز میری خالہ اور اس کا خاوند ملے گھر آئے۔ ماں نے مجھے کسی کام سے باہر بھیج دیا۔ میں جب واپس آیا تو خالہ نے مجھے کہا کہ کل درکشاپ میں نہ آنا۔ میں تمہیں اور جگہ نوکری دلانا چاہوں گی۔ میں نے دھڑپوچھی تو مجھے ٹالنے کے لیے ایسی وجہ بتائی گئی جو میری سمجھ میں نہ آئی۔“

میں اس نوجوان کی اتنی لمبی کہانی نہیں سننا چاہتا تھا۔ میں نے اسے کہا تھا کہ اپنے متعلق اور لوگ کے متعلق کچھ بتاؤ۔ اس نے اتنی لمبی کہانی شروع کر دی۔ میں نے اسے روکا

نہیں۔ اتنا ضرور کہوں گا کہ اس لڑکے نے مجھے کچھ متاثر کر لیا تھا ورنہ ہم مشتبه افراد سے جنہیں ہم شایمل تقبیل کرتے ہیں صرف وہ باتیں پوچھتے ہیں جو نہایت ضروری ہوتی ہیں۔ ہم لڑنے کا موقع صرف اسے دیتے ہیں جس کے سینے سے کوئی بات نکلوانی ہوتی ہے۔ اس لڑکے نے پیدائش سے اپنی کہانی شروع کر دی۔ میرے دل میں آئی کہ اسے روک دوں اور اپنے مطلب کی بات پر لے آؤں لیکن اس نے جب اپنی ماں کے متعلق بتایا کہ وہ آئنا عرصہ بعد چائیک آگئی اور اس بچے کو قہقہے میں کر لیا اور بچے کے باپ کے خلاف بچے کے دل میں نفرت پیدا کی تو میرے اندر پولیس مین کا تجسس بیدار ہو گیا۔ میں یہ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ یہ عورت اس کی ماں ہی تھی یا یہ کوئی فریڈ تھا۔ اس کے علاوہ مسلسل تقبیل کرتے کرتے میرا دماغ تنگ کیا تھا اس لیے بھی میں نے سوچا کہ جیلو، یہی کہانی سن لو، دلچسپ معلوم ہوتی ہے۔ یہ تو مجھے بعد میں پتہ چلا کہ یہ نوجوان میرے لیے رحمت کا فرستہ ہے۔

اس نے کچھ اور باتیں سنا کر کہا۔ ”ماں مجھے یہاں لے آئی۔ خالو بھی ساتھ آیا تھا۔ یہاں درکشاپ میں مجھے اسی نے ملازمت دلائی اور اس آبادی میں ایک کمرے کا ایک مکان کرائے پر لے دیا پھر وہ چلا گیا۔ ہم یہاں سات آٹھ مہینوں سے رہ رہے ہیں۔ پیچھے ڈیڑھ مہینے سے میں رات کی پہلی شفٹ میں کام کرتا ہوں۔“

”ماں نے تمہیں ابھی تک نہیں بتایا کہ وہ تمہاری دس سال کی عمر تک کہاں رہی؟“

میں نے پوچھا۔

”ماں ایک روز میں اس کے پیچھے پڑ گیا تو اس نے بتایا کہ وہ کسی اور شہر میں رہتے تھے جہاں میرا باپ مر گیا۔ مکان پر میرے ایک چچا نے قبضہ کر لیا۔ میری ماں نے مجھے خالہ

کھلے بندوں باہر جاتی اور میرا انتظار کرتی تھی اور میں ماں کے ڈر سے کھلے بندوں باہر نہیں نکل سکتا تھا۔ سارا دن چھٹی ہوتی تھی۔ میں باہر نکلنا چاہوں تو میری ماں کی کوشش یہ ہوتی تھی کہ میں باہر نہ نکلوں۔ اگر وہ غصے یا حکم سے زد کرتی تو میں باغی ہو جاتا۔ وہ مجھے پیار سے روکتی تھی۔ میں منہ کول تو روٹنے لگتی تھی، باہر جانے کے لیے وہ میرا صرٹ ایک ہانہ مان لیتی ہے۔ یہ سہ سینما۔ میں اسے کہتا ہوں، ماں رات کو میں کام کرتا ہوں، دل اچاٹ ہو جاتا ہے۔ سینما دیکھنے سے دل بہل جاتا ہے۔ وہ مجھے پیسے دیتی ہے اور یہ ہدایت مزدور دیتی ہے کہ بیٹا، سڑک سے ہٹ کر چلتا۔ آگے پیچھے دیکھ کر چلتا۔ جو کہ میرا یہ ہانہ ماں کے لیے قابل قبول تھا۔ اس لیے تین سے ساڑھے چھ بجے تک میں سینما کے بہانے سے زینب کے ساتھ وقت گزار لیا کرتا تھا لیکن ایسی ملاقاتیں صرف تین ہوتیں۔ وہ دلیر لڑکی تھی۔ جہاں کہتا وہاں پہنچ جاتی تھی۔۔۔۔

مقتولہ محبت کی قیمت دیتی رہی

”ایسی ہی لمبی ملاقاتوں میں اس نے میرے ساتھ دل کی باتیں کیں۔ وہ آن پڑھ لڑکی تھی اور ایک غریب باپ کی بیٹی۔ اس کا بچپن غربت اور فاقوں میں گزرا۔ اس کا باپ سارا دن مزدوری کرتا اور بڑی مشکل سے دو وقت کی روٹی پوری ہوتی تھی۔ کچھ عرصے سے اُس نے باورچی کا کام سیکھ لیا تھا۔ اس سے بڑا ایک بھائی تھا۔ وہ مر گیا۔ اس سے چھوٹا بھائی بھی مر گیا۔ پھر ایک بھائی پیدا ہوا وہ بھی مر گیا۔ صرف یہ لڑکی بچی اور جوان ہوئی۔ ماں اس سے کچھ پیار کرتی تھی، باپ اسے منحوس سمجھتا تھا۔ زینب نے مجھے بتایا تھا کہ باپ اس کے ساتھ کسی کمی دن بات ہی نہیں کرتا تھا۔ اس نے کئی مرتبہ کہا تھا کہ

کے حوالے کر دیا اور خود محنت مزدوری کر کے میرے لیے خرچ بھیج رہی۔ مگر میری تسلی نہ ہوئی۔ وہ کبھی نہ آتی اور مجھے دیکھ جاتی۔ اس سے پہلے وہ مجھے دیکھنے کبھی بھی نہیں آئی تھی۔ میں نے اس پر زور نہیں دیا کہ مجھے مزدور بنائے۔ اس کے پیار کا اثر ایسا ہے کہ میں اس سے پولی باتیں پوچھ کر اسے پریشان نہیں کرنا چاہتا۔ آپ جب تک اسے دیکھ نہ لیں یہ نہیں جان سکتے کہ مجھے کس طرح چاہتی ہے۔ کئی بار مجھے شک ہوا کہ یہ عورت پاگل ہے بلکہ میں یہ بھی کہہ سکتا ہوں کہ مجھے اس عورت نے اپنے پیار کا قیدی بنا رکھا ہے۔ مجھے اس قیدی میں لطف آتا ہے۔۔۔۔

”اس دوران زینب (مقتولہ) کے چہرے سے کہ دوستی کرنے کی عادی ہے اور بدنام لڑکی ہے۔ میں اسے دیکھتا کرتا تھا۔ بدنام ہونے کے باوجود وہ مجھے اچھی لگتی تھی۔ کچھ عرصہ وہ مجھے دیکھتی اور میں اسے دیکھتا رہا۔ ایک بار وہ مجھے دیکھ کر مسکرائی۔ یہ تقریباً ایک مہینہ پہلے کی بات ہے۔ اس کی مسکراہٹ نے میرا حوصلہ بڑھایا۔ ہم فوراً ملے اور ہمارا تعلق گہرا ہو گیا۔ میں آپ کو بتا چکا ہوں کہ ہماری محبت پاک تھی۔ یقین کریں کہ اس لڑکی نے مجھے کبھی اشتعال سے بھی بدی کی طرف مائل نہیں کیا۔ میں شام ساڑھے سات بجے گھر سے نکلتا ہوں اور تین بارہ بجے درکشاپ سے آتا ہوں۔ وہ جس جگہ قتل ہوئی ہے وہاں شام کو میرا انتظار کیا کرتا تھی۔ میں تھوڑی سی دیر اس کے پاس رک کر درکشاپ چلا جایا کرتا تھا۔۔۔۔

”ہم نے فوراً فیصلہ کر لیا کہ شادی کریں گے۔ ذراصل میں بدی کے صرف نام سے واقف تھا۔ ماں نے میرے اندر صرف پیار بھرا تھا۔ میرے پاس پیار تھا۔ سچا پیار جس میں غلوں تھا۔ یہاں لڑکی کو پہلی بار ملا تھا۔ یہاں ایک معاملہ الٹا تھا۔ ہوتا یہ ہے کہ لڑکیوں کو باہر نکلتے اور لڑکوں سے ملنے کی اجازت نہیں ہوتی۔ ان پر پابندی عائد ہوتی ہے مگر یہاں عالم یہ تھا کہ لڑکا

کر بالکل خاموش رہتی ہے۔ پڑوسیوں کے ساتھ اس کا میل جول نہیں کہیں کوئی مرجائے کسی کی شادی ہو، میری ماں کسی کے ہاں نہیں جاتی۔ اس کی ساری دنیا صرف میں ہوں۔ زینب ہمارے گھرائی تو ان سے اس کی طرف کوئی خاص توجہ نہ دی۔ زینب میرے ساتھ بائیں کمرے لگی اور میں اس کے ساتھ بائیں میں لگن سو گیا۔ اچانک ماں نے غصے سے کہا: اکل اتم اندر جا کے بیٹھو۔ میں اندر بلا گیا۔ زینب نے میری ماں کے ساتھ کوئی بات شرمیلی کی تو ماں نے اسے کہا: تم جلد لڑکی، یہاں نہ آیا کرو۔ مجھے یقین ہو گیا کہ ماں کو بالکل علم نہیں تھا کہ زینب کیسی لڑکی ہے۔ میں نے ماں سے کہا کہ وہ تمہیں ملنے آئی تھی اور تم نے اس کے ساتھ بات ہی نہیں کی بلکہ اسے گھر سے نکال دیا۔ وہ بڑی اچھی لڑکی ہے۔ ماں نے چونک کر مجھ سے پوچھا: تم کس طرح جانتے ہو کہ وہ اچھی لڑکی ہے؟ تم اسے ملے رہے ہو اسی لیے وہ تمہارے ساتھ بے تکلفی سے باتیں کرتی تھی۔ میں نے ماں کو بتا دیا کہ میں اسے اچھی طرح جانتا ہوں اور میں اس کے ساتھ شادی کرنا چاہتا ہوں۔۔۔

”ماں کتنی ہی دیر مجھے چپ چاپ کھینچی رہی۔ میں نے دیکھا کہ اس کے چہرے کا رنگ بدل گیا تھا۔ میں نے اسے اس حالت میں کبھی نہیں دیکھا تھا۔ وہ تو پیار کا مجسمہ تھی مگر اس کے چہرے سے وہ رنگ ہی اڑ گیا جس میں پیار ہوتا ہے۔ اس نے آہ بھری اور پرے سے چلی گئی۔ میں کچھ بھی نہ سمجھ سکا۔ میں شام کو کام پر جانے لگا تو ان سے مجھے کہا: آؤ نہ تم نہیں لڑکی سے نہیں مل سکتے۔ مجھے شک ہوا کہ ماں کو پتہ چل گیا ہے کہ لڑکی بڑا نام ہے۔ میں نے کہا کہ ماں، یہ بڑی اچھی لڑکی ہے۔ ماں نے مجھے بولنے دیا۔ حکم کے لیے میں بولی۔ مجھے بالکل پتہ نہیں کہ وہ کیسی لڑکی ہے۔ میں یہ کہہ رہی ہوں کہ تم کسی بھی لڑکی سے نہیں مل سکتے۔ تمہاری شادی کا فیصلہ میں کروں گی۔ تم فیصلہ نہیں کر سکتے۔۔۔

لڑکوں کی جگہ یہ مرجاتی تو اچھا تھا۔ وہ بچپن کی باتیں سنایا کرتی تھی۔ جب باپ اسے ملتا پلٹا رہتا تھا۔ ایک روز اس نے مجھے سنایا: میں گھر سے باہر خوش رہا کرتی تھی۔ جب جوان ہوئے لگی تو مجھے لڑکے زیادہ اچھے لگنے لگے۔ وہ محبت کی باتیں کرتے تھے اور میں محبت کی پیاسی تھی۔ اس پیاس نے مجھے ذلیل کر کے رکھ دیا۔ میں ہر کسی کے دھوکے میں آجاتی تھی۔ میں محبت کی قیمت دینے کے لیے اپنا جسم پیش کر دیا کرتی تھی۔ باپ کو پتہ چل گیا۔ اس نے کئی بار میرا گلا گھونٹ دیا۔ کبھی ماں چھڑا دیتی تھی اور کبھی پڑوسی۔ اگر مجھے یہی محبت باپ سے مل جاتی تو میں اس طرح گمراہ اور خوار نہ ہوتی۔۔۔

”مجھ سے اسے وہ محبت مل گئی جو اسے باپ سے نہیں مل سکی تھی۔ اس نے پاک اور ناپاک میں فرق دیکھ لیا تو اسے اُن آدمیوں سے نفرت ہو گئی جو اس کے جسم کے ساتھ کھیلے رہے تھے۔ وہ میرے پاس بیٹھ کر رہا کرتی تھی۔ جناب، میں یہ دعویٰ نہیں کرنا کہ میں نیک انسان ہوں۔ بات یہ تھی کہ میرے سینے میں ماں کا پیار تھا جو میں نے زینب کو دیا۔ میں نے جب اسے کہا کہ میں تمہارے ساتھ شادی کروں گا تو اس نے پوچھا: ”یہ جانتے ہوئے کہ میں گناہگار اور ذلیل ہوں، تم مجھ سے شادی کر لو گے؟“ میں نہیں سمجھ سکتا کہ میں نے نیکی کی خاطر اسے جواب دیا کہ تم جیسی کسی بھی ہو میں تم سے شادی کر دوں گا یا اس لئے کہ وہ مجھے بہت اچھی لگتی تھی۔ میں نے اسے کہا کہ تم اپنی ماں سے کہو کہ میری ماں سے ملے اور بات کرے۔ ایک روز اس نے مجھے کہا کہ اس نے اپنی ماں سے بات کی ہے اور ماں نے کہا ہے کہ تم اپنی ماں سے کہو کہ ہم سے رشتہ نہ لگے۔ دراصل دستور تو یہی ہے میں نے زینب سے کہا کہ تم میری ماں سے بھی ملا کر دنا کہ وہ تمہیں پسند کرنے لگے۔۔۔۔

”وہ دوسرے ہی دن میری موجودگی میں ہمارے گھر آئی۔ میری ماں کی یہ عادت ہے

ہے۔ تم اسے ملتے رہتے ہو۔ میں نے کہہ دیا کہ ہاں۔ میں اسے ملتا رہتا ہوں۔ میں نے دیکھا کہ ماں چپ تو پہلے بھی رہتی تھی مگر تین پاروں سے وہ کھوٹی کھوٹی سی رہنے لگی تھی۔ کبھی ایسے نظر آتا جیسے وہ گری سوچ میں غرق ہے۔۔۔۔

”میں نے آپ کو اپنی ماں کے متعلق اس لیے یہ باتیں سنائی ہیں کہ وہ میرے راستے میں رکاوٹ نہ ڈالتی تو میں زینب کے ساتھ شادی کر لیتا۔ پھر وہ شاید قتل نہ ہوتی۔ وہ جس رات قتل ہوئی اس شام مجھے ملی تھی۔ اس نے رزوکہ کا تھا کہ ماں کو شادی کے لیے مجبور کر دے۔ میں نے اسے تسلی دی تھی اور کہا تھا کہ میری ماں کے پاس جاتی رہا کرو اور اس کے ساتھ غصے سے نہ بولا کرو۔ اس کے دل پر قبضہ کرنے کی کوشش کرو۔ مگر موت نے اسے بہت نہ دی۔“

یہ بڑا کا بڑا چلا جا رہا تھا۔ اس کی کہانی جذباتی لحاظ سے تو سننے کے قابل تھی لیکن میری تفتیش میں کوئی مدد نہیں دے سکتی تھی۔ یہ بڑا کا میرے لیے بالکل بیکار تھا۔ اس نے جھوٹا بیان نہیں دیا تھا۔ اس پر جرح کر کے میں وقت ضائع نہیں کرنا چاہتا تھا۔ میں اب اس انتظار میں تھا کہ اس کی کہانی ختم ہو تو اسے رخصت کروں۔ اتنے میں بڑا دے میں مجھے ایک کانسٹیبل کی آواز سنائی دی۔ اس نے کسی عورت سے کہا تھا۔ ”اوائی، اندر نہ جانا ادھر آ کیا بات ہے۔“ اس کے بعد ایک عورت کی آواز آئی۔ ”مجھے کسی نے بتایا ہے کہ میرے بیٹے کو قتل کیا گیا ہے۔ اسے دیکھنے آئی ہوں۔“

اکل نے کہا۔ ”یہ میری ماں کی آواز ہے۔ میں گھر سے باہر کھڑا تھا جب آپ کا سپاہی مجھے بلانے گیا تھا۔ میں ماں کو بتائے بغیر آ گیا تھا۔ اسے اب کسی نے بتایا ہوگا کہ مجھے پولیس لے گئی ہے۔“ مجھے اس لڑکے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ بلا مقصد میرا وقت ضائع کر لیتا تھا۔ میں اس کے عشق و محبت کی کہانی اس لیے قتل سے سننا رہا تھا کہ شاید کوئی اشارہ

”میں چپ چاپ باہر نکل گیا۔ میں ماں کا حکم ٹال نہیں سکتا تھا مگر زینب کو بھی نہیں چھوڑ سکتا تھا۔ میں اسے ملتا رہا۔ ایک روز میں نے سینا جانے کا ہمانہ کیا تو ماں نے اجازت نہ دی۔ اس سے پہلے اس نے کبھی نہیں رد کا تھا۔ مجھے غصے آ گیا۔ میں نے کہا، ”ماں، میں اب بچہ نہیں ہوں۔ میں جا رہا ہوں۔“ اور میں چلا گیا۔ زینب کو میں نے ایک جگہ بتا رکھی تھی، وہ آگئی اور ہم چہرے تک باتیں کرتے رہے۔ گھر آیا تو ماں نے کچھ بھی نہ کہا لیکن اس کا رویہ بدلا ہوا تھا۔۔۔۔

یہ ماں قاتل نہیں ہو سکتی

”ایک روز میرے کہنے پر زینب کی ماں میری ماں کے پاس آئی۔ میں گھر تھا۔ زینب کی ماں نے اپنا تعارف کرایا تو میری ماں نے کہا۔ ”اپنی بیٹی سے کہہ دینا کہ میرے لڑکے سے نہ ملا کرے۔ میں یہ شادی نہیں ہونے دوں گی۔“ وہ بے چسپاری پر نشان سہی ہو کر چلی گئی۔ مجھ سے رہا نہ گیا۔ میں ماں پر برس پڑا۔ اس سے پہلے میں ماں سے ایسی بدتمیزی سے کبھی نہیں بولا تھا۔ میں نے ماں کو یہ بھی کہا۔ ”میں تمہارا تئیدی نہیں ہوں۔ مجھے اس طرح زنجیریں نہ ڈالو۔“ اس نے نہایت آہستہ سے کہا، ”تم اسی نامور کے بیٹے ہو۔ اس نے سبھی اسی طرح ضد کی تھی کہ تم مانو نہ مانو میں دوسری شادی کروں گا۔ اس نے بھی یہی کہا تھا کہ میں تمہارا تئیدی نہیں ہوں۔“ پھر ماں رونے لگی۔۔۔۔

”میری زبان بند ہو گئی۔ میں سوچ میں پڑ گیا کہ ماں نے میرے باپ کے متعلق یہ کیا بات کہی ہے۔ دوسرے دن میں نے اس سے پوچھا تو اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ ایک رات میں کام سے واپس آیا ماماں نے کہا کہ وہ لڑکی میرے پاس آئی تھی اور بہت بدتمیزی کر گئی

بعض اذونات واردات سے تلم پر سے اٹھا دیا کرتی ہے۔ کوٹ، فیض، یا جیسی سے گرا ہوا
بٹن ان بٹن غریبہ ام سی چیزوں میں خاص طور پر شامل ہے جو جائے واردات پر پڑی مل جایا
کرتی ہیں۔ اگر تفتیش کرنے والا پولیس افسر دانش مند ہو تو ایسی غیر اہم چیزوں سے بہت
کام لے سکتا ہے۔

اکمل کی ماں کے ہاتھوں پر گہری اور لمبی خراشیں اور کرتے کا ادھر کا بٹن دوسرے
بٹنوں سے مختلف دیکھ کر میرے ذہن میں پہلا خیال یہ آیا۔ ”کیا یہ عورت قتل کر سکتی ہے؟
اگر اس نے لڑکی کو قتل کیا ہی ہے تو اس کا باعث فوری اشتعال ہی ہو سکتا ہے۔ وہ اشتعال
کیا ہے؟“ اکل اسے کندھوں سے پکڑ کر نیچے ہٹا رہا تھا اور میرا دلخ آٹا پیسے دلی شین
کی طرح چل رہا تھا میں نے اکل سے کہا۔ ”تم ذرا باہر جا کے بیٹھو۔ میں اسے تسلی دیتا ہوں
کہیں نے تمہیں حراست میں نہیں لیا اور نہ لوں گا۔ تم باہر چلے جاؤ۔“

اکمل باہر نکل گیا۔ میں نے اس کی ماں کو پاس پڑے ہوئے بیچ پر بٹھا دیا اور میں سوچنے
لگا کہ اس عورت سے کوئی ہیبر چھین کر دل اور سیدھا ہی کہہ دوں کہ تم قاتل ہو۔ پھر خیال آیا
کہ وہ چوکس ہو کر مجھے گمراہ کر دے گی۔ یہ دیکھنے کے لئے کہ وہ کتنی ہوشیار، چالاک اور
حاضر جواب ہے، میں نے اس کے ساتھ اکل کے متعلق باتیں شروع کر دیں۔ قتل کے
متعلق کوئی بات نہ کی۔ میں نے اس سے کئی باتیں پوچھیں۔ اس نے بالکل مختصر اور
ادھر سے جواب دیئے۔ میں نے اس سے پوچھا۔ ”تم جوانی میں بویہ ہر گئی تھی۔
دوسری شادی کیوں نہ کی؟“

”اس بچے کی خاطر“ اس نے صرٹ اتنا سا جواب دیا۔

”یہ بچہ کتنی عمر میں اپنی بہن کے حوالے کیا تھا؟“

تفتیش کے کام کا نکل آئے۔ میں نے اسے کہا۔ ”تم چلے جاؤ۔ ماں کو تسلی دلو اور ادھر
ادھر کی باتیں سننے رہنا۔ زینب کے قتل کے متعلق کوئی معمولی سی بات سنو تو وہ بھی مجھے
بتا دینا۔“

میں نے ابھی بات پوری نہیں کی تھی کہ اس کی ماں کا ٹیبل کے رد کرنے کے باوجود
میرے دفتر کے دروازے میں آگئی۔ اس نے اپنے بیٹے کو میرے کمرے میں بیٹھ دیکھا، تو
اس نے ہاتھ جوڑ کر کہا۔ ”مجھ سے کوئی سی قسم لے لو وارد نہ رہی امیرے بچے کا اس کتنی
کے ساتھ کوئی تعلق نہیں تھا۔ یہ کسی کو کیا قتل کرے گا۔ اسے اتنا بڑا نہ سمجھو۔ یہ تو دودھ
پیتے بچوں سے زیادہ بھولا ہے۔ اسے چھوڑ دو۔ یہ میرا ایک ہی بچہ ہے۔“ وہ اندر میرے
قریب آگئی۔ اکل اسے رد کرنے کے لئے اٹھا میں اسے کہنے ہی لگا تھا کہ تمہارے بیٹے کو
میں نے چھوڑ دیا ہے مگر اس نے مجھے بونے کی مہلت ہی نہ دی۔ اس نے سر سے درپٹ
آٹا اور کرسی کے قریب فرش پر چھٹیک دیا اور دونوں ہاتھ میرے اس ہاتھ پر رکھ دیئے؟
میز پر رکھا ہوا تھا۔ مجھے اس کی یہ حرکت اچھی نہ لگی۔

میں نے اس کے ہاتھ اپنے ہاتھ سے ہٹانے کے لیے ہاتھوں پر نگاہ کی تو میں یک
کڑی بچے ہٹ گیا۔ اس کے ایک ہاتھ کی اٹنی ٹرٹ پر تین اور دوسرے پر دو گہری خراشیں
تھیں۔ لمبائی ڈیڑھ ڈیڑھ انچ ہوگی۔ ان پر خون جما ہوا اور دیر پر مرہم لگا ہوا تھا۔ اس
عورت نے گزرتے پہن رکھا تھا۔ میں نے فوراً کرتے کے بٹن دیکھے۔ اس کے تین بٹن
تھے۔ نیچے والے دو پرانے اور اوپر والا نیا اور دوسروں سے مختلف تھا میں نے میز کی
دروازے سے وہ پڑا نکالی جس میں میں نے وہ بٹن لپیٹ رکھا تھا جو مقتولہ کی لاش کے قریب
پڑا تھا۔ میں نے وہ بٹن اس لئے اٹھا لیا تھا کہ جائے واردات سے ملی ہوئی ایک کنکری؟

کرنے والے اور تڑکی بہ ترکی جواب دیتے والے مزدوری نہیں کر چالاک اور ہر شیر بھی
ہوں۔ یہ عورت احق مزدور تھی مگر مجھے اس سے عجیب سی بُرائی تھی۔ میں نے ہاتھ اُسکے
کر کے اس کے کرتے کے اوپر والے بٹن پر رکھا اور بٹن کھول دیا۔ اس نے بھی کی نیازی
سے دونوں ہاتھوں سے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ میرا ہاتھ پڑے ہٹا کر بٹن باندھنے لگی۔ اس
کا نہ کھل گیا تھا۔ میں جو کچھ دیکھنا چاہتا تھا وہ مجھے نظر آ گیا تھا۔ بٹن دھاگے کی مزدوری
کی وجہ سے نہیں گرا تھا بلکہ وہاں سے گرتے اتنی زور سے کھینچا گیا تھا کہ بٹن کے
قریب سے گرتے پھٹ گیا تھا۔

اس نے بٹن بند کر لیا اور چٹنی چھٹی نظروں سے مجھ دیکھنے لگی۔ پھر اس نے یہ
حرکت کی کہ چونک کر اپنے ہاتھوں کو دیکھا اور دونوں ہاتھ دوپٹے کے اندر کر لیے۔
پولیس تمام مشتبه افراد یا ہر قسم کے ملزم کے ساتھ ایک جیسا برتاؤ نہیں کرتی۔ کم از
کم میرا طریقہ رفقہ و شفقت پسندانہ تھا کہ ملزم کی نفسیاتی کمزوریوں کو سمجھ کر ان کے مطابق پوچھ
گچھ کیا کرتا تھا۔ یہ عورت جس قسم کی تھی اس قسم کو میں اچھی طرح سمجھتا تھا جس طرح
اس پر خاموشی طاری ہو گئی تھی اسی طرح میں نے اپنے اوپر خاموشی طاری کر لی اور
اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھنے لگا۔ وہ جیت بن گئی تھی۔ میں اسے دیکھتا رہا
اور اس کی آنکھیں کھلتی چلی گئیں۔ وہ واقعی احق تھی۔ اس نے بٹن کو جھپایا تھا اور پلٹے
ہاتھوں کو بھی جھپایا تھا میرا دل مان نہیں رہا تھا کہ اس عورت نے قتل کیا ہو گا۔ کوئی وجہ
میرے دماغ میں نہیں آ رہی تھی۔ وہ اٹھنے لگی اور بولی "میں جا رہی ہوں"

"بیٹھی رہو" میں نے اُسکے جھک کر دبی آواز میں کہا "اگر اپنے بیٹے کو
مزلے موت سے بچانا چاہتی ہو تو قتل کا انبیا کرو"

"خیر پڑھ پڑھنے در سال کا تھا"

"اسے ہن سے کتنی عمر میں لیا؟"

"تو سال کا ہو گیا تھا"

"سات آٹھ سال کہاں رہی؟"

"محنت مزدوری کرتی رہی"

"کہاں؟"

وہ ہکھلانے لگی۔ گہرا لگی پھر بولی۔ "فیض آباد"

"ڈگری کیا تھی؟"

"گھروں میں کام کرتی تھی"

"دودھ پیتے بچے کو ساتھ کیوں نہ رکھا؟"

وہ ہر سوال کا جواب فوراً نہیں دیتی تھی۔ سب سے پہلی تھی۔ ایک لفظ کہہ کر اسے منہ میں چبا

جاتی اور پھر جواب مکمل کرتی تھی اور اس کے لیے میں رشتہ ساتھا جیسے اسے اپنے آپ پر

اعتماد نہیں۔ میں اس کے انداز اور لہجے کو بہت غور سے دیکھ رہا تھا۔ میں نے جب پوچھا

کہ دودھ پیتے بچے کو ساتھ کیوں نہ رکھا؟ تو اس نے کوئی جواب نہیں دیا بلکہ میرے منہ کی طرف

دیکھتی رہی۔ اس حالت میں وہ بالکل احق رہی تھی۔ میں نے ایک اور سوال کیا۔ "اتنا

عرصہ بچے سے ملنے کیوں نہ آئی؟ سات آٹھ سال بعد بچے کی محبت اچانک جاگ اٹھی تھی؟"

وہ میرے منہ کی طرف دیکھتی رہی اور اس کے آنسو بہنے لگے۔ اس کا یہ انداز ایک

پولیس انسٹرکٹر کو یاد کرنے پر آسانا تھا۔ پولیس انسٹرکٹر کے لیے انسانی نفسیات کو سمجھنا بہت

مزدوری ہوتا ہے۔ احق نظر آنے والے لوگ مزدوری نہیں کر احق ہی ہوں اور نیز تیز باتیں

ایں۔ قتل ایک ایسا جرم ہے جس میں اپنی جان خطرے میں ہوتی ہے۔ چھانسی سانسے نظر آتی ہے۔ اس غوث کے ساتھ مقتول کا خون کوئی قاتل بھٹم نہیں کر سکتا۔ قاتل اگر عدالت سے بری ہو جائے تو بھی جین سے زندگی نہیں گزار سکتا۔ یہ عورت تو بالکل سیدھی اور احق تھی۔ اسے میں نے کہا کہ چھوڑو دل کا تو وہ میرے منہ کی طرف دیکھتی رہی۔

”پھر آپ میرے بیٹے کو بھی چھوڑ دیں گے؟“ اس نے پوچھا۔

”دونوں کو چھوڑ دوں گا۔“

”نہیں۔“ اس نے نہایت دھیمی آواز میں کہا۔ ”پولیس کا کوئی بھروسہ نہیں۔ میں دھوکا کھا چکی ہوں۔“

”کب؟“ میں نے فوراً پوچھا۔ ”کس نے دھوکا دیا تھا؟“

خون اسی عورت کا تھا

میں نے یہ سوال پوچھ کر سخت غلطی کی۔ وہ میرے سوال سے اپنے آپ میں آگئی۔ اس کا ذہن بیدار ہو گیا۔ مجھے چاہئے تھا کہ بھولا بنا رہتا اور اس پر جو ذہنی کیفیت طاری ہو گئی تھی اسے ختم نہ ہونے دیتا۔ میں نے غلط وقت پر سوال کر کے اسے جکادیا تھا۔۔۔

تفتیش میں یہی غلطی ہوتی ہے کہ بعض اوقات مرت ایک لفظ یا ذرا سا ایک سوال پتھر جیسے جرم کے منہ سے نکل کر اسے ریت کا ڈھیر بنا دیتا ہے اور کبھی تفتیش کرنے والے انسٹر کے منہ سے نکل جاتا ہے اور جرم اپنا دفاع اتنا مضبوط کر لیتا ہے کہ اس پر فرد جرم بھی عائد نہیں ہو سکتی۔ کچھ ایسی غلطی میں یہاں کر بیٹھا۔ عورت نے قدم جمالیے جس سے مجھے یہ علم ہو گیا کہ اس نے کسی راز پر پردہ ڈال لیا ہے۔ اس نے جب کہا۔ ”پولیس کا کوئی بھروسہ

”میرے بیٹے کو؟۔۔۔ اس نے غوث زدہ ہو کر سرگوشی میں کہا۔ ”سزا سزا موت! کیوں؟۔۔۔ وہ بیکونٹ بلند آواز سے بولی۔“ نہیں۔ نہیں۔ داروغہ جی، وہ بے تصور ہے۔ اسے قتل کا کچھ علم نہیں۔“

”پھر نہیں علم ہوگا۔“ میں نے کہا۔ ”قاتل اس مکان میں ہے جس میں تم رہتی ہو۔ قاتل تم ہو یا تمہارا بیٹا۔“

اس کے ہونٹ کا پینے لگے اور اس کے چہرے سے پسینہ پھوٹ آیا۔ وہ رونے لگی اکل کی کہانی میرے دماغ میں آگئی۔ میں خوش ہوا کہ اس لڑکے کو بولنے کا موقع دیا تھا اور اس نے ساری ہی باتیں اگل دی تھیں۔ مجھے یہ عورت نیم پاگل اور مشکوک نظر آنے لگی۔ میں نے اسے کہا۔ ”کہ دو کہ میں نے اس لڑکی کو قتل نہیں کیا۔“

اس نے بڑی آہستہ آہستہ کہا۔ ”میں کہ دوں کہ میں نے اس لڑکی کو قتل نہیں کیا؟“

”ہاں۔ ہاں۔“ میں نے کہا۔ ”کہ دو کہ میں نے اس لڑکی کو قتل نہیں کیا اور لڑکی نے اپنی گردن چھڑانے کے لیے میرے ہاتھوں پر ناخن نہیں مارے اور میرا بٹن نہیں توڑا تھا۔“

اس کا رنگ سنبھلنے لگا اور اس کا منہ اور زیادہ کھل گیا۔ میں نے کہا۔ ”اتوار کر لیا انکار کر دو۔“

”انکار کر دوں؟“ اس کے کھلے ہوئے منہ سے آواز آئی۔

”ہاں۔ ہاں۔“ میں نے بڑے پیار سے کہا۔ ”انکار کر دو۔“

”پھر آپ مجھے چھوڑ دیں گے؟“

”چھوڑ دوں گا۔“ اب تو میں اس کی نفسیات کے ساتھ کھیل رہا تھا۔ کوئی شک رہا ہی نہیں تھا۔ وہ اس مرحلے میں آچکی تھی جہاں پیشہ ور قاتل بھی سوچنے سے عاری ہو جاتے

کہا ہے، اسے رات کو کون کھلائے گا۔ وہ اکیلا گھر میں ڈرتا ہوگا۔ میں نے اس کے اس پگل پن سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی تو اس نے میرے ہر سوال کا جواب ہی دیا۔ جب تک میرے بچے کو سامنے نہیں لاؤ گے کوئی بات نہیں کروں گی۔

اس دوران اسے اپنی ایک چھٹی کے ساتھ سرکاری ہسپتال بھیج دیا۔ میں نے ڈاکٹر کو پورٹ مارٹم کا حوالہ دے کر کہا کہ اس عورت کا خون مقتولہ کے خون کی ریویٹ کے مطابق ٹیٹ لیا جائے۔ سرکاری ہسپتال سے رپورٹ آئی کہ یہ اسی گروپ کا خون ہے جو مقتولہ کی انگلیوں کے ساتھ لگا ہوا تھا۔

اسے ہم نے وہ دن، رات، اگلا دن اور اگلی رات بڑی مشکل سے سنبھالا۔ اسے ایس۔ آئی شام سے دس بجے واپس آگیا۔ اتنا زیادہ وقت لگانے کی وجہ یہ تھی کہ اسے دو جگہوں پر جانا پڑا تھا۔ وہ ایسی خبر لیا جس نے میرا دل غرور میں نے اکل کو مال سے الگ رکھا اور اپنے سات سے کہا کہ اس کی ماں کو پتہ نہ چلنے دیا جائے کہ اس کا بیٹا آگیا ہے۔ میں نے اس عورت کو اپنے کمرے میں بلایا۔ اس نے آتے ہی پوچھا۔ ”میرا بیٹا کہاں ہے؟“

”تم اپنی منبر پر قائم ہو کہ جب تک بیٹا میرے سامنے نہیں کر دے، میں بات نہیں کروں گی۔“ میں نے اسے جواب دیا۔ ”اب میری منبر کو۔ یہاں تھانے میں پڑی جینتی دہر۔ جب تک بات نہیں کر دے گی اپنے بیٹے کی صورت بھی نہیں دیکھ سکی گی۔“

”لیکن آپ کہتے ہیں کہ اس لڑکی کو میں نے قتل کیا ہے۔“ اس نے اپنا لہجہ نرم کرتے ہوئے کہا۔ ”میں غریب عورت بھلا کیسے قتل کر سکتی ہوں؟“

”بالکل ایسے جیسے تم نے اپنے خاندان کو قتل کیا تھا۔“ میں نے کہا۔ ”نہیں دوسرے

نہیں۔ میں دھوکا کھا چکی ہوں۔“ تو مجھے اکل کی باتیں یاد آنے لگیں۔ اس عورت نے بچے کو ڈیڑھ سال کی عمر میں اپنی بہن کے حوالے کیا اور اس وقت واپس آئی کہ وہ نو دس سال کا ہو چکا تھا۔ بہر حال میں نے زیادہ توجہ اس واردات کو دی جو میرے باپڑی تھی۔ میں نے سوچا کہ وہ اس واردات کا اقبال کر لے تو اس کے ماضی تک جانے کی کوئی ضرورت نہیں۔ میں اسے گھیسرنے کی کوشش کرنے لگا۔ میں حیران رہا کہ یہ عورت بالکل ہی بدل گئی۔ اس نے ترانہ ترانہ جواب دینے شروع کر دیئے۔ ہر سارے سوال اور اس کے جواب لکھ کر آپ کو پریشان کرنا نہیں چاہتا۔ مختصر یہ کہ اس عورت کے اندر کوئی ایسی طاقت بیدار ہو گئی کہ میرے جال سے صاف نکل گئی لیکن یہ کاہل طلب ہو کر نہیں تھا کہ میں اسے مشتہ سمجھا ہی چھوڑ دیتا۔

مجھے آخر بچے پکڑ پر جانا پڑا۔ میں نے اپنے لیے۔ ایس۔ آئی کو بلایا۔ اس عورت اب اس کے بیٹے اکل کو حراست میں توڑ لیا۔ انہیں تفتیش کے لیے تھانے میں پابند کر دیا۔ دونوں کو دوسرے کمرے میں بھیج کر ان پر ایک کانٹیل کی ڈیلوٹی لگا دی۔ میں نے اسے ایس۔ آئی کو اس عورت کے ماضی کی خبر لانے کے لیے بہت سی ہدایات دیں اور پھر اکل کو بلا کر اسے کہا کہ وہ اسے۔ ایس۔ آئی کے ساتھ اپنی اس خالہ کے گھر جائے جس کے پاس وہ نو دس سال کی عمر تک رہا ہے۔ ایک کانٹیل بھی ساتھ بھیج دیا۔ یہ یاد رکھنا فوراً روانہ ہو گئی۔

مجھے توقع تھی کہ یہ لوگ دوسرے دن شام تک واپس آجائیں گے مگر نہ آئے۔ اس دوران اس عورت نے تھانے میں ادھم بپا کیے رکھا۔ وہ اپنے بیٹے کے لیے پریشان تھی۔ میں نے اسے تسلی دی کہ اس کے بیٹے کو گھر بھیج دیا ہے تو اس نے جینٹا شروع کر دیا

قتل کا کوئی دوسرا طریقہ اختیار کرنا چاہیے تھا۔ دونوں کو تم نے گلا دبا کر مارا۔“

وہ مجھ کے رہ گئی۔ اس نے مجھے پٹی پٹی نظروں سے دیکھنا شروع کر دیا۔ میرے ذہن میں اس کا یہ فقرہ آگیا۔ ”پولیس والوں کا کوئی جبر و سر نہیں۔ میں پہلے بھی دھوکا کھا چکی ہوں۔“ میں خود بخود تیار تھا۔ میں سمجھ گیا کہ اس کے ساتھ کیا دھوکا ہوا ہوگا۔ میں نے اس کے مطابق کہا۔ ”تمہیں بخانا دینے کا تھا کہ اتنا بل جرم کرو، میں تمہیں بری کرادوں گا مگر اس نے تمہیں آٹھ سال سزائے قید و لاد دی۔“

”ہاں“ اس نے اس طرح کہا جیسے سسکی لی ہو۔ ”آٹھ سال۔ میں نے اس کے وعدے پر قتل کا اقرار کر لیا اور اس نے مجھے عمر قید دلانے کے لیے پورا زور لگا دیا۔ آ میرا وکیل تیز تھا جس نے مجھے سچا لیا اور آٹھ سال قید ہوئی۔ میں سات سال پورے کرکے جیل خانے سے نکلی۔“

وہ اس طرح بول رہی تھی جیسے خواب میں بڑبڑا رہی ہو۔ میں اب اسے اس کیفیت سے نکالنے کی غلطی نہیں کرنا چاہتا تھا۔ میں نے کہا۔ ”ایسے خاوند کی سزا بھی تم کو اسے قتل کر دیا جاتا۔ افسوس ہے کہ وہ بخانا دینا ہی نہ تھا۔ میں نہتا تو تمہیں صاف بچا لیتا۔“ وہ رو رہی تھی۔ اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ میں نے اس کی ہمدردی میں چابکدستی سے باتیں شروع کر دیں اور اس کے چہرے کا اتار چڑھاؤ دیکھتا رہا۔ میری اداکاری کامیاب تھی۔ اس نے میری طرف دیکھا۔ میں اس کی نظروں کو سمجھ گیا کہ اس کی نظروں میں مجھے اتنا بل جرم صاف نظر آنے لگا تھا۔ اس نے مجھ سے پوچھا۔ ”ڈاکٹر نے میری انگلی سے خون کیوں نکالا تھا؟“ میں نے اسے بتایا کہ ڈاکٹر نے تمہارا خون اس خون سے ملایا ہے جو منقرضہ کی انگلیوں کے ساتھ لگا ہوا تھا۔

”ڈاکٹر نے کیا کہا ہے؟“

”اس نے کہا ہے کہ وہ خون بھی تمہارا تھا۔“ میں نے کہا۔ ”اس کی انگلیوں کے ساتھ تمہارے ان ہاتھوں کا خون تھا۔ تم نے اس کا گلا دبا یا تو اس نے تمہارا گریبان پکڑا۔ تمہارے کرتے کا ایک بٹن ٹوٹ گیا۔ پھر اس نے تمہارے ہاتھوں سے اپنی گردن چھڑانے کے لیے ناخنوں سے تمہارے ہاتھ چھیل دیئے اور تمہارا خون اس کی انگلیوں کے ساتھ لگا کر لیا۔ ڈاکٹر نے یہ خون محفوظ کر لیا تھا۔ اب تمہارا خون ڈاکٹر نے نکال کر اس کے ساتھ رکھ لیا ہے۔“

یہ نا تجربہ کار لڑکی تھی

وہ ایسی حیرت زدہ نظروں سے مجھے دیکھنے لگی جیسے میں جادوگر ہوں۔ کوئی ایک گھنٹہ بعد اس نے ہتھیار ڈال دیئے۔ اس نے رنجیدہ اور باری ہوئی آواز میں اتنا بل جرم کی ابتدا اس جملے سے کی۔ ”ایک لڑکی نے مجھ سے میرا خاوند چھین لیا تھا۔ میں نے خاوند کو زندہ نہ چھوڑا کیونکہ میں جانتی تھی کہ خاوند مجھے واپس نہیں ملے گا۔ اب ایک لڑکی مجھ سے میرا بچا چھیننے آئی تو میں نے اس لڑکی کو زندہ نہ چھوڑا۔“

میں نے اسے ایس، آئی، کو اکل کے ساتھ اکل کی خالہ اور خالہ سے اس کی ماں کے متعلق تحقیقات کرنے کے لیے بھیجا تھا۔ ان لوگوں نے پورے سے کچھ چھپانے کی جرات نہ کی اور بتا دیا کہ اس نے اگرچہ میں اپنے خاوند کو قتل کر دیا تھا اور اسے آٹھ سال قید ہوئی تھی۔ اس وقت اکل ٹیڑھ سال کا تھا۔ بچے کو اس کی خالہ لے آئی تھی۔ وہاں سے میرا اسے، ایس، آئی، اگرچہ چلا گیا۔ کیس بہت ہی پرانا تھا۔ تاہم اسے، ایس، آئی، نے بہت کی اور

بیویاں رکھنے کا عادی ہے اور کوئی نہ ملے تو کسی طوائف کو گھر لے آتا ہے۔ پڑوسیوں نے اس سے پہلے اکمل کی ماں کو اس لیے یہ باتیں نہیں بتائی تھیں، کہ وہ سمجھتے تھے کہ یہ شخص شادی کر کے بدکاریوں کو ترک کر چکا ہے مگر وہ پھر اپنی ڈگر پر آگیا تو پڑوسیوں نے اکمل کی ماں کو بتا دیا کہ اس کا خاوند بدتماش ہے۔

اس کے خاوند نے اکمل کی ماں کو یہ طعنے دینے شروع کر دیئے کہ وہ گھر سے بھاگ آئی تھی۔ اس لیے وہ اچھے چال چلن کی لڑکی نہیں۔ ایک روز وہ ایک لڑکی کو گھر لے آیا اور دونوں بند کمرے میں بیٹھے رہے۔ لڑکی کے جانے کے بعد اکمل کی ماں نے احتجاج کیا تو خاوند نے اسے کہا کہ تم میری بیوی عارضی میں عیش کرتی ہو اور میں تمہارے سامنے عیش کر رہا ہوں۔ اس نے بیوی پر صاف الفاظ میں بدکاری کے الزام لگانے شروع کر دیئے اور کہا کہ وہ دوسری شادی کر رہا ہے۔ اکمل کی ماں اس کے پاؤں پڑی اور رو رو کر کہا کہ وہ اس پر ظلم نہ کرے۔ خاوند نے اسے کہا ”میں تمہارا قیدی نہیں ہوں۔ دوسری شادی ضرور کروں گا“ گھر میں شدید ناچاقی پیدا ہو گئی۔

اس لڑکی کے لیے کوئی جگہ نہیں تھی جہاں وہ جا کر سر جھپاتی۔ ماں باپ کے گھر جا نہیں سکتی تھی۔ اس کے خاوند نے الگ کمرے میں سونا شروع کر دیا تھا۔ ایک رات اس کا خاوند گھر آیا تو اس کے ساتھ وہی لڑکی تھی جس کے ساتھ اس نے دوستی کا ٹھٹی تھی۔ خاوند شراب میں بدست تھا۔ اپنے کمرے میں جا کر پلنگ پر گر پڑا۔ نشہ میں اس نے اپنی دوست کو آواز دی۔ وہ قریب گئی تو خاوند نے اس لڑکی کو بازو سے پکڑ کر پلنگ پر گرا لیا۔ اکمل کی ماں اس کمرے کے دروازے میں کھڑی تھی۔ یہ منظر وہ برداشت نہ کر سکی۔ دماغ تو اس کا پھٹے ہی چل گیا تھا۔ اب بالکل ہی پاگل ہو گئی۔

تھوڑے وقت میں کیس نکلا کر دیکھ آیا۔ اس عورت کا وکیل ہوشیار معلوم ہوتا تھا۔ جس نے فوری اشتعال ثابت کر لیا تھا جس کی بنا پر اسے آٹھ سال قید مل رہی تھی۔ یہ تو استغاثہ اور صفائی کا کیس تھا۔ اصل کہانی اس عورت نے سنائی جو میں اپنے الفاظ میں سناتا ہوں۔ اس عورت کا آنبالی بیان بہت ہی لمبا تھا۔

مختصر یہ کہ یہ عورت بیس ایکس سال کی عمر میں ایک ایسے آدمی کے ساتھ گھر سے نکل گئی جو عمر میں اس سے آٹھ نو سال بڑا تھا۔ یہ درمیان درجے کے گھرانے کی لڑکی تھی۔ اس کے بیان سے میں نے اس آدمی کے متعلق رائے قائم کی کہ وہ عورتوں کا شکاری خفاہ لڑکوں کو بچانے کا فن جانتا تھا۔ اس کا معمولی سا کوئی کاروبار تھا۔ والدین سے آزاد رہتا تھا۔ اکمل کی ماں کے خدو خال بتاتے تھے کہ جوانی میں خوبصورت تھی۔ اس کی خوبصورتی کے آثار ابھی تک باقی تھے۔ وہ اس آدمی کو دل و جان سے چاہتی تھی۔ اسے روپے پیسے کا کوئی لالچ نہیں تھا۔ اس آدمی نے اس کے ساتھ شادی کر لی۔ وہ بھی اسے بہت چاہتا تھا۔

ڈیڑھ سال بعد اکمل پیدا ہوا۔ اس کی عمر ایک سال ہوئی تو اکمل کا باپ اس کی ماں سے نظریں پھیرنے لگا۔ اس نے ایک اور لڑکی کے ساتھ راہ ورسم بڑھائی شروع کر دی تھی۔ راتوں کو دیر سے گھرانے لگا۔ اس کا بزنا و بہت تیزی سے بڑھاتا گیا۔ اکمل کی ماں نے کچھ شکوے شروع کر دیئے جس کی خاوند نے کوئی پروا نہ کی۔ پھر وہ اسے ڈانٹنے لگا۔ گھر میں لڑائی جھگڑے شروع ہو گئے۔ اس عورت کا اپنا تو کوئی غنا نہیں۔ وہ گھر سے بھاگ کر آئی تھی۔ اس نے پڑوسیوں کے ساتھ اپنے خاوند کے رویے کے متعلق بائیر شروع کر دیں۔ تب اس پر انکشاف ہوا کہ یہ شخص شادی کا تو قائل ہی نہیں تھا۔ لوگ حیران تھے کہ اس نے اس عورت کے ساتھ شادی کیوں کر لی؟ اسے بتایا گیا کہ وہ تو بے نکاح

سزا ملی۔ ایک سال معافی مل گئی جو جیلوں میں قاعدے کے مطابق ملا کرتی ہے۔ قید پوری کر کے وہ اپنی بہن کے پاس گئی اور اس نے اپنا پیارا اور زندگی اکمل کے لیے وقف کر دی۔ اس کی بہن امیر نہیں تھی اور نہ ہی وہ غربت تھی لیکن اکمل کی ماں نے اس پر بوجھ ڈالنا مناسب نہ سمجھا۔ وہ لوگوں کے گھروں میں جھاڑو بن کر رہی اور اکمل کو پالتی اور پڑھاتی رہی۔ اکمل کے ساتھ اس نے جس طرح پیدا کیا وہ آپ بیکل کی زبان سے سن چکے ہیں۔ اب اس کی ماں کی زبانی سنئے۔

یہ مانتا کی ایک غیر معمولی کہانی ہے۔ ماں کا پیار بعض حالات میں پاگل پن کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ ماں کا ایسا شدید پیار بچے کو بھی لے ڈیتا ہے۔ اکمل کی ماں کے حالات آپ نے سن لیے ہیں۔ اس نے محبت کی خاطر ماں باپ کا گھر چھوڑا اور ایک گھر بسایا جہاں اس کے لیے خوشحالی اور پیار تھا مگر سب کچھ ٹٹ گیا۔ اس کے پاس مرث پناہ کی دولت رہ گئی جو اس نے اپنے بچے کے لیے وقف کر دی۔ لیکن یہ ڈر اس کے دل میں گھر کر گیا کہ کوئی اس سے اس کے بچے کو بھی چھین کے لے جائے گا۔

”وہ جب جوان ہو گیا تو بھی میں رات کو دو تین بار اٹھ کر اسے دیکھتی تھی اور کہتی ہی رہی اس کے سر ہانے کھڑی رہتی تھی۔“ اس نے کہا۔ ”وہ سولہ ستر سال کا ہو گیا تو بھی میں اسے اپنے پاس سلاتی تھی۔ ایک دفعہ اس نے کہا کہ میں آگ سویا کر دوں گا۔ خدا جانتا ہے کہ میرے دل کا کیا حال تھا۔ میں بہت دیر سوچتی رہی کہ میرا بیٹا مجھ سے الگ کیوں سونا چاہتا ہے؟ کیا میں اسے اچھی نہیں لگتی؟ یا شاید اپنے آپ کو جوان سمجھنے لگے ہے۔ یہ تو مجھے اپنے لیے لینا چاہئے تھا کہ وہ جوان ہو گیا ہے لیکن وہ جب پہلی بار دوسری چار پانی پر سویا تو رات میری آنکھ بار بار کھلی۔ مجھ پر یہ دم سوار ہو گیا کہ مجھ سے کوئی میرا بچہ چھین کے لے گیا ہے۔“

وہ چیل کی طرح خاندان کی طرف چھپٹی۔ لڑکی تیزی سے اٹھ کر باہر کود پڑی۔ اکمل کی ماں نے خاندان کی گردن ہاتھوں میں دبا لی اور اسے چھوڑا اس وقت جب وہ مڑا تھا۔ اسے جب پتہ چلا کہ خاندان مڑ گیا ہے تو صحن میں جا کر وہ بین کر کے اور اپنے منہ پر سینے پر ہاتھ مار مار کر رونے لگی۔ محلے دار آگئے۔ اس نے سب کو بتا دیا کہ اس نے اپنے خاندان کو مار دیا ہے۔ محلے میں کچھ اچھے لوگ تھے۔ وہ اسے بھی جانتے تھے اور اس کے خاندان کو بھی۔ انہوں نے اسے کہا کہ وہ پولیس کے سامنے یہ نہ کہے کہ اپنے خاندان کو اس نے خود مارا ہے۔ وہ ان کی بات سمجھ گئی اور جب پولیس آئی تو اس نے یہی بیان دیا کہ وہ اپنے خاندان کے کمرے میں گئی تو دیکھا کہ وہ شراب کے نشے بدست تھا اور ایک لڑکی اس کا گلا گھونٹ رہی تھی۔ اسے دیکھ کر لڑکی جھاگ گئی لیکن خاندان مڑ چکا تھا۔ لڑکی کا اتنا پتا کہ کو بھی معلوم نہ تھا۔ محلے داروں نے بیان دیا کہ لڑکی میں اتوں نے کسی کے دوڑنے کا طرز سنی تھی اور مقتول کی بیوی شور مچا رہی تھی کہ میرے خاندان کو یہ چڑیل مار گئی ہے یہ ناخن جو کار لڑکی تھی اس نے اپنی صفائی میں ایسا بیان دیا جو ثابت کرنا ممکن نہیں تھا وہ پولیس کو گراہ نہ کر سکی۔ تھانیدار ہندو تھا۔ اس نے اسے چلتی چٹری باتوں سے یہ جھاد دے کر کہ وہ اسے بری کرے گا، اتنا بل جرم کر لیا۔ اس کا دلیل عقل مند تھا جس نے محلے داروں کی گواہی سے اشتعال ثابت کر دیا اور وہ عمر قید سے بچ گئی۔ اس کے ماں باپ اور دو بھائیوں نے اس کی پروا ہی نہ کی۔ اس کی ایک ہی بہن تھی جو انباز میں خاندان کے ساتھ رہتی تھی خاندان کو ساتھ لاکر مدد کے لیے بھیج گئی۔ اکمل کے باپ کے رشتہ داروں نے ان کے مکان اور سامان پر قبضہ کر لیا تھا۔

اکمل کی خال اکمل کر اپنے پاس لے گئی۔ وکیل اسی نے کیا تھا۔ اکمل کی ماں کو آٹھ

لو اس نے میرے ساتھ پیادری بائیں میں۔ میں اکمل کے رویے سے جلی بیٹھی تھی۔ وہ میرے ساتھ اس طرح بیگانوں کی طرح کبھی نہیں بولا تھا۔ اسی لڑکی کی وجہ سے میرا بیٹا مجھ سے بیگانہ ہو رہا تھا۔ میں نے لڑکی کو دھتکار دیا اور یہ بھی کہا کہ چڑیل کوئی اور گھر دیکھ۔ تجھ جیسی ایک چڑیل میرا گھر اجاڑ چکی ہے۔ وہ بھی غصے میں آگئی۔ اس نے مجھے کہا کہ اپنے بیٹے کا دل توڑ کر تو پھپھتا ہے گی۔ ساری عمر اسے ڈھونڈتی پھرے گی۔ میں اسے اپنے ساتھ لے جاؤں گی۔ میں دیکھ لوں گی کہ تو اپنے بیٹے کے ساتھ کس طرح رہے گی؟۔۔۔۔

”میں نے اکمل کو یہ بات نہیں بتائی۔ وہ گھر آیا تو میں نے اس سے پوچھا۔ اکمل، تو اس لڑکی سے ملتا لڑتا رہتا ہے؟ اس نے بے رخی سے جواب دیا۔ ماں ملتا ملتا رہتا ہوں۔ میں نے اسے کہا کہ بیٹا، اپنی پاگل ماں کا تجھے کوئی خیال نہیں؟ اس نے جواب دیا۔ ”اپنے ساتھ مجھے بھی پاگل نہ کرنا، میں اسے ملتا ہوں اور ملتا رہوں گا۔ تو مجھے کب تک زنجیریں ڈالے رکھے گی۔ سینما جاؤں تو تیری اجازت لوں، کوئی کپڑا اجاڑ تو تیری اجازت لوں۔ ذرا باہر نکلوں تو تیری اجازت لوں،۔۔۔ ماں کا دل چکی میں پستار یا وار و غم جی، اور وہ شام آئی کہ میں نے اپنے دل سے کہا تیرا بیٹا بھی ہاتھ سے گیا۔ اس شام وہ بہت بگڑ گیا۔ اس نے کھانا بھی نہ کھایا۔“

”کیا تمہیں معلوم تھا کہ یہ لڑکی اچھے چال چلن کی نہیں؟“ میں نے پوچھا۔ ”مجھے کچھ بھی معلوم نہیں تھا۔“ اس نے جواب دیا۔ ”اپنے بیٹے کے سوا میں کسی دوسرے کو نہیں جانتی۔ مجھے تو یہ بھی معلوم نہیں کہ میرے پڑوس کے لوگ کیسے ہیں۔ اس لڑکی کے متعلق میں اتنا ہی جانتی تھی کہ مجھ سے میرا بیٹا چھینے آئی تھی۔“

مقتولہ اس کا بیٹا چھیننے آئی تھی

”اب وہ رات بارہ بجے والیں آنا ہے اور میں اس وقت تک جاگتی رہتی ہوں۔ دلروہ جی، آپ کے بھی بچے ہوں گے۔ آپ ان سے پیار کرتے ہی ہوں گے لیکن میرے پیار کو آپ نہیں سمجھ سکتے۔ آپ یہ بھی نہیں سمجھ سکتے کہ جس روز یہ لڑکی جو قتل ہو گئی ہے، میرے گھر میں آئی اور اکمل اس کے ساتھ ہنس ہنس کر بائیں کرنے لگا تو میرے اندر کیسی آگ لگی تھی۔ فوراً میرے سامنے وہ لڑکی آگئی جس نے میری دنیا ہی تباہ کر ڈالی تھی اور میرے ہاتھوں میں سہاگ اور میرا پاز قتل کر دیا تھا۔ میں نے بہت کوشش کی کہ میرا دل سمجھ جائے کہ میرا اکمل جوان ہو گیا ہے اور اب اس کے لیے ایک جوان لڑکی کی ضرورت ہے۔ ایک لڑکی کو اب میرے گھر آنا ہی ہے مگر اکمل مجھے اپنے باپ کی طرح نظر آتا رہا اور یہ لڑکی بالکل اسی لڑکی کی شکل اختیار کر گئی جس نے مجھ اس حد تک پہنچا دیا تھا۔ میرا دل نہ مانا اور دل ہی کہتا رہا کہ یہ بھی ایک ڈاکو ہے اور تیرا بیٹا تیرے ہاتھ سے نکل رہا ہے۔۔۔۔۔“

”میں نے کئی کڑواٹ دیا۔ پھر لڑکی کو گھر سے نکال دیا۔ اکمل نے مجھے کئی بار سمجھانے کی کوشش کی کہ یہ لڑکی بڑی اچھی ہے اور وہ اس کے ساتھ شادی کرنا چاہتا ہے۔ مگر میرے دل میں یہی خوت طاری رہا کہ نہیں یہ لڑکی مجھ سے تیرا بیٹا چھیننے آئی ہے۔ لڑکی کی ماں بگڑ میرے گھر میں آئی مگر میرے دل میں جگہ نہ بنا سکی۔ اکمل میرے ساتھ بگڑنے لگا اور ایک روز اس نے یہاں تک کہ دیا کہ ماں، میں تمہارا قیدی نہیں ہوں۔ میں جوان ہوں، کماتا ہوں، تمہاری خدمت کرتا ہوں۔ میں ساری عمر صرف تمہارا قیدی نہیں رہ سکتا۔ وہ باہر نکل گیا۔ میں کچھ سمجھنے کی بجائے پاگل ہوئی رہی۔ ایک روز یہ لڑکی پھر میرے گھر آگئی۔ پتہ

کئی مدد نہیں کر سکتا تھا۔ میں نے استغاثہ مضبوط کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ میں اس عورت کی یہ مدد کر سکتا تھا کہ اس کی پہلی سزا پر پردہ ڈال دیتا لیکن میرا سہ، ایس آئی ہندو تھا۔ وہ ریکارڈ دیکھ لیا تھا۔ اسے چھپانا ممکن نہیں تھا کیس کورٹ میں گیا۔ سیشن سپرد بھی ہو گیا جہاں ملزمہ اپنے اقبالی بیان سے منفر ہو گئی۔ اقبالی بیان ٹھوس شہادت کے بغیر محض بیکار ہوتا ہے۔ سیشن جج نے اس کے پہلے قتل کا حوالہ دے کر اسے عمر قید کی سزا دی لیکن باقی کورٹ نے اس کی اپیل منظور کرتے ہوئے اسے بری کر دیا۔ اسے شک کا فائدہ دیا گیا تھا۔

اکمل نے وکیل اچھا کیا تھا۔ اس نے دو نقطوں پر زیادہ زور دیا تھا۔ ایک یہ کہ موقعہ کا گواہ کوئی نہیں تھا۔ دوسرا نقطہ یہ تھا کہ خون کے گروپ مل جانا کوئی شہادت نہیں۔ دس آدمی اٹھ کوڑواں میں سے پانچ کا گروپ ایک ہو گا۔ وکیل نے یہ نقطہ بھی بکڑا کر اس عورت کے لیے قتل کی نہ کوئی وجہ تھی نہ کوئی زوری استعمال۔ اگر اس نے بیس سال پہلے اپنے خاوند کو قتل کیا تھا تو یہ کیسے تسلیم کر لیا گیا ہے کہ اس لڑکی کو بھی اسی عورت نے قتل کیا ہے؟

میں نے استغاثہ میں مقتولہ کی ماں سے عدالت میں یہ بیان دلوا دیا تھا کہ وہ اپنی بیٹی کا زہرہ اکمل کو دینا چاہتی تھی لیکن ملزمہ کو پسند نہیں تھا۔ اکمل نے اپنی ماں کی صفائی میں یہ بیان دیا کہ اس نے جب اپنی ماں سے ذکر کیا کہ وہ اس لڑکی کے ساتھ شادی کرنا چاہتا ہے تو ماں بہت خوش ہوئی اور اس نے کہا تھا کہ اسے یہ لڑکی بہت پسند ہے۔ وہ لڑکی کے گھر رشتہ مانگنے کے لیے جانے کی تیاری کر رہی تھی کہ لڑکی قتل ہو گئی۔

بیٹے نے ماں کو عمر قید سے صاف بچا لیا۔

شام یہ اڑیا کھانا کھانے بغیر نکل گیا۔ میں اس کے پیچھے پیچھے کھر سے نکلی۔ میں اسے روکنا نہیں چاہتی تھی۔ ڈر قی حق کردہ اور زیادہ بگڑے گا۔ اسے معلوم نہیں تھا کہ میں اس کے پیچھے آ رہی ہوں۔ اندھیرا تھا میں نے دیکھا کہ وہ سڑک کی طرف جانے کی بجائے دوسری طرف جا رہا تھا جہاں کھلا اور دیران علاقہ ہے۔ میں ادھر ہی چلی گئی۔ بغیر آباد علاقے میں مجھے ایک اور سایہ نظر آیا۔ اکمل اس کے پاس رک گیا اور دونوں ایک طرف ہو گئے جہاں دو درخت ہیں۔ میں بیٹھ گئی۔ مجھے ان کی باتیں سنانی دے رہی تھیں لیکن کچھ سمجھ نہیں آتی تھی۔ میں جان گئی کہ یہ وہی لڑکی ہے اور میرا بیٹا اسی سے ملے ادھر آیا ہے۔ تھوڑی دیر بعد میں نے اپنے بیٹے کو جانتے دیکھا اور وہ اندھیرے میں غائب ہو گیا۔ لڑکی وہیں کھڑی رہی۔ اُسماں گھوم رہا تھا۔ زمین کانپ رہی تھی۔ میں اُسکے کو پل پڑی۔ لڑکی نے میرے پاؤں کی آہٹ سنی تو وہاں سے چل پڑی۔ میں بہت تیز چل رہی تھی۔ فوراً اس تک پہنچ گئی اور اسے کہا، غم چاڑھا۔۔۔۔۔

”وہ رک گئی۔ اس نے مجھے پہچان لیا اور بولی۔ اری تو اپنے بیٹے کی جاسوسی بھی کرتی ہے بتائیں نے اس طرح دونوں ہاتھوں میں اس کی گردن دبوج لی جس طرح پھندا بند ہوتا ہے۔ اس نے میرے گردن پر ہاتھ ڈالا۔ میں نے جھٹکا دیا تو کرنے کا اوپر کا بیٹن ٹوٹ گیا۔ پھر اس نے ناخن میرے ہاتھوں میں گاڑ کر میری کھال ادھیڑ لی مگر میرے اس کی جان لے کر دم لیا۔ اُس وقت جب اس کی گردن میرے ہاتھوں میں تھی، مجھے ایسے لگ رہا تھا۔ جیسے یہ اس لڑکی کی گردن ہے جسے میرا خاوند گھرا لیا تھا“

میں نے اس کا بیان ایک جسرٹ سے ریکارڈ کروا لیا۔ یہ عورت میری زندگی کا ایک اور غیر معمولی اور ناقابلِ فراموش کردار ہے۔ مجھے اس کے ساتھ دلی ہمدردی تھی لیکن میں اس کی

کون کس کا قاتل

بوڑھا خاندان، جوان بیوی، جوان بیٹا
یہ ہے قتل کا ایک تیر بہدت نسخہ

مرتضیٰ کو شک ہوا کہ متوفی کو قتل کیا گیا ہے۔ وہ میرے پاس اس لیے آئے تھے کہ میں مرنے والے کا پوسٹ مارٹم کرواؤں۔

ایسے تو ہوتے ہیں سکتا کہ کسی کی قرض رپورٹ یا شک پر کسی کی لاش کو چیرنے پھاڑنے کے لیے بھیج دیا جائے۔ پوسٹ مارٹم کرانے کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ پولیس کو بھی شک ہے کہ مرنے والا قدرتی موت نہیں مرا، اسے مارا گیا ہے۔ معاملہ بہت سنگین ہو جاتا ہے۔ میں نے رفعت اور اس کے خاندان پر کم و بیش ایک گھنٹہ جرح کی جس سے مجھے مرثیہ حاصل ہوا کہ رفعت کو شک ہے کہ اس کے باپ کو اس کی سوتیلی ماں نے اس کے بھائی کے ساتھ مل کر قتل کر دیا ہے۔ ان کے پاس اس شک کو تقویت دینے کے لیے کچھ بھی نہیں تھا۔ نہ کوئی شہادت نہ کوئی ثبوت۔ میں نے یہ معلوم کرنے کے لیے بھی جرح کی کہ رفعت اور اس کا خاندان کسی عداوت کی بنا پر قریہ رپورٹ درج کرانے نہیں آئے؛ میں آخر اس نتیجے پر پہنچا کہ ان کی نیت میں کوئی خرابی نہیں ہے۔ اس کے باوجود میرے پاس کوئی وجہ نہیں تھی کہ ان کی رپورٹ درج کر کے لاش پوسٹ مارٹم کے لیے بھجوا دوں، لیکن میں نے جب تین افراد پر غور کیا تو میرے دل میں بھی شک پیدا ہو گیا۔ متوفی کی عمر اڑتالیس سال تھی۔ اس کی بیوی کی عمر بائیس سال تھی اور متوفی کے بیٹے کی عمر تیس سال تھی۔ اگر آپ کسی بھی ریپس سٹیشن میں وارداتوں اور قتلوں کے کاریکارڈ دیکھیں تو قتل کی بہت سی کہانیوں میں آپ یہ بین کردار ضرور دیکھیں گے۔ بوڑھا خاندان، جوان بیوی، مرنے والے کا جوان بیٹا۔ اس کہیں میں جائیداد کا لالچ بھی تھا۔

ایک لڑکی، عمر بیس کہیں سال اپنے خاندان کے ساتھ تھانے میں آئی۔ اس کا نام رفعت تھا اور خاندان کا نام مرتضیٰ۔ ان کی شادی ایک سال گزرا ہوئی تھی۔ وہ اپنے سسرال میں تھی۔ اسے اطلاع ملی کہ اس کا باپ مر گیا ہے۔ لڑکی نے بتایا کہ اس کا باپ بیمار نہیں تھا۔ آج صبح وہ بستر پر مرا ہوا پایا گیا۔ اس آدمی کی عمر اڑتالیس سال تھی ایک سال گزرا اس نے راحت نام کی ایک لڑکی کے ساتھ شادی کی تھی جس کی عمر بائیس سال تھی۔ متوفی کی بیٹی رفعت نے بیان دیا کہ اس کی ماں دو سال ہوئے مر گئی ہے۔ ایک سال بعد اس کے باپ نے راحت سے شادی کر لی تھی۔ رفعت کا ایک بھائی جوان تھا۔ عمر تیس سال۔ اس سے چھوٹی رفعت تھی اور اس سے چھوٹا ایک اڈ بھائی جس کی عمر سولہ سال تھی۔ رفعت کو باپ کے مرنے کی اطلاع ملی تو وہ بھاگی ہوئی پہنچی۔ اسے اس کے بھائی عاشق علی اور سوتیلی ماں راحت نے بتایا کہ اس کا باپ حرکت قلب بند ہونے سے مر گیا ہے۔ وہ اچھا بھلا تھا۔ رفعت کے بیان کے مطابق ان سے پہلے اسے دل کی کبھی کوئی تکلیف نہیں ہوئی تھی۔ رفعت اور اس کے خاندان

”تمہارے بڑے بھائی کے تعلقات سوتیلی ماں کے ساتھ کیسے تھے؟“ میں نے

رفعت سے پوچھا۔
 ”بہت اچھے“ رفعت نے جواب دیا۔ ”ان کی بے تکلفی قابلِ اعتراف تھی“ رفعت کا خاندان بول پڑا۔ ”راحت اچھے چلن کی لڑکی نہیں۔ میں نے کئی بار دیکھا ہے کہ عاشق علی (رفعت کے بڑے بھائی) کو دیکھ کر اس کا چہرہ کھل اٹھتا ہے۔“
 ”یہ کوئی ثبوت نہیں“ میں نے کہا۔

”ثبوت تو میں کوئی بھی پیش نہیں کر سکتی“ رفعت نے کہا۔ ”میں نے اپنی ہوتیلی ماں کو اپنے چھوٹے بھائی کے ساتھ مشکوک حالت میں دیکھا ہے۔“ رفعت نے میرے پوچھنے پر بیشکاک حالت بیان کی۔ اس کے چھوٹے بھائی کی عمر سولہ سال تھی۔ رفعت نے راحت کے ساتھ لڑائی کی تھی اور اپنے بھائی کو ڈانٹتا تھا اور آبا جان کو بتا دینے کی بھی دھمکی دی تھی۔ میرے لیے یہ باتیں قابلِ فہم تھیں۔ جہاں جوان بیٹا اور جوان سہیلی ماں ہر دوہاں کے متعلق کیسا ہی جھوٹ بول دو سچ لگتا ہے لیکن جب آپ تھانیدار کی وردی پہن لیتے ہیں تو آپ کی نظروں میں جھوٹ اور سچ کے معنی بدل جاتے ہیں۔ میں نے رپورٹ درج نہ کی۔ متوفی کے گھر جا کر اور کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھ کر کارروائی کرنے کا فیصلہ کیا۔

میں جب رفعت اور مرتضیٰ کے ساتھ متوفی کے گھر پہنچا تو میت کو نہلا کر غسل پتایا جا چکا تھا۔ قبر تیار ہو چکی تھی اور جنازہ اٹھنے والا تھا۔ میں نے گھڑی دیکھی۔ پورے بارہ بجے تھے۔ باوردی تھانیدار کو دیکھ کر وہاں جو لوگ موجود تھے۔ سناٹے میں آگئے۔ میں نے متوفی کے بڑے بیٹے عاشق علی کو الگ کر کے پوچھا کہ اس کے والد صاحب کس وقت فوت ہوئے ہیں؟ اس نے بتایا کہ صبح اس کی سونہیلی ماں روٹی چبختی سونے کے کمرے

مے نکلی اور بتایا کہ آبا جان مر گئے ہیں۔ میں نے اس سے پوچھا۔ ”تو جتنی بات ہے کہ تم نے لاش کے ماتھے پر یا نبض پر ہاتھ رکھا ہوگا۔ لاش گرم تھی یا سرد؟“
 اس نے جواب دیا۔ ”میں نے کبھی کسی لاش کو ہاتھ نہیں لگایا اس لیے بتا نہیں سکتا کہ لاش کتنی سرد ہوتی ہے۔ آبا جان کی لاش کوئی زیادہ سرد نہیں تھی۔ میرا خیال ہے کہ کچھ حرارت تھی۔“

میں نے اسے کہا۔ ”میں آپ کی سونہیلی ماں سے عیدگی میں کچھ پوچھنا چاہتا ہوں۔“ تب وہ گھبراہٹ اور اس کے چہرے کا رنگ بدلتے لگا۔ آہستہ سے بولا۔ ”کیوں جی؟“

میں نے اسے تسلی دی اور کہا۔ ”گھبراہٹ نہیں مجھے صحت یابی کرنا ہے کہ آپ کے والد صاحب کو کت قلب بند ہونے سے فوت ہوئے ہیں؟“ وہ اندر چلا گیا۔
 جو لوگ جنازے کے لیے آئے ہوئے تھے، وہ سمجھ رہے تھے کہ میں بھی جنازے کے لیے آیا ہوں۔ عاشق اندر چلا گیا تو چند آدمی میرے قریب آگئے۔ ایک نے کہا۔ ”دیکھو صاحب، آج کی اولاد باپ کا ابھی پوری طرح انتقال بھی نہیں ہوا اور جنازہ لے جایا جا رہا ہے۔“

یہ تو میں نے پہلے ہی نوٹ کر لیا تھا کہ گھروالے میت کو دفن کرنے میں جلدی کر رہے ہیں۔ عاشق علی باہر آیا۔ میں نے اس سے پوچھا کہ جنازہ اتنی جلدی کیوں لے جایا جا رہا ہے؟ اس نے سونہیلی ماں کے متعلق کہا کہ اس کے اصرار پر جلدی کی جا رہی ہے۔ وہ مجھے ایک کمرے میں لے گیا جہاں ایک جوان لڑکی کھڑی تھی۔ میں نے اندر جلتے ہی اسے سر سے پاؤں تک دیکھا۔ اس کے چہرے اور ڈیل ڈول کو غور سے دیکھا۔ اکثر دار و اتوں میں مشتعل افراد

کے چہرے راز فاش کر دیا کرتے ہیں۔ اس لڑکی کے چہرے پر وہی تاثیر تھا جو ہر اس جوان لڑکی کے چہرے پر ہوتا ہے جس کا بوڑھا خاوند ایک ہی سال بعد مر گیا ہو۔ اس کے آنکھوں میں آنسو تو درکنار لڑکی سی لالی بھی نہیں تھی۔ وہ اچھے قد کا ٹھکڑی لڑکی تھی چہرہ بھی اچھا تھا۔ مجھے دیکھ کر اس کی گھبراہٹ قدرتی بات تھی۔ میں نے اسے بڑا کوکھا اور خود بھی بیٹھ گیا۔ عاشق علی کو میں نے باہر بھیج دیا۔

”مرحوم کس وقت فوت ہوئے ہیں؟“ میں نے پوچھا۔

”آپ....“ اس کے ہونٹ سوکھ گئے اور تین بار ”آپ آپ“ کہہ کر بولی۔

آپ کے دوست تھے؟ آپ کہیں....“ وہ اُسکے کچھ نہ کہہ سکی۔

”جی۔ وہ میرے دوست تھے۔“ میں نے جواب دیا۔ ”وہ کس وقت فوت ہوئے؟“

”صبح میری آنکھ کھلی۔ انہیں جگایا تو وہ نہ بولے۔ میں نے بلایا تو بھی نہ جاگے۔“

دیکھا تو مجھے شک ہوا....“

میں نے اسے لوک کر پوچھا۔ ”آپ نے انہیں ماتھ لگایا تو جسم گرم تھا یا سرد؟“

”کچھ کچھ گرم تھا۔“ اس نے جواب دیا مگر جواب بدلنے کے لیے ہکھلانے لگی۔

اس کی تصبیح کو قبول نہ کیا سچی بات اس کے منہ سے نکل گئی تھی۔ اس کے مطابق مر

والا ایک یا ڈیڑھ گھنٹے پہلے مرا تھا۔ یعنی پانچ اور ساڑھے پانچ بجے صبح کے

درمیان۔ بہر حال راحت کو مرنے کا پتہ صبح کے ذلت چلا اور پونے بارہ بجے وہ جب

اٹھا رہی تھی۔ میں نے جنازے میں جلدی کی وجہ پوچھی تو وہ کوئی دو ٹوک جواب نہ

سکی جس سے میں شک میں پڑ گیا۔ میں نے پوچھا کہ مرحوم کو پہلے کبھی دل کا دورہ پڑا

یا بلڈ پریشر کی زیادتی کبھی محسوس کی تھی؟ اس نے بتایا۔ ”کل صبح جاگے تو کہنے

کادل ڈوب رہا ہے اور سر میں گرانی ہے۔ پکڑ بھی محسوس ہوتے ہیں۔“ میں نے پولیس کے مخصوص انداز میں جرح شروع کر دی۔ یہ جرح بہت لمبی تھی جو آپ کو سنا اس لیے مناسب نہیں سمجھتا کہ ایک نویر میاں ہیری کے ”تنہائی کے تعلقات کے متعلق تھی اور دوسرے اس لیے کہ بات لمبی ہو جائے گی اور آپ اکتا جائیں گے۔ میں معلوم یہ کرنا چاہتا تھا کہ تنہائی کا دل ڈوب رہا تھا اور سر میں گرانی تھی تو کیا وہ کسی ڈاکٹر کے پاس گیا تھا؟ راحت نے مجھے گراہ کرنے کی بہت کوشش کی لیکن اسے یہ احساس نہیں تھا کہ میں پولیس میں ہوں اور سب کچھ سمجھ رہا ہوں۔ میں نے یہ اخذ کیا کہ تنہائی ڈاکٹر کے پاس جانا چاہتا تھا لیکن ہیری اسے آرام کا مشورہ دے رہی تھی اور اسے شاکر اس کا سر دباتی رہی۔

میں نے آخری ہم پھینکا۔ میں نے پوچھا۔ ”مرحوم کی عمر اڑتالیس سال اور آپ کی عمر اکیس بائیس سال ہے۔ یہ شادی یقیناً آپ کی عمر کی عمر تھی۔ آپ پر زبردستی کی گئی ہوگی اور آپ کو بہت آنسو بہا ہوگا۔“

اس نے مجھے یہیں روک لیا اور خوشی کے لیے میں بولی۔ ”جی نہیں۔ بالکل نہیں۔“

میں تو بہت خوش تھی۔ ”اس نے منہ سمور لیا اور کہنے لگی۔ ”اللہ انہیں جنت نصیب

کرے۔ میری تو زندگی تباہ ہو گئی ہے۔ وہ تو اتنے اچھے تھے کہ میں بتا نہیں سکتی۔“

لڑکی ایکٹنگ کر سکتی تھی۔ میں یہی جواب سننا چاہتا تھا۔ میں نے عاشق علی کو بلایا

اور کہا۔ ”میں آپ کو بڑے آنسو سے اطلاع دینا ہوں کہ آپ کے والد صاحب کی میت

تبرستان میں نہیں جائے گی۔ ہسپتال پورٹ مارٹم کے لیے جائے گی۔“

میں نے دونوں کے چہروں کو دیکھا۔ عاشق علی نے آہستہ سے پوچھا۔ ”کیوں جی؟“

اور راحت کا رنگ نمایاں طور پر پیلا پڑ گیا۔ وہ تو بے ہوش ہونے والی تھی۔ اس کے ہونٹ

پہلے لاش عاشق علی کے حوالے کر دی گئی اور مجھے پوسٹ مارٹم رپورٹ ملی۔ ممتوئی کو زہر دے کر مارا گیا تھا۔ یہ کوئی عام قسم کا زہر نہیں تھا۔ مقتول کے منہ سے کے اجزاء جگوار خون یابارٹری معاخذے کے لیے بھیجے گئے تو رپورٹ ملی کہ مقتول کو ٹکڑوں میں دی گئی ہے۔ ٹکڑیوں کے متعلق آپ کو کچھ بتا دینا ضروری سمجھتا ہوں۔ یہ زہر تمباکو کے پتوں سے حاصل کیا جاتا ہے۔۔۔ ہم جو تمباکو سگریٹ اور حقے کے ذریعے پیتے ہیں، اس میں بھی ٹکڑیوں موجود ہوتی ہے جو تمباکو نوش دھوئیں کے ذریعے اپنے خون میں شامل کرتے اور اپنی عمر کم کرتے رہتے ہیں۔ اگر ٹکڑیوں ذرا زیادہ مقدار میں چائے، کھانے، یا مشروب میں ملا کر کسی کو پلا دی جائے تو پیتے والے کے خون میں شامل ہو کر اسے چند دنوں میں اس طرح مار دیتی ہے کہ موت قتل نہیں لگتی بلکہ حرکت قلب بند ہو جاتی ہے۔ اگر بہت زیادہ مقدار میں پیٹ میں چلی جائے تو فوری موت کا باعث بنتی ہے۔ میں آپ کو خبردار کرنے کے لیے یہ باتیں بتا دوں۔ ایک یہ کہ آپ سگریٹ یا حقہ پیتے ہیں تو یوں سمجھ لیجئے کہ آپ اپنے جسم کی تھائی ہم قوتیں بیکار کر کے اپنے آپ کو قتل کر رہے ہیں اور دوسری بات یہ نوٹ کر لیں کہ کسی وقت قتل کرنے کے لیے اگر آپ ٹکڑیوں استعمال کرنا چاہتے ہیں تو آپ کے بچڑے جانے کے امکانات پوری طرح روشن ہیں۔

میں نے جب ناکوٹین کا نام پڑھا تو مجھے مقتول کی بیوہ راحت کی وہ بات یاد آئی جو اس نے کہی تھی۔ ”کل صبح جاگے تو کہنے لگے کہ دل ڈوب رہا ہے اور سر میں گرانی ہے۔ چاکر جی محسوس ہونے لگا ہے۔“ میں نے جرح کر کے یہ بھی ثابت کر لیا تھا کہ راحت نے مقتول نوڈاکٹر کے پاس نہیں جانے دیا تھا اور اسے شاکر اس کا سر دیا ہی رہی تھی۔ یاد رکھیے مقتول کی عمر اڑتالیس سال تھی۔ یہ عین تندرستی ہے کہ نوجوان بیوی جب اسے شاکر

خشک ہو گئے اور کانپے بھی۔ میں نے اپنے اسے۔ ایس۔ آئی اور دوکانیٹیلوں کو بلایا۔
ستونی کی بیٹی رفعت کے نام سے رپورٹ درج کی اور جو کاغذی ابتدائی کارروائی ضروری
تھی وہ کی اور لاش پوسٹ مارٹم کے لیے بھجوا دی۔ اس دوران عاشق علی اور راحت نے
مجھے الگ جاکر اس مقصد کے لیے رشوت پیش کی کہ میں لاش کا پوسٹ مارٹم نہ کرواؤں۔ وہ کہنے
تھے کہ مجرم کی بے عزتی ہوگی۔ بات کچھ بھی نہیں ہے۔ وہ دل کی حرکت بند ہونے سے مرہا
ہیں۔ رشوت نے میرے شکوک پہنچتے کر دیئے ہیں نے عاشق علی اور راحت سے کہا کہ ان
گھر میں ہر وقت حاضر رہیں اور انہوں نے تفتیش سے فرار حاصل کرنے کی کوشش کی تو یہ
جرم تصور ہوگا۔ عاشق علی کو جب یہ پتہ چلا کہ اس کی بہن نے رپورٹ درج کرائی ہے
تو اس نے کہا۔

”یہ جائیداد کو پکڑ ہے۔ جب سے اس کی شادی کی ہے وہ اپنا حصہ مانگ رہی ہے۔ اس کا خاندان اسے اگسار ہے۔ اب وہ پریشانی کرنا چاہتی ہے تاکہ اسے حاصل جائے۔“ میرے پوچھنے پر اس نے بتایا کہ تمام جائیداد ابھی باپ کے نام ہے۔

۹۰ اچھے چلن کی لڑکی نہیں بنتی

منٹنی کا کاروبار بھی تھا اور زمیندارہ بھی۔ قصبے میں اس کی چار دکانیں کر لے؛ چڑھی ہوئی تھیں۔ عاشق علی دس جماعت پاس کر کے باپ کے کاروبار میں لگ گیا تھا۔ یہ گھرانہ روپے پیسے والا تھا، لیکن تعلیم واجب تھی۔ چونکہ گھر میں رانے تھے اس لیے۔ لوگ اپنے آپ کو سیانے بھی سمجھتے تھے اور کوئی غلط حرکت کرنا چاہیں تو دیر ہی سے گزر گئے تھے۔ میں نے غمزدہ کو ہدایات دے کر معرود کر دیا۔ سورج غروب ہونے سے کچھ دیر

تجربہ کار آدمی کو بھی شک نہیں ہوا تھا کہ اسے زہر دیا گیا ہے۔ اکثر اوقات عام قسم کے نیز زہر دے کر قتل کی وارداتیں کی جاتی ہیں۔ یہ زہر دوسے چار گھنٹوں میں لاش پر اپنے اثرات نمایاں کر دیتے ہیں۔ بعض لاشوں کا رنگ نیلا ہو جاتا ہے۔ بعض کی جلد پھٹنے لگتی ہے اور بعض لاشوں کے منہ سے جھاگ پھوٹنے لگتی ہے۔ غرض زہر کی ماری ہوئی لاش صحت بتا دیتی ہے کہ موت قدرتی نہیں، یہ قتل ہے۔ رفعت کے باپ پر ایسے کوئی آثار نہیں تھے۔ پھر رفعت کو زہر کا شک کیوں ہوا؟ میرے ذہن میں یہ خیال بھی آیا کہ جو بہن اپنے بھائی کو پھانسی کے تختے پر کھڑا کر سکتی ہے وہ اپنے باپ کو زہر بھی دے سکتی ہے اور یہ جائیداد کی خاطر بھی ہو سکتا ہے۔ لیکن اس خیال نے مجھے پریشان کر دیا کہ مقتول کی فوجوان بیوہ، راحت نے مقتول کو دفن کرنے میں جلدی کیوں کی؟ رفعت کے متعلق میں نے کہا ہے کہ جسمانی اور دماغی لحاظ سے نیز قتل۔ وہ مجھے چالاک بھی نظر آنے لگی۔ اس کا خاوند باہر بیٹھا ہوا تھا۔ میں نے رفعت کو باہر بھیج کر اسے بلایا۔ میں دیکھنا چاہتا تھا کہ وہ کیسا آدمی ہے۔ اس سے میں نے پہلا سوال یہ پوچھا۔

”کیا آپ کو بھی شک تھا کہ آپ کے سسر کو زہر دیا گیا ہے؟“

اس نے نہایت پختہ اور دو ٹوک جواب میں کہا۔ ”شک نہیں جی، یقین کریں۔“

اس کی بیوی بدعاش عورت ہے۔ عاشق علی بدعاش آدمی ہے۔“

جہاں تک شک کا تعلق تھا وہ تو ہو سکتا تھا کیونکہ مقتول بظاہر تندرست تھا اور

شک کی دوسری وجہ فوجوان بیوی، اس کے خاوند کا بیٹھا ہوا اور جائیداد تھی۔ مگر جس طرح

رفعت اور اس کا خاوند دو ٹوک انداز سے فیصلہ دے رہے تھے، اس طرح تو بہن بھی بات

نہیں کر سکتا تھا۔ میں نے اس سے چند اور باتیں پوچھیں۔ میں صبرت یہ معلوم کرنا چاہتا تھا

اس کا سردار ہی ہوگی تو وہ اپنے حشر سے بے خبر ہو کر ہو گیا ہوگا۔ بڑھا پے میں فوجوان لڑکی کے ساتھ شادی کرنے کا پہلا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بڑھان من مرید ہو جاتا ہے۔ یہ مقتول بھی بیوی کے حسین چال میں نہیں گیا اور جان دے دی مگر مجھے شہادت کی ضرورت تھی۔ یہ تو میری تیسرا آزمائش تھیں جو غلط بھی ہو سکتی تھیں۔ مقتول کو زہر ضرور دیا گیا تھا لیکن یہ بھی ممکن تھا کہ کسی اور نے دیا ہو۔ اگر بیوی نے ہی دیا ہے تو کسی چاہنے والے کے ساتھ مل کر دیا ہوگا۔ بہر حال میں ابھی اسے حراست میں نہیں لے سکتا تھا نہ لینا چاہتا تھا۔ اسے اور عاشق علی کو شامل تفتیش کر کے پابند کر لیا۔

میں نے سب سے پہلے عاشق علی کی بہن رفعت کے بیان لیے۔ اس سے پوچھا

اسے کیسے شک ہوا تھا کہ اس کا باپ قدرتی موت نہیں مرے۔ لڑکی خامی و بے بین تھی۔

جسمانی لحاظ سے بھی چست تھی اور دماغی لحاظ سے بھی نیز۔ میرے اس سوال کے جواب

میں اس نے کہا کہ یہ بعض شک تھا جس کی وجہ یہ تھی کہ عاشق علی اور راحت کی آپس

میں بہت تہ تکلفی تھی۔ راحت کے متعلق اسے یقین ہو گیا تھا کہ وہ اچھے چال چلن کی

لڑکی نہیں۔ اس نے اسے اپنے چھوٹے بھائی کے ساتھ قابل اعتراض حالت میں دیکھا

تھا۔ میں نے اس سے یہ بھی پوچھا کہ کیا اسے اپنے بھائی پر شک ہے کہ اس نے راحت

کے ساتھ مل کر اپنے باپ کو زہر دیا ہے؟

رفعت نے کہا۔ ”شک نہیں، مجھے تو یقین ہے کہ ابا جان کو زہر دینے میں عاشق

علی بھی شریک ہے۔“

وہ کوئی قابل اعتماد شہوت پیش نہ کر سکی۔ اس کی باتیں کچی تھیں۔ مجھے خیال

آیا کہ اس نے زہر کے شک کا اظہار کیا اور یہ صحیح نکلا۔ حالانکہ لاش کو دیکھ کر مجھ جیسے

جو کچھ بتاؤں وہ میرے خاوند کو نہ بتائیں۔ میرے سماگ کا معاملہ ہے۔ بات یہ ہے کہ میرا خاوند ہر لحاظ سے اچھا آدمی ہے اس کے دل میں میری محبت بھی ہے۔ اس میں صرت نقص ہے کہ جائیداد اور روپے پیسے کا لالچی ہے۔ شادی کے بعد اس نے مجھے کہنا شروع کر دیا تھا کہ میں اپنے باپ سے جائیداد کا حصہ مانگوں۔ وہ دراصل چاہتا ہے کہ بازار میں آتا جان کی جو چار دکانیں کرائے پر چڑھی ہوئی ہیں وہ مجھے دے دیں۔ اس کے علاوہ کچھ نقد رقم دے دیں۔ مجھے یہ مطالبہ پسند نہیں آتا تھا۔ میں ٹانسی رہی۔ اس سے خاوند کا رویہ بدل گیا۔ خاوند نے مجھے اس نذر پر نشان کرنا شروع کر دیا کہ میری اتنی اچھی ازدواجی زندگی جہنم بن گئی۔ میں نے تو قین بابر آتا جان سے خاصی رقم لی اور اپنے خاوند کو دی۔ یہ اس کی عادت ہو گئی اور مجھے اکسانے لگا کہ میں آتا جان سے پیسے لاتی رہا کروں۔ اتنے میں آتا جان نے شادی کر لی اور ان پر نہی بیوی کا قبضہ ہو گیا۔ مجھے پیسے ملتے بند ہو گئے۔ . . .

”راحت (سوتیلی ماں) میری ہم عمر تھی اس لیے میں اسے ماں والا احترام نہیں دے سکتی تھی۔ پھر میں نے اسے اپنے چھوٹے بھائی کے ساتھ بیہودہ حالت میں دیکھا تو اس کے ساتھ لڑائی ہو گئی۔ میرا بڑا بھائی بھی اس کا سر ید بن گیا۔ ادھر خاوند نے مجھے پریشان کرنا شروع کر دیا کہ میں آتا جان سے جائیداد کا حصہ مانگوں۔ میں نے مانگا تو آتا جان نے جواب دے دیا۔ بڑے بھائی نے میری بے عزتی کی اور راحت نے بھی مجھے برا بھلا کہا۔ وہاں میں نے جانا بہت کم کر دیا۔ خاوند نے مجھے طلاق کی دھمکی دے دی۔ اگر میری ماں زندہ ہوتی تو میں دیہری سے طلاق لے کر اپنے گھر چلی جاتی مگر اب میرے لیے گھر میں کوئی جگہ نہیں تھی۔ طلاق سے میں اتنا ڈرتی ہوں کہ اس کی جگہ موت کو خوش

کہ اس شخص کی ذہنیت اور سوچ کیا ہے۔ تقریباً ایک گھنٹے کی جرح اور گپ شبن سے میں نے یہ راستے قائم کی کہ یہ چالاک نہیں ہے چالاک بننے کی کوشش کر رہا ہے اور اس کی نظر مغنزل کی جائیداد پر ہے جس میں سے وہ اپنی بیوی کا حصہ حاصل کرنا چاہتا ہے۔ یہ انکشاف بھی ہوا کہ اس کی بیوی، رفعت نے اپنے باپ سے حصہ مانگا بھی تھا اور باپ نے اسے کہا تھا کہ ابھی جائیداد تقسیم نہیں ہوئی۔ جب کروں گا تو حصہ دے دوں گا۔ اس مطالبے کا علم عاشق علی کو ہو گیا تھا۔ اس نے اپنی بہن کو برا بھلا کہا تھا اور اسی سلسلے میں عاشق علی اور رفعت کے خاوند کی بھی ٹوٹو میں میں ہو گئی تھی۔ عاشق علی نے یہ بھی کہا تھا کہ میں جائیداد میں سے ایک ارب تک نہیں دوں گا۔ راحت نے بھی رفعت اور اس کے خاوند کی بے عزتی کی تھی۔

میں نے اسے باہر بھیج کر رفعت کو بلایا اور اپنا ہجو ذرا سخت کر دیا۔ میں نے کہا۔ ”تمہارا خاوند مجھے کچھ ایسی باتیں بتا گیا ہے جو تم نے دانستہ نہیں بتائیں۔ اب مذ سے جو لفظ لگانا تو یہ سوچ لینا کہ یہ لفظ تمہیں چودہ سال کے لیے جیل میں بند کر سکتا ہے اس کا رنگ جو پہلے ہی صاف تھا گھبراہٹ سے سفید ہو گیا۔ میں نے کہا۔ ”تمہیں معلوم تھا کہ تمہارے باپ کے جسم میں زہر ہے۔ تمہیں کس طرح پتہ چلا تھا؟ یہ زہر تم نے دیا تھا؟ تمہارے خاوند نے؟“

وہ ٹپٹا اٹھی۔ ہلکا کر بولی۔ ”آپ سارے محلے سے پوچھ سکتے ہیں کہ میں اپنے سسرال میں تھی۔ میرا خاوند بھی اپنے گھر تھا۔“ میں نے اسے پہن نہ لینے دیا۔ جرح کے ایسے ایسے بم چھینکے کہ اس کے پاؤں تلے سے زمین کل گئی اور وہ رونے لگی۔ میں نے اسے بالکل نسا نہ دی اور اس سے کوئی ہمدردی کی۔ اس نے کہا۔ ”مجھ پر یہ احسان کریں کہ یہ

میں نے جو کچھ کیا ہے وہ طلاق سے بچنے کے لیے کیا ہے۔“

کیا میڈی باپ کو زہر دے سکتی ہے؟

چاہئے تو یہ تھا کہ اس کے خاندان کو میں حالات میں بند کر دیتا لیکن مجھے اس لڑکی کا خیال آگیا کہ یہ کم بخت اسے طلاق دے دے گا۔ یہ دونوں خوش قسمت تھے کہ مرنے والے کو زہر ہی دیا گیا تھا اور یہ محض اتفاق تھا کہ رفعت کے خاندان نے ایک نالگ کھیلاد اور قتل کی ایک واردات بے نقاب ہو گئی ورنہ کسی کو شک تک نہ ہوتا کہ یہ قتل ہے۔ میں نے لڑکی کو الگ بٹھا دیا اور اس کے بیان پر غور کرنے لگا جہاں تک جذبات کا تعلق تھا اس لڑکی نے مجھے متاثر کر لیا تھا۔ لیکن تشویش جذبات سے نکل کر کی جاتی ہے۔ میں نے رفعت اور اس کے خاندان کو مستتبہ افراد قرار دے دیا۔ یہ ممکن تھا کہ مرتضیٰ (رفعت کا خاندان) نے ہی رفعت کے باپ کو زہر دلا دیا ہو اور رفعت بھی اس میں شریک ہو۔ یہ محض نالگ نہیں تھا جو مرتضیٰ نے کھیلنے کی کوشش کی تھی میں نے اسے اندر بلایا اور جرح شروع کر دی۔ صاف پتہ چلتا تھا کہ وہ بے ہوش ہو جائے گا۔ میں اسے بار بار یہی کہتا تھا کہ تمہیں یہ خیال کس طرح آیا کہ رفعت کے باپ کا ہارٹ فیل نہیں ہوا اور اسے زہر دیا گیا ہے۔ اس نے اکھڑے اکھڑے جواب دیئے جنہوں نے مجھے گہرے شک میں ڈال دیا۔ میں نے رفعت کو الگ بٹھا دیا اور مرتضیٰ کو الگ۔ مرتضیٰ سے کہا۔

”اچھی طرح سوچو کہ تم انقبال جرم کرنا چاہتے ہو یا میں تشویش کا لمبا پیکر کاٹ کر تم تک پہنچوں۔ اس صورت میں مجھ سے کسی رعایت کی توقع نہ رکھنا۔“

ہو کر قبول کر دوں گی۔ میری ساس اور سسر بھی اپنے بیٹے جیسی ذہنیت کے لوگ ہیں۔ انہوں نے بیٹے کی حمایت کی اور میرا جینا حرام کر دیا۔ پھر آج صبح آبا جان کے مرنے کی اطلاع ملی اور یہ بھی پتہ چلا کہ ان کا ہارٹ فیل ہوا ہے۔ گزشتہ ایک سال میں ہم سب دیکھ چکے تھے کہ راحت بڑے بھائی کو مٹھی میں لے چکی ہے اور میرے چھوٹے بھائی تک کو ناپاک کر چکی ہے۔ لہذا میرے خاندان نے کہا کہ تمہارے آبا جان قتل ہوئے ہیں۔ ان کا ہارٹ فیل نہیں ہوا۔ میں نے یہ بالکل نہیں سوچا تھا کہ تمہارے میں آکر رپورٹ درج کر اؤں گی۔ یہ میرے خاندان نے سوچی تھی اور اس نے مجھے کہا تھا کہ پولیس فوراً آجائے گی پھر تم اپنے بھائی اور راحت کو یہ دھکی دینا کہ مجھے میرا حصہ اور میں ہزار روپیہ نقد دے دو تو میں کیس واپس لے لوں گی۔ میں نے صاف انکار کر دیا۔ اس نے مجھے طلاق کی دھمکی دی۔ طلاق کے تو مرنے نام سے میرا دل ڈوب جاتا ہے۔ میں اس کی باتوں میں آگئی اور آپ کو رپورٹ دی۔ پھر آپ آگئے۔ اب مجھے دوسرا قدم اٹھانا تھا۔ اپنے بھائی کو دھکی دینی تھی، لیکن آپ نے اگر ساری کارروائی اتنی جلدی سے کی کہ مجھے اپنے بھائی سے بابت کرنے کا موقع ہی نہ ملا۔“

”تمہارا یہ خیال تھا کہ میں بند رہوں۔“ میں نے کہا ”تم نے کہا کہ میرے باپ کو زہر دیا گیا ہے تو میں اٹھ دوڑا۔ پھر تم کہتی کہ نہیں، اسے زہر نہیں دیا گیا میں کیس واپس لیتی ہوں تو میں بندر کی طرح واپس آ جاتا۔ تم بھائی سے جانسیلا اور رقم ایشٹھنے کے لیے مجھے انگلیوں پر نچانا چاہتی تھی۔“

”ہوسسکیاں لے کر رونے لگی اور بولی۔“ میں نے آپ کو سچی بات بتا دی ہے۔

ثابت نہیں کر سکتی۔ لہذا وہ میرے ہر وار سے اس طرح بچ کر نکل جاتی کہ میں پریشان ہو گیا۔ یہ تو مجھے یقین ہو چکا تھا کہ اس نے اپنے خاندان کو زہر دیا ہے گلاس کے زیرِ یقین بلا ڈالا اور میرے دل میں یہ شک پیدا کر دیا کہ مقتول کو زہر دے گا اور اس کے خاندان نے زہر دیا ہو گا لیکن میری زیادہ تر توجہ راحت اور عاشق علی پر تھی۔

اس دوران میرے اسے۔ ایس۔ آئی نے مجھے باہر بلایا۔ تلاشی میں وہ میرے ساتھ تھا۔ میں نے اسے کچھ ہدایات دی تھیں۔ وہ ان پر عمل کر رہا تھا۔ اس نے مجھے شیشے کا ایک گلاس دیا۔ اس کے متعلق ایک دو باتیں بتائیں اور چند باتیں میرے کان میں ڈال دیں۔ میں کمرے میں گیا اور راحت سر جھکائے بیٹھی تھی۔ اس نے سر اٹھایا تو میں نے اس کے اور اپنے سامنے رکھی ہوئی چٹائی پر شیشے کا گلاس رکھ دیا اور اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔ اس نے نظریں گلاس پر ڈالیں اور پھر میری طرف دیکھنے لگی۔ میں نے اس کے چہرے پر تبدیلی دیکھی۔ میں خاموش رہا۔ وہ جھنجھلا کر بولی۔

”یہ گلاس آپ نے میرے آگے کیوں رکھ دیا ہے؟“

”ناکہ تم اسے اچھی طرح پہچان لو۔“ میں نے جواب دیا۔ ”تم نے پرسوں عاشق علی کے ہاتھ سے یہ گلاس چھین لیا تھا؟ اسے اس میں پانی کیوں نہیں پینے دیا تھا؟“

اس کی گھبراہٹ بڑی صاف تھی لیکن سنبھل کر بولی۔ ”یہ نوکر کا گلاس ہے۔ اسے معلوم نہیں تھا۔“

میں نے گلاس اٹھا کر اپنے پاس رکھ لیا اور راحت سے پوچھا۔ ”عاشق علی اپنے باپ کے ساتھ کیا جھگڑا تھا؟“ یہ باتیں نوکر نے لے۔ ایس۔ آئی کو بتائی تھیں۔

”باپ بیٹے کے درمیان کوئی بات ہو گی۔“ اس نے جواب دیا۔ ”مجھے تو کچھ علم نہیں۔“

”جناب۔“ اس نے رندھی ہوئی آواز میں کہا۔ ”میری اس کے ساتھ نہ کوئی دشمنی تھی نہ کوئی لالچ۔ معلوم ہوتا ہے میری بیوی نے آپ کو میرے خلاف کوئی جھوٹی بات بتادی ہے۔“

”جناب۔“ میں نے اسے کہا۔ ”آپ کی بیوی بھی آپ کی طرح مشتبہ ہے اور آپ کی طرح وہ بھی پابند کر لی گئی ہے۔“

میں نے مقتول کے گھر چھاپا مارا اور تلاشی اس طرح لی کہ ہر ایک ٹرنک اور سوٹ کیس کی ہر ایک چیز دیکھی۔ کوئی کاغذ نہیں دیکھے نہ چھوڑا۔ وہیں راحت کو بیٹھا ہوا۔ یہ تو وہی جانا تھا کہ وہ اتنا بال جرم نہیں کرے گی۔ اب تو وہ یہ بھی دیکھ چکی تھی کہ خاندان تلاشی میں کوئی ایسی چیز یا تحریر برآمد نہیں ہوئی جو جرم یا مجرم کی نشاندہی کرے۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ وہ دلیر ہو گئی۔ وہ اسی بات پر غماص رہی کہ یہ شادی اس کی مرضی کے مطابق ہوئی تھی اور وہ مقتول کے ساتھ مطمئن اور خوش تھی۔ میں نے عاشق علی اور اس کے چھوٹے بھائی کے متعلق اس کے تعلقات معلوم کرنے کے لیے بہت سے سوال کیے۔ الفاظ بدل بدل کر اسے گھیرنے کی کوشش کی مگر اس نے اصل بات تسلیم نہ کی اور کہا کہ میں ان لوگوں کی سوتیلی ماں ہوں اور وہ مجھے ماں ہی سمجھتے رہے ہیں۔

میں نے پوچھا۔ ”کیا تم دوسری شادی کر دو گی؟“

اس نے جواب دیا۔ ”میں سوچ رہی نہیں سکتی۔ جیسے چاہا تھا وہ مر گیا ہے۔ میں تو اسی گھر میں رہوں گی۔“

میں حیران تھا کہ لڑکی بچہ کا رہے یا اسے کسی نے بچہ کا رہنا دیا ہے یعنی جس کی خاطر اس نے خاندان کو زہر دیا ہے، اس نے اسے یقین دلایا ہے کہ پولیس بہ جرم

میں نے یہ ظاہر کر کے کہ میں نے اس کی ساری باتیں تسلیم کر لی ہیں، اسے باہر بھیج دیا اور عاشق علی کو اندر بلا دیا۔ اس نے آتے ہی مجھ سے پوچھا۔ ”خدا کے لیے مجھے کچھ سمجھائیے کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔ ایک نورالد صاحب کا سایہ سر سے اٹھ گیا دوسرے پولیس نے ہم پر حملہ کر دیا۔ یہ کڑوہ نلارو قطار بردہ لگا۔“

”کیا یہ اچھا نہیں ہوا کہ آپ کے سر سے باپ کا سایہ اٹھ گیا ہے؟“ میں نے کہا۔

”آپ کا تران کے ساتھ ہمیشہ جھگڑا رہتا تھا۔“

”اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ میں ان کی موت پر خوش ہوں۔“ اس نے کہا۔ ”آپ کا یہ کہنا غلط ہے کہ میرا ان سے ہمیشہ جھگڑا رہتا تھا۔“

”کبھی کبھی؟“

”جی کبھی کبھی“ اس نے کہا۔ ”یہ بھی تھوڑا عرصہ ہوا کہ آبا جان مجھ سے بیڑنے لگے تھے۔“

”دوسری شادی کے بعد۔“ میں نے کہا۔

”جی۔“ اس کے منہ سے ”جی“ پھسل گیا جسے ننگنے کے لیے اس نے کوئی بات بنانے کو کشش کی لیکن میں نے ہمدردی اور اس کے لیے میں کہا۔

”جو آدمی بڑھاپے میں نورجان لڑکی سے شادی کر لیتا ہے وہ اپنے جوان بیٹے کو بھی دشمن سمجھنے لگتا ہے اور اگر کوڑھا صاحب جائیداد ہو تو اسے یہ دم ہو جاتا ہے کہ اس کا جوان بیٹا اس سے اس کی جوان بیوی اور جائیداد چھین لے گا۔ یہی مصیبت آپ کے ہاں پیدا ہو گئی تھی۔“ میں نے بے میں اور زیادہ درد پیدا کر کے کہا۔ ”آپ پریشان نہ ہوں۔ والد صاحب کا کاروبار سنبھال لیں۔ انہیں شادی کم از کم اس عمر میں

نہیں کرنی چاہئے تھی۔ آپ کی بدقسمتی یہ تھی کہ راحت آپ کو بہت چاہتی تھی۔ یہ بالکل قدرتی بات تھی۔ وہ آخر جوان ہے۔ جوانی انسان کو مجبور کر دیتی ہے۔“ میں نے لمبا چوڑا لیکچر شروع کر دیا۔ عاشق علی ”جی جی“ کہتا رہا۔ میں اس کی کمزوری سے آگاہ تھا۔ یہ اس کی بہت بڑی کمزوری تھی کہ پولیس اس کے گھر کی تلاشی لے کر اس کے گھر بیٹھی نفیشتن کر رہی تھی۔ پولیس انسپکٹر کو وہ دزدہ یا بھوت سمجھ رہا تھا مگر اس بھوت نے انسانوں کی طرح پیدا اور ہمدردی کی باتیں شروع کر دیں تو وہ بریت کی ڈھیری بن گیا۔ میں نے اس کے دل و دماغ پر قبضہ کر لیا اور اسے اس مقام تک لے آیا کہ اس نے میری اس بات پر بھی ”جی“ کر دی کہ راحت کا چال چلن اچھا نہیں اور اس نے تمہیں اپنی عیاشی کا ذریعہ بنایا تھا۔ اس کے منہ سے ”جی“ نکل گئی تو میں نے کسی رد عمل کا اظہار نہ کیا اور کہا۔

”آپ کے والد صاحب کو شاید پتہ چل گیا تھا کہ راحت کے ساتھ آپ کے تعلقات قابل اعتراض ہیں۔ جھگڑے کی وجہ یہی تھی اور پھر آپ نے انہیں یہ بھی کر دیا کہ جائیداد آپ کے نام منتقل کر دی جائے۔ ادھر آپ کی بہن نے اپنے حصے کا مطالبہ کر دیا۔ اس سے آپ کے والد صاحب اور زیادہ غصے میں آ گئے۔“

”بہن کو تو میں نے بھی ڈانٹ دیا تھا۔“ اس نے کہا اور چھپکی سی مسکراہٹ سے پوچھا۔ ”آپ کو یہ باتیں کس نے بتائی ہیں؟“

”مجھ سے کچھ بھی چھپا ہوا نہیں۔“ میں نے اسے کہا اور گلاس اس کے سامنے رکھ کر پوچھا۔ ”اس روز آپ اس گلاس میں پانی پینے لگے تھے تو راحت نے یہ آپ کے ہاتھ سے چھین کر لیا تھا؟“

”کہتی تھی کہ یہ نوکر کا ہے۔“

”یہ کہاں رکھا تھا؟“

”یاد رکھیے خانے میں۔“ اس نے جواب دیا۔ ”پانی پینے کے لیے میں خود ہی باورچی خانے میں چلا گیا۔ یہ گلاس الگ رکھا تھا۔ میں نے اس میں پانی ڈالا تو راحت آگئی۔ میں نے گلاس میرے ہاتھ سے چھین کر الگ رکھ دیا اور کہا کہ مجھ سے پانی کیوں نہیں مانگا۔ یہ نوکر کا گلاس ہے۔ اس نے مجھے دوسرے گلاس میں پانی ڈال دیا تھا۔“ اس نے مجھ سے پوچھا۔ ”یہ گلاس آپ نے اپنے پاس کیوں رکھا ہوا ہے؟“

”آپ کو کچھ بھی معلوم نہیں؟“ میں نے پوچھا۔

”یہی تو میں نے آپ سے پوچھا ہے۔“ اس نے کہا۔

”اس گلاس میں آپ کے والد صاحب کو زہر دیا گیا تھا۔“ میں نے کہا۔ ”اور یہ بات آپ کے علم میں ہے۔“ اس کی آنکھیں ٹھہر گئیں۔ اس کے منہ سے سرگوشی نکلی۔ ”زہر مجھے علم ہے؟“ پھر اس نے آگے جھک کر پوچھا۔ ”آپ نے یہ کیسے کر دیا ہے کہ مجھے ہر کا علم ہے؟“

میں نے اسے کہا۔ ”آپ مجھ سے سوال نہ پوچھیں۔ میرے سوالوں کا جواب دیتے چاہئیں۔ یہ معتمد علی ہو جائے گا۔ اگر آپ میری مدد کریں تو ہم دونوں کا کام آسان ہو جائے گا۔ بہتر ہے کہ پولیس سٹیشن چلتے ہیں۔“

میں نے راحت کو دانستہ نظر انداز کر دیا۔ اس کے گھر سے نکلتے وقت میں نے اسے کہا۔ ”آپ ناراض تو مزور رہوں گی لیکن میں اپنی ڈیوٹی سے مجبور ہوں۔“ میں اسے ہیرا اور پریشان چھوڑ کر عاشق علی کو ساتھ لیے خانے میں چلا گیا۔ میں نے اپنا انداز دوستانہ رکھا۔ اس کی خاطر تواضع کی اور دوستانہ لب و لہجہ میں گفتگو شروع کی۔ شام تک وہ

تو مان گیا کہ راحت کے ساتھ اس کے تعلقات ناجائز تھے اور راحت پر وہ پوشی کے لیے مقتول کے ساتھ نہایت اچھا سلوک کرتی تھی۔ راحت کے متعلق عاشق علی نے یہ نیا انکشاف کیا کہ اس کا رشتہ الزام کے ایک آدمی کے ساتھ طے ہو گیا تھا، لیکن راحت کی شادی مقتول کے ساتھ کر دی گئی۔ عاشق علی کے الفاظ کچھ اس قسم کے تھے۔ ”ابتداء میں راحت کسی کے ہاتھ نہیں آتی تھی۔ ایسے معلوم ہوتا تھا جیسے کسی جنگلی جانور کو بھجورے میں بند کر دیا گیا ہو۔ کچھ کھاتی پیتی بھی نہیں تھی۔ پہلے تو روتی رہی، پھر اس نے رانی جھگڑے شروع کر دیے۔ میں نے اسے ہلانے بھسلانے کی ذمہ داری سنبھال لی تو وہ میرے ساتھ کھل گئی۔ اس نے میرا دماغ بھی خراب کر دیا۔ اس کے بعد وہ خوش رہنے لگی۔ وہ آٹھویں دسویں روز اپنے گھر چلی جاتی تھی۔ کچھ عرصہ بعد مجھے پتہ چلا کہ وہ اس شخص سے ملتی ہے جس کے ساتھ اس کا رشتہ طے ہوا تھا۔“ عاشق علی نے مجھے تفصیل سے بتایا کہ اس نے بیچھا کر کے راحت کو اس آدمی کے ساتھ بکھا تھا۔ اس کا نام انور تھا اور عمر عاشق علی جتنی یعنی بائیس تیس سال۔ عاشق علی نے مجھ پر ثابت کرنے کی کوشش کی کہ اپنے باپ کو زہر دینے میں وہ شریک نہیں ہے۔ اس نے بہت سی دلیلیں دے کر یہ ثابت کرنے کی پوری کوشش کی کہ راحت نے انور کے ساتھ مل کر اس کے باپ کو زہر دیا ہے۔

اس کی دلیلیں میرے لیے قابل قبول تھیں۔ انور ایک نیا مشتبہ تھا جو میرے سامنے آیا۔ میں نے عاشق علی کو مشتبہ فہرست میں سے خارج نہ کیا لیکن اسے یہ تاثر دیا کہ انور کا نام سامنے آجائے سے جی اب اسے مشتبہ نہیں سمجھتا۔ میرے سامنے اب پانچ مشتبہ افراد تھے۔ رفعت، اس کا خاوند، عاشق علی، راحت اور انور۔

راحت کے متعلق تو یقین ہو گیا تھا کہ زہرا سی نے دیا ہے۔ اب مجھے یہ معلوم کرنا تھا کہ اس کا ساتھی عاشق علی ہے یا انور۔ جنرول کا گھبراہٹ ان کے گرد تنگ ہوتا جا رہا تھا۔ میرا لے۔ ایس۔ آئی میری ہدایت کے مطابق اپنی خفیہ کارروائیوں میں مصروف تھا۔ مجھے کوئی سقم نہیں تھا۔ میں نے طے کیا تھا کہ اگلے روز راحت کو بانا عہد حراست میں لے لوں گا۔ رات کے نو بجے رہتے تھے۔ میں نے عاشق علی کو یہ کہہ کر چھٹی دے دی کہ وہ کل تو بجے صبح تھانے میں آ جائے۔ یہ میری بہت بڑی غلطی تھی۔ عاشق علی نے اعتراف کر دیا تھا کہ اس کا باپ کے ساتھ جھگڑا ہوتا رہتا تھا اور جھگڑے کی وجہ یہ تھی کہ اس کے راحت کے ساتھ بے جا تعلقات تھے۔ مجھے چاہیے تھا کہ اسے باقاعدہ گرفتار نہ کرتا تو تعینش کا پابند کر کے تھانے میں بٹھائے رکھتا اور اگر اسے گھر ہی بھیجتا تھا تو اس کی حرکات پر نظر رکھنے کے لیے آدمی مقرر کر دیتا۔ میں نے یہ غلطی کچھ سوچ کر ہی کی تھی لیکن غلطی آخر غلطی ہوتی ہے جس کا خمیازہ بھگتنا پڑتا ہے۔ میں نے عاشق علی کو گھر بھیج دیا اور مجھے وہم تک نہ ہوا کہ یہ میری اور عاشق علی کی آخری ملاقات ہے اور یہ کیس میرے ہاتھ سے نکل کر ان پینتہ درہزنوں اور ڈاکوؤں کے ہاتھ میں چلا جائے گا جو دین دھارے انگریزی حکومت کے قانون کا مذاق اڑاتے رہتے تھے۔

میں رات بہت دیر تک تعینش کا تانا بانا سیدھا کرتا رہا۔ اے۔ ایس۔ آئی سے متبادلہ خیالات بھی کیا۔ اس نے مشورہ دیا کہ راحت کو فوراً حراست میں لے لیا جائے۔ لیکن میں اسے صرف حراست میں لے کر اس کے ساتھی کو چوکتا نہیں کرنا چاہتا تھا۔ میں اسے اور اس کے ساتھی کو اکٹھا گرفتار کرنا چاہتا تھا۔ مجھے یقین تھا

کہ یہ قتل راحت نے اکیلے نہیں کیا۔ میں نے اگلے روز شام سے پہلے پہلے راحت اور عاشق علی یا انور کو گرفتار کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ اگلے روز نو بجے عاشق علی نہ آیا۔۔۔۔۔ دس بج گئے تو میں نے ایک کانسٹیبل کو بھیجا کہ وہ عاشق اور راحت کو تھانے لے آئے۔ اے۔ ایس۔ آئی کو میں نے انور کے گھر پر معلوم کرنے کے لیے بھیج دیا کہ کیا اس کا رشتہ راحت کے ساتھ طے ہوا تھا؟ اور اسے یہ بھی کہا کہ وہ انور کو تھانے میں لے آئے۔ اے۔ ایس۔ آئی کو ایک گھنٹہ بعد جانا تھا کیونکہ ایک اور تعینش کا کچھ کاغذی کام فوری طور پر کرنا تھا۔ وہ ابھی یہ کام کر رہا تھا کہ کانسٹیبل، عاشق علی کے چھوٹے بھائی اور انور کو ساتھ لے آیا۔ سولہ سال کی عمر کا یہ لڑکا بڑی طرح رو رہا تھا۔ کانسٹیبل نے بتایا کہ عاشق علی اور راحت غائب ہیں۔ عاشق علی کے چھوٹے بھائی نے بتایا کہ عاشق علی کو اس نے آخری بار اس وقت دیکھا تھا جب وہ کل میرے ساتھ تھانے آیا تھا۔ اس کے بعد وہ گھر نہیں گیا۔ راحت کے متعلق اس نے بتایا کہ شام کے بعد وہ راحت کے ساتھ رہا۔ رات نو بجے کے قریب راحت نے اسے کہا کہ جا کے سو جاؤ۔ وہ اسی کمرے میں سونا چاہتا تھا لیکن راحت نے اسے پہلا پھسلا کر دوسرے کمرے میں بھیج دیا۔ کوئی نصف گھنٹے کے بعد راحت اس کے کمرے میں گئی۔ جی بھیجی ہوئی تھی۔ لڑکا جاگ رہا تھا۔ اس نے راحت کو بلایا تو راحت نے کہا کہ میں نہیں دیکھنے آئی تھی۔ سو جاؤ۔ میں عاشق علی کا انتظار کر رہی ہوں۔ لڑکے نے اسے کہا کہ بھائی جان آ جاؤ تو مجھے جگا دینا۔ مجھے بہت فکر ہے۔ انہیں پولیس لے گئی تھی۔ رات کو اس کی آنکھ کھل گئی تو وہ یہ دیکھنے کے لیے کہ عاشق علی آ گیا ہے یا نہیں، اس کے کمرے میں گیا۔ جی بھائی۔ بستر خالی تھا۔ وہ راحت کے کمرے میں گیا۔ وہ بھی

میں نے اے۔ ایس۔ آئی کو شہر کی ناکہ بندی کے لیے بھیج دیا اور خود کو گنجلوں کو ساتھ لے کر راحت کے ماں باپ کے گھر چھاپ مارا۔ وہاں سے کچھ بھی نہ ملا۔ البتہ کچھ نئی باتیں معلوم ہو گئیں جو مختصراً یوں ہیں کہ راحت کا باپ بھلا مانس اور کمزور طبیعت کا آدمی تھا۔ راحت کی ماں کا اس پر اس قدر رعب تھا کہ بے چارہ گھر میں دجارتا تھا۔ راحت کا رشتہ انور کو دیا گیا تھا لیکن مقتول کی نظر راحت پر پڑی تو اس نے اس کا رشتہ مانگا۔ باپ راضی نہیں ہو رہا تھا۔ ماں نے باپ بیٹی پر اپنا فیصلہ ٹھونس اور شادی مقتول کے ساتھ کر دی۔ ماں نے مقتول سے دس ہزار روپیہ نقد لیا تھا۔ انور نے راحت کے باپ کو قتل کی دھمکی دی۔ باپ نے انور کی منت سماجت کی اور اسے بتایا کہ وہ گھر میں بے بس اور محصور ہے۔ انور نے پھر راحت کی ماں کو دھمکی دی۔ پھر راحت گھر آکر انور سے ملنے لگی۔ راحت کے باپ نے نو ساری باتیں بتادیں لیکن اس کی ماں باتیں گول کر رہی تھی۔ میں نے اسے الگ لے جا کر دھمکی دی کہ وہ صحیح بات نہیں بتائے گی، تو اسے تھانے لے جاؤں گا۔ کچھ تھانے کا توت تھا اور کچھ میری پوچھ گچھ کا اور کچھ دھندلا جس نے اس سے تمام باتوں کا اعتراف کر لیا۔ وہ مان گئی کہ اس نے بیٹی کا دس ہزار روپیہ لیا تھا اور وہ یہ بھی مان گئی کہ راحت شادی کے بعد انور سے ملتی تھی۔ یہ ایک شرط تھی جو راحت نے ماں سے منوائی تھی کہ اسے انور سے ملنے سے نہیں روکا جائے گا۔ ماں نے یہاں تک بتا دیا کہ راحت گھر آتی تھی تو باپ اگر گھر میں نہ ہو تو وہ خود انور کو گھر میں بلا دیتی تھی اور راحت کے پاس الگ کمرے میں بٹھا دیتی تھی۔ انور کے متعلق اس نے بتایا کہ بڑا سخت طبیعت کا آدمی ہے۔ اسے دقین رشتے ملے جو اس نے ٹھکرا دیئے۔ راحت کے متعلق ماں نے بتایا کہ خاوند کے مرنے کے بعد وہ ادھر نہیں آئی۔

غائب تھی۔ پھر اس نے جو بیٹی کے سارے کمرے دیکھے۔ بیت الخلاء اور غسل خانہ بھی کیا دونوں غائب تھے۔ اس نے نوکر کو جگایا اور رات روتے گزار دی۔ صبح وہ راحت کے ماں باپ کے گھر گیا۔ راحت وہاں بھی نہیں تھی بلکہ اس کے ماں باپ یہ سن کر پریشان ہو گئے کہ وہ اور عاشق علی غائب ہیں۔

ماں نے بیٹی کی قیمت وھول کی — دس ہزار روپیہ

لوکا اپنے گھر آیا۔ فٹوڑی دیر بعد کانسٹیبل عاشق علی کو بلائے چلا گیا۔ اسے بتایا گیا کہ راحت اور عاشق علی غائب ہیں۔ انور لڑکے کو اور نوکر کو اپنے ساتھ تھانے لے آیا۔ نوکر نے بتایا کہ اس نے راحت اور اسلم (لوٹے) کو شام کے دتر کھانا کھلایا تھا۔ راحت نے اسے کھانا روزمرہ کے وقت سے خاصا جلدی تیار کرنا کو کہا تھا۔ اس کے بعد اس نے راحت کو نہیں دیکھا۔ عاشق علی کے متعلق بھی اس نے بتایا کہ اس نے اسے نہیں دیکھا۔ ان دونوں سے میں نے جو باتیں معلوم کیں ان سے میں نے یہ اندازہ لگایا کہ عاشق علی کو جس وقت میں نے گھر جانے کی اجازت دی تھی، اس سے کوئی ایک گھنٹہ بعد دونوں غائب ہوئے ہیں اور ہوا یہی ہے کہ عاشق علی گھر گیا تو راحت اسلم کو اس کے کمرے میں بھیج چکی تھی اور پھر دیکھنے کو تھی کہ وہ سو گیا ہے یا نہیں۔ لوٹے نے اسی کے کمرے میں سونے کو کہا تھا لیکن راحت نے اسے دوسرے کمرے میں بھیج دیا تھا۔ اس سے ظاہر ہوتا تھا کہ عاشق علی اور انور نے فرار کا پردہ گرام پہلے سے طے کر رکھا تھا اور یہ پردہ گرام اس وقت طے ہوا ہو گا جب میں نے اس کے گھر کی تلاشی لی تھی۔

اقدام کرتے تھے۔ وہ دن اسی جھگ دوڑ میں گزر گیا۔ دوسرے دن دوبہانی تھا۔ میں آئے اور اطلاع دی کہ شہر سے دو میل دُور ایک قدرتی جوہر میں ایک شہری کی لاش پڑی ہے۔ کپڑے خون سے لال ہیں۔ میں قتل کی ایک اور واردات رجسٹر کرنے کے لیے چل پڑا۔ میڈکائٹسبل اور دوکانسٹیبلوں کو ساتھ لیا۔ لنگے میں بیٹھے اور روانہ ہو گئے۔ یہ دیہاتی مجھے ایسے علاقے میں لے گئے جہاں سے کم ہی لوگوں کا گزر ہوتا تھا۔ اُس زمانے میں وہ علاقہ ویران تھا۔ سرکنڈے اور جھاڑیاں تھیں اور درخت بھی تھے علاقہ زیر کاشت نہیں تھا۔ ایک بلڈنڈی گزرتی تھی جس پر دن کے وقت بمیل گاڑیاں یا کوئی بیاباد لوگ گزرتے ہوں گے۔ درنہ یہ راستہ عام نہیں تھا۔ دُور دُور تک کوئی گاڑی نہیں تھا۔ سنا تھا کہ کچھ عرصہ پہلے انگریز یہاں سونڈ کا شکار کھیلا کرتے تھے۔ اس وجہ سے بھی انہوں نے اس علاقے کو آباد نہیں ہونے دیا تھا۔

دیہاتیوں نے ایک جگہ تانکر رکوا دیا اور مجھے ایک طرف لے گئے کم و بیش ڈیڑھ سو گز دُور ایک جوہر کے کنارے لے گئے۔ گدھوں کی چڑچڑکی نو تناک آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ وہ لاش کو کھا رہے تھے۔ لاش جوہر کے کنارے پڑی تھی۔ وہاں بانی بہت تھوڑا تھا۔ کنارے پر سرکنڈے اور جھاڑیاں تھیں۔ لاش ان میں چھپی ہوئی تھی۔ یہ لاش عاشق علی کی تھی۔ ان دیہاتیوں کو یہ نظر نہیں آسکتی تھی۔ وہ ڈیڑھ سو گز دُور سے گزر رہے تھے۔ راستے میں ایک جگہ انہوں نے خون گرا ہوا دیکھا۔ زمین پر انہیں ایسے نشان نظر آئے جو صاف بتاتے تھے کہ یہاں کوئی لڑائی جھگڑا ہوا ہے۔ وہاں سے ایک نمایاں نشان ایک طرف کو جاتا تھا جیسے کسی انسان کو مردہ یا زندہ حالت میں گھسیٹ کر لے جایا گیا ہو۔ خون صاف نظر آتا تھا جو خشک تھا۔ زمین کی

میں انور کے گھر گیا۔ اس کے ماں باپ نے بتایا کہ انور بڑا ضدی لڑکا ہے۔ شادی کا نام نہیں لینے دیتا۔ میں نے پوچھا کہ وہ کہاں ہے تو باپ نے کہا کہ وہ اس کے ہاتھ سے نکل گیا ہے۔ اکثر گھر سے غائب رہتا ہے۔ اتنا خود سر ہو گیا ہے کہ والدین اس کے لیے پریشان ہیں کہ یا اپنی جان لے لے گا یا کسی کو مار ڈالے گا۔ رات کے باپ نے بتایا کہ اس لڑکی نے لڑکے پر قبضہ کر رکھا ہے۔ وہ اپنے گھر آتی ہے تو انور کو بلا دیتی ہے۔ اسے کپڑے اور پیسے دیتی ہے۔ باپ نے کہا۔ مجھے شک ہوتا ہے کہ رات مقتول کی برائے نام بیوی ہے۔ اس نے اور انور نے درپردہ شادی کر رکھی ہے۔ میں نے جب اسے بتایا کہ رات نے خاوند کو زہر دیا ہے اور وہ لاپتہ ہے، تو باپ رو پڑا اور کہنے لگا۔ "اس لڑکے نے مجھے جس طرح پریشان کر رکھا ہے اس سے بہتر تو یہ ہے کہ وہ پھانسی چڑھ جائے۔ دو دھوکہ صبر کروں گا۔ اب تو مجھے براوری ہیں اس نے سارے خاندان کو بدنام کر رکھا ہے۔ میں، اس کی ماں اور اس کی بہنیں کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہے۔ یہ بد بخت میرا ایک ہی لڑکا ہے۔"

قاتل قتل ہو گیا۔ اور لڑکی؟

ماں باپ کی پریشانی تو اپنی جگہ تھی، میری پریشانی یہ تھی کہ انور بھی لاپتہ، عاشق علی بھی غائب، رات گئی کس کے ساتھ ہے؟ شہر کی تاکہ بندی بیکار تھی۔ رات کے وقت تین ریل گاڑیاں یہاں رکتی تھیں۔ دو بیس بھی رات کو یہاں سے روانہ ہوتی تھیں۔ رات اور اس کے ساتھی کم و بیش دو سو میل دور پہنچ چکے ہوں گے۔ اب بڑے ملزموں کی نصیبر حاصل کر کے مختلف شہروں میں بھیجی تھیں اور ان کی تلاش کے لیے

ڈاکوؤں کی اولاد یا شاکر تھے جو جنگلوں کے وسیع علاقوں میں حکمرانی کرتے تھے۔ انگریزوں نے فوج کی مدد سے علاقے صاف کیے تھے۔ مگر ابھی تک یہ پیشہ زندہ تھا جہاں عاشق علی کی لاش پڑی تھی وہاں سے ایک میل دور جنگل شروع ہوتا تھا جس میں کھنڈے اور ادبچی نیچی چٹانیں بھی تھیں۔ میں یہی کچھ سمجھ سکا کہ یہ پیشہ درہزنوں کی واردات ہے جن میں دو اشتہاری مجرم تھے۔ ایک ٹنڈل کھلاتا تھا اور دوسرا مٹا بادشاہ۔ یہ پکڑے نہیں جاتے تھے۔ ان کا کوئی ایک ٹھکانہ نہیں تھا۔ ان کے پاؤں میں چکر تھا اور پولیس کو بھی وہ اسی چکر میں الجھائے رکھتے تھے۔ مگر سوچنے والی بات یہ تھی کہ عاشق علی راحت کو لے کر کہاں جا رہا تھا۔ وہ اس طرح ویرانے میں کس طرح پہنچ گئے؟ کیا وہاں ہوا ہو گا کہ ڈاکوؤں نے انہیں ریلوے سٹیشن سے ڈرا دھمکا کر ساتھ لیا اور یہاں آکر اسے قتل کر گئے اور رات کو ساتھ لے گئے؟

میں زمین کے نشان دیکھ دیکھ کر یہ سوچنے لگا کہ ان کی کوشش کو کیا تھا۔ مجھے کچھ اور نشان نظر آئے۔ یہ تانگے کے پہیوں کے نشان تھے۔ ایک تو ہمارے تانگے کے نشان تھے جو تازہ ہونے کی وجہ سے اب تک تھلک نظر آتے تھے۔ یہ ایک جگہ آکر ختم ہو گئے تھے۔ ان کے علاوہ پہیوں کے جو نشان تھے وہ بتاتے تھے کہ ایک تانگہ آگیا جو ایک طرف ہٹ کر رک گیا۔ گھوڑے کے کھڑے صاف تھے۔ ایک اور تانگہ اس سے وائیں کو قریب آکر رکا۔ وہاں سے انسانی پاؤں کے نشان شروع ہوئے ہیں۔ نے بیٹھ کر یہ کھڑے دیکھے۔ ایک کھڑا عورت کا تھا پاؤں چھوٹا تھا۔ پھر یہ سارے کھڑے گڈاڑ ہو گئے۔ وہاں سے قریبی گاؤں تین میل دور تھا کوئی دو گھنٹے بعد

تھی جس نے میری خوب راہنمائی کی۔ ان دیہاتیوں نے گھوڑوں کو اتارتے دیکھا تو وہاں تک گئے اور انہیں عاشق علی کی لاش نظر آئی۔ گدھ صرف اس کی ٹانگیں کھا سکے تھے۔ کیونکہ لاش بانی میں پڑی تھی۔ ٹانگیں کنارے پر تھیں اور اس کے تین طرف گھنی جھاڑیاں تھیں۔ گدھوں کے لیے بیٹھنے کی جگہ نہیں تھی۔ چہرہ بالکل صاف حالت میں تھا۔ قیض خون سے لال تھی۔ لاش گھسیٹ کر باہر نکلوانی جسم دیکھا۔ چاقو یا خنجر کے کوئی گہرے زخم تھے۔ میں لاش گھسیٹنے کا نشان دیکھتا اس جگہ پہنچا جہاں سے لاش گھسیٹی گئی تھی۔ وہاں مجھے کچھ اور نشان نظر آئے۔ میں کھوجی نہیں تھا۔ پاؤں کے نمایاں نشان تو دیکھ سکتا تھا۔ سمجھا ہوا کھڑا ٹھکانا میرے لیے مشکل تھا۔ وہاں نشان صاف تھے۔ لڑائی ہوئی تھی۔ عاشق علی گرا اور اسے مارنے والا یا مارنے والے گھسیٹ کر جو ہڑ میں پھینک گئے تاکہ راستے سے ہٹ جائے۔

خدا کی ذات کے سوا عینی شاہد کوئی نہیں تھا۔ مجھے زمین سے گواہی ملنی تھی۔ زمین کی زبان تو نہیں ہوتی لیکن جہاں انسان کا خون گرتا ہے، وہاں سے زمین بولتی ضرور ہے اور یہ زبان سمجھنے والے کچھ لوگ ہوتے ہیں جنہیں کھوجی کہتے ہیں۔ میرے ہاتھ میں ایک مشہور روٹھا کھوجی تھا جس نے انگریز پولیس افسروں کو بھی حیرت میں ڈال رکھا تھا۔ اس کے لیے تانگہ بھیجا اور میں زمین کو دیکھنے لگا۔ فوری طور پر مجھے جو بات سمجھ میں آئی وہ یہ تھی کہ عاشق علی راحت کے ساتھ اور سے گزرا اور درہزنوں کے ہتھے چڑھ گیا اور وہ اسے قتل کر کے راحت کو لے گئے۔ اُس زمانے میں پیشہ درہزنوں کی اولاد یا شاکر تھے جو جنگلوں کے وسیع علاقوں میں حکمرانی کرتے تھے۔ انگریزوں نے فوج کی مدد سے علاقے صاف کیے تھے۔ مگر ابھی تک یہ پیشہ زندہ تھا جہاں عاشق علی کی لاش پڑی تھی وہاں سے ایک میل دور جنگل شروع ہوتا تھا جس میں کھنڈے اور ادبچی نیچی چٹانیں بھی تھیں۔ میں یہی کچھ سمجھ سکا کہ یہ پیشہ درہزنوں کی واردات ہے جن میں دو اشتہاری مجرم تھے۔ ایک ٹنڈل کھلاتا تھا اور دوسرا مٹا بادشاہ۔ یہ پکڑے نہیں جاتے تھے۔ ان کا کوئی ایک ٹھکانہ نہیں تھا۔ ان کے پاؤں میں چکر تھا اور پولیس کو بھی وہ اسی چکر میں الجھائے رکھتے تھے۔ مگر سوچنے والی بات یہ تھی کہ عاشق علی راحت کو لے کر کہاں جا رہا تھا۔ وہ اس طرح ویرانے میں کس طرح پہنچ گئے؟ کیا وہاں ہوا ہو گا کہ ڈاکوؤں نے انہیں ریلوے سٹیشن سے ڈرا دھمکا کر ساتھ لیا اور یہاں آکر اسے قتل کر گئے اور رات کو ساتھ لے گئے؟

نشان دیکھنے لگا۔ اس نے سر اٹھا کر مجھے دیکھا اور بولا — ”مارا گیا۔“

میں نے پوچھا — ”کون؟“

اس نے جواب دیا — ”شہری مارا گیا۔“ پیچھے جو نشان ہیں وہ شہری جوتی کے ہیں۔ یہ نشان دیہاتی جوتیوں کے ہیں۔ میں ان کھڑوں کو پہچانتا ہوں۔ جوانی سے دیکھ رہا ہوں۔ یہ ڈاکوؤں کے کھڑے ہیں۔ مجھے شک ہے۔ یہ ٹنٹل کے آدمی ہیں۔ مٹا بادشاہ کے بھی ہو سکتے ہیں۔ بہر حال یہ ڈاکو ہیں۔“ اس نے کھڑے اور غور سے دیکھے اور اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کے ہاتھ میں چھڑی تھی۔ چھڑی کھڑوں پر رکھ رکھ کر وہ مجھے بتانے لگا۔ ”انہوں نے عورت کو پکڑا ہے۔ عورت جس کے ساتھ تھی... یہ دیکھو... وہ عورت کو چھڑانے کے لیے آگے بڑھا ہے۔ یہ دیکھو... اسے گھونٹ پڑا ہے یا دھک۔ وہ یہاں تک پیچھے ہٹا ہے۔“ غرض وہ مجھے سمجھاتا رہا کہ یہاں اس آدمی کو ڈاکو مل گئے اور انہوں نے اس سے عورت چھین لی۔ وہ ان سے لڑتا رہا اور ڈاکو اسے ساتھ لے گئے۔ میں نے اسے کہا کہ یہ آدمی بھی ڈاکوؤں کا لائق ہو سکتا ہے۔ وہ اکیسویں عاشر علی سے عورت چھین کر یہاں اپنے ساتھیوں سے آلا ہوگا۔ کھوجی نے کہا — ”نہیں۔ وہ سولہ آنے شہری ہے۔ یہاں اسے ڈاکو ملے ہیں اور اس سے عورت چھین لی ہے۔ کھڑا بتاتا ہے کہ یہاں زبردستی ہوئی ہے۔“

ڈاکوؤں نے لڑکی کی شلوار اور قمیض مجھے تحفے کے طور پر بھیجی

اور آگے گئے تو جنگل اور چٹانیں شروع ہو گئیں۔ درختوں کے جھنڈ گھنے تھے۔

بوڑھا کھوجی آگیا۔ وہ پیچھے چلا گیا اور وہاں سے زمین کو دیکھتا واردات کی جگہ تک آیا۔ تین چار چکر دہاں کاٹے اور یہ کہانی سنائی۔ ”آگے پیچھے دو تانگے آ رہے تھے۔ اگلا تانگہ راستے سے ہٹ کر دکا۔ دوسرا تانگہ راستے پر آکر ڈرا آگے دکا۔ راستے سے ہٹ کر رکنے والے تانگے میں سے ایک مرد اور ایک عورت اُتری۔ دوسرے تانگے سے مرنے والا ایک مرد اُترا پھر ان کی لڑائی ہوئی۔ لڑائی گھبراہٹ میں ادھر ادھر چلتی رہی۔ پھر ایک آدمی گرا۔ عورت اور مرد لاش کے قریب آگئے کھڑے ہوئے۔ دونوں نے لاش گھسیٹی اور پانی میں پھینک آئے۔“ کھوجی نے مجھے ”تانگے واپس جانے کے نشان بتائے۔ پتھروں کے نیم دائرے کے نشان نظر آ رہے تھے۔

میں اسے جو ہر شک لے گیا۔ وہاں سے اس نے کھڑا اٹھایا اور کہا — ”عورت قاتل کے ساتھ جا رہی ہے۔“

”عورت کو یہاں سے گھسیٹا نہیں جا رہا؟“ میں نے پوچھا۔ ”آدمی کہتے ہیں؟“ ”آدمی مرنے والا ہے۔“ اس نے کہا۔ ”عورت اپنی مرضی سے جا رہی ہے۔“ اس نے عورت کا کھڑا دکھا کر کہا۔ ”یہ کھڑا پہچان لیں۔ اس کے قدموں کا فاصلہ ناپیں۔ ہر قدم کا فاصلہ ایک جیسا ہے۔ رفتار تیز ہے۔ مرد آگے ہے۔ یہ ثبوت ہے کہ عورت ہنسی خوشی جا رہی ہے۔“ آگے زمین پتھر کی طرح سخت تھی۔ جہاں کھڑا ڈھونڈنا پڑا۔ بوڑھے کھوجی نے ڈھونڈ لیا۔ ایک میل تک کھڑا گیا اور کھوجی رک گیا۔ میں نے بھی دیکھا کہ وہاں گھوڑے کے پاؤں کے نشان تھے اور انسانی پاؤں کے بھی۔ کھوجی وہاں بیٹھ گیا اور بڑی ہی غور سے انسانوں کی جوتیوں کے

قائم کر لیا کرتے تھے۔ یہ رابطہ خاص قسم کے مجبوروں کے ذریعے ہوتا تھا۔ اس کام کے لیے کھوجیوں کو بھی استعمال کیا جاتا تھا۔ بعض دارالاقوام کی سربراہی میں پیشہ ور گروہ ہماری مدد بھی کیا کرتے تھے۔ میں نے یہ فیصلہ کیا کہ یہ معلوم کروں کہ یہ کس کا گروہ ہے اور پھر اس کے سربراہ سے رابطہ قائم کر کے کہوں کہ لڑکی اور لڑکا مجھے واپس کر دے کیونکہ یہ دونوں قتل کے مجرم ہیں۔ یہ ڈیوٹی بڑھے کھوجی نے اپنے فتنے سے لی۔ ڈاکوؤں کی مدد حاصل کرنے کے لیے شرط یہ ہوتی تھی کہ انہیں دھوکے سے گرفتار نہیں کیا جائے گا۔ ایسے واقعات بھی ہوئے تھے کہ کسی پولیس انسپکٹر نے کسی ڈاکو کو پیغام دیتے یا اس سے مدد لینے کے بدلے اسے گرفتار کر لیا۔ خورٹے ہی دونوں بعد پولیس انسپکٹر اسلحہ افراد کے ہاتھوں مارا گیا۔ میں نے بھی ایک گروہ کے دو افراد کو ایک بار گرفتار کیا تھا۔ ایک کو سزائے موت اور دوسرے کو دو واقعات میں سات سات سال سزائے قید دلائی تھی لیکن یہ دھوکہ نہیں تھا۔ یہ میرے اے۔ ایس۔ آئی اور چھ کانسیٹیلوں کا کارنامہ تھا جس میں دو کانسیٹیل گروہوں سے زخمی ہو گئے تھے۔ یہ ڈاکو اس علاقے کے ایک مشہور ڈاکو ٹنڈل کے ایک گروہ کے افراد تھے۔ ٹنڈل نے مجھے یہ پیش کش کی تھی کہ بیس ہزار روپیہ نقد لے لوں اور جس قسم کی لڑکی کی خواہش کروں وہ بھی مجھے جتنے عرصے کے لیے چاہوں پیش کی جائے گی۔ میں اس کے دونوں آدمی چھوڑ دوں۔ یہ دونوں اس کے استاد ڈاکو تھے۔ میں نے یہ پیش کش قبول نہیں کی تھی۔ اب مجھے پتہ چلا کہ راحت اور ٹنڈل کے قبضے میں ہیں۔ یہ اطلاع مجھے دارالاقوام کے نمبر سے روز ملی تھی۔ بڑھے کھوجی نے ٹنڈل کو ڈھونڈ نکالا تھا۔ میں نے اسے گھوڑا دیا کیا تھا۔ ان کی ملاقات ایک جنگل میں ہوئی تھی۔ میں نے ٹنڈل کو کبھی دیکھا نہیں تھا۔ مجھ نے بتایا بڑا خوب رو

وہاں بعض جاگہیں بہت خوبصورت تھیں۔ ہری گھاس بھی تھی۔ بھنگ کے پودے بے شمار تھے۔ ہم جنگل میں داخل ہو گئے۔ کھوجی نے گھاس پر بھی گھرا دیکھا جو مجھے بالکل نظر نہیں آیا۔ ہم بہت اندر چلے گئے۔ کھوجی ایک جگہ رک گیا۔ اس نے مجھے گھاس دکھائی جو دراصل دلی دلی سی تھی۔ اس نے مجھے یہ گھاس غور سے دیکھنے کے لیے کہا تو میں نے اور زیادہ غور سے دیکھا۔ میں سمجھ گیا کہ وہ کیا کہہ رہا ہے یہاں لڑکی پر فریاد حملہ کیا گیا تھا۔ وہاں سے کوئی چالیس قدم آگے گئے زمرات پتہ چلتا تھا کہ یہاں گروہ کے آدمیوں نے قیام کیا تھا۔ وہی شراب کی دو خالی بوتلیں اور بہت سی بٹلیاں پڑی تھیں۔ سگر ٹیل کے بہت سے ٹکڑے بکھرے ہوئے تھے۔ چونکہ یہ ثابت ہو گیا تھا کہ لڑکی کو ڈاکو نے گتے میں اس لیے آگے جانا بیکار تھا۔ میری سمجھ میں یہ آیا کہ عاشق علی راحت کے ساتھ تانگے میں فرار ہو گیا تھا تو اسے انور نے دیکھ لیا۔ اس نے دوسرے تانگے میں اس کا تعاقب کیا اور یہاں آکر اسے پکڑ لیا۔ انور کے متعلق اس کے گھر سے پتہ چلا تھا کہ گھر سے غائب ہے۔ اور اس کے ماں باپ سے یہ بھی پتہ چلا تھا کہ وہ قتل کی دھمکیاں دیتا پھرتا تھا۔ اس نے راحت کے باپ کو قتل کی دھمکی دی تھی اور راحت کی ماں کو اس نے اتنا دہشت زدہ کر دیا تھا کہ اس نے اسے اپنی بیٹی کے ساتھ بند کمرے میں لٹنے کی اجازت دے رکھی تھی۔ اس سے یہ رائے قائم کی جاسکتی تھی کہ انور میں قتل کرنے کی صلاحیت موجود تھی۔ چلے قتل پر ڈاکوؤں کا کوئی کھرا کھوج نہیں تھا۔ اب سوچنا یہ تھا کہ انور اور عاشق علی اس دیرانے میں کس طرح آئے تھے؟ یہ سربراہ مرث اس صورت میں مل سکتا تھا کہ ڈاکوؤں کو پکڑا جائے لیکن یہ کام بے حد مشکل بلکہ ناممکن تھا۔ ان کا کوئی ایک ٹھکانہ نہیں ہوتا تھا۔ آپ یہ سن کر شاید حیران ہوں کہ ان پیشہ ور مجبوروں اور ڈاکوؤں کے ساتھ ہم رابطہ

کارروائی نہیں کرنا چاہتا تھا کیونکہ بوڑھے کھوجی کی اپنی اور اس کے خاندان کی جان کا خطرو تھا۔ اب یہ سوچ رہا تھا کہ اس کیس کی کیا رپورٹ تیار کروں۔ مجھے اب یہ یقین کرنا تھا کہ راحت کے ساتھ جو آدمی ڈاکوؤں کے ہاتھ لگ گیا تھا وہ انور ہی تھا اور کچھ یہ بھی معلوم کرنا تھا کہ راحت، عاشق علی اور انور اس دیرانے میں کس طرح پہنچے؟ میرا اسے۔ ایس۔ آئی تین روز سے وہ دو تانگے ڈھونڈ رہا تھا جو اس دیرانے میں گئے تھے۔ شہر بہت بڑا نہیں تھا۔ بڑی قسم کا قصبہ تھا۔ شہر میں لائسنس یافتہ تانگوں کی تعداد ایک سو تیرا نوے تھی۔ میرے پورے سات نئے تین دنوں میں تقریباً ہر ایک تانگے والے سے پوچھ لیا لیکن کسی نے بھی نہ بتایا کہ وہ اس دیرانے میں سواری لے گیا تھا۔ اس سے مجھے شک ہوا کہ قتل تانگے والوں کے سامنے ہوا ہے۔ اس لیے وہ ڈر گئے ہیں۔ انور کے گھر سے اس کے متعلق پوچھا تو پتہ چلا کہ وہ ابھی تک لاپتہ ہے۔

تانگہ بانوں کا ایک نمبر دار تھا۔ میں نے اسے تھانے بلایا اور کہا کہ یہ دو تانگہ بان ڈھونڈ دے۔ وہ طرزم نہیں گواہ ہیں۔ اگر کل بارہ بجے تک وہ تھانے میں نہ آئے تو شہر کے تمام تانگوں کے لائسنس منسوخ کر دوں گا۔ اس کے ساتھ ہی میں نے تمام کانسٹیبلز کی ڈیوٹی لگا دی کہ وہ تمام تانگے بانوں سے کہ دیں کہ کل صبح لائسنس لے کر تھانے آجائیں۔ اور انہیں خبردار کر دیں کہ جو غیر حاضر ہوگا، اس کا لائسنس منسوخ ہو جائے گا۔ اگلی صبح تھانے کے سامنے تانگے جمع ہونے لگے۔ کچھ دیر بعد ایک تانگہ بان سیدھا میرے پاس آیا اور کہنے لگا کہ ایک تانگہ میرا تھا جو اس رات ایک جوان لڑکی اور ایک جوان آدمی کو شہر سے باہر لے گیا تھا۔ اس نے اس تانگہ بان کا نام بھی بتا دیا جس کا تانگہ اس کے پیچھے گیا تھا۔ میں نے دوسرے کو بھی پکڑ لیا۔ یہ بے چارے ڈرتے تھے کہ اعانت جرم میں نہ دھر لیے جائیں۔

اور زبردست جسم کا جوان ہے۔ کھوجی نے بڑی مشکل سے اس تک رسائی حاصل کی تھی۔ اس نے ٹنڈل کو اس کے جاننے والے ایک آدمی کے ذریعے میرا پیغام بھیجا یا تھا کہ لڑکی اور انور مجھے واپس کر دو۔ یہ میرے طرزم ہیں۔ ٹنڈل یہ سن کر کھوجی سے ملے آگیا۔ اس نے کپڑوں کا ایک بنڈل بوڑھے کھوجی کو دے کر کہا۔

”یہ احمد یار خان کو دے دینا اور اسے کہنا کہ تم نے مجھ پر کون سا احسان کیا تھا کہ میں تمہیں انسا قیبتی مال واپس کر دوں اور اسے یہ بھی کہنا کہ میں نے مفت کام کرنے کو نہیں کہا تھا۔ میں نے وہ قیمت پیش کی تھی جو تم ساری عمر خواب میں بھی نہیں دیکھ سکتے۔“ اس نے ٹھیک کہا تھا۔ دوسری جنگ عظیم سے پہلے بیس ہزار روپے آج کے ایک لاکھ روپے کے برابر تھے۔ اس نے یہ بھی کہا۔

”احمد یار خان کو یہ بھی کہ دینا کہ تمہارا لاکھ تھانیدار اور سپاہی واقعی دیر لوگ ہیں، جنہوں نے میرے آدمیوں کا مقابلہ کر کے میرے دوا آدمی پکڑے تھے۔ میں ملک کی (میری) ایمانداری اور ہمدردی کی تعریف کرنا ہوں۔ یہ تحفے جاؤ اور اسے بتا دینا کہ لڑکی اب ہمیشہ کے لیے میری ہو گئی ہے اور اس کے ساتھ جو آدمی تھا اس کی لاش کسی روز ہمیں مل جائے گی۔“

بوڑھا کھوجی یہ پیغام لایا اور کپڑوں کا بنڈل مجھے دیا۔ کھول کر دیکھا۔ اس میں رات کی قمیص، شلوار اور دو پٹے تھا۔ میں نے یہ کپڑے پہچان لیے۔ جس رات وہ بھاگی تھی، اس روز اس نے یہی کپڑے پہن رکھے تھے۔ میری طبیعت میں پوٹھو یار کا اکھڑ پن تھا۔ میں نے تہہ نہ کیا کہ دھوکے میں کپڑوں یا مقابلے میں، ٹنڈل کو مندر کپڑوں کا، خواہ کتنے عرصے بعد موقع ملے۔ اسے چھوڑ دوں گا نہیں۔ میں فوری طور پر اس کے خلاف کوئی

میں نے انہیں تسلی بخشی دی اور یقین دلایا کہ ان کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کی جائے گی جسے تاکنگے میں راحت ایک آدمی کے ساتھ (جس کے متعلق مجھے یقین تھا کہ انور ہی ہو سکتا ہے) بیٹھی تھی، اس کے تاکنگے بان نے بیان دیا کہ رات نو اور دس بجے کے درمیان ایک جوان آدمی نے اسے روکا اور شہر سے باہر چلنے کو کہا۔ میں نے اسے بیٹھنے کو کہا تو اس نے ایک طرف ہاتھ سے اشارہ کیا۔ ایک درخت کے پیچھے سے ایک لڑکی سامنے آئی اور بہت تیز تیز چلتی تاکنگے میں بیٹھ گئی۔ وہ آدمی اس کے ساتھ بیٹھ گیا۔ سامنے سے ایک آدمی آ رہا تھا۔ وہاں سبکی کے بل کی روشنی تھی۔ میں تاکنگے چلانے لگا تو وہ بہت تیزی سے تاکنگے کے سامنے آ گیا اور مجھے کہا۔ ”روکو تاکنگے“ وہ پیچھے گیا۔ اس نے شاید لڑکی کو پہچان لیا تھا۔ اس نے لڑکی سے پوچھا۔ ”راحت کہاں جا رہی ہو؟“

لڑکی کی جگہ اس کے ساتھی نے جواب دیا۔ ”مزدہ رہتا چاہئے جو تو یہاں سے غائب ہو جاؤ۔“ اور اس نے مجھے کہا۔ ”چلو بھی تم کہیں رک گئے۔“ میں نے تاکنگے چلا دیا۔ وہ آدمی چند قدم میرے تاکنگے کے پیچھے چلا۔ وہ بار بار کہہ رہا تھا۔ ”دیکھو راحت، یہ ٹھیک نہیں۔“ اور دو تین بار اس نے کہا۔ ”انور تم بھاگو کہاں تک بھاگتے ہو۔ میں تمہیں چھوڑوں گا نہیں۔“ تاکنگے میں بیٹھ ہوئے آدمی نے مجھے کہا۔ ”ڈانٹیں چلوں یا ر۔“ وگئے پیسے دل کا۔“ میں نے گھوڑے کو بھاگا دیا۔ آگے سے ایک غالی تاکنگے آ رہا تھا۔ مجھے آواز سنائی دی۔ ”اوتے شہر۔“ میری سواری نے مجھے کہا۔ ”دوست منہ مانگے پیسے دوں گا، گھوڑے کو کھلا چھوڑ دو۔“ ہمیں کبھی کبھی ایسی سواری مل جاتی ہے جس سے ہم منہ مانگے دم اور انعام لے لیا کرتے ہیں۔ میں سمجھ گیا کہ یہ دوسرا جوان اس نوڈیا پر لڑ رہے ہیں۔ خدا کی قسم میں ہی سمجھ رہا تھا کہ یہ کر سنے کی نوڈیا ہے یا دونوں کی سانجی

دوست ہے۔ اسی لیے وہ مجھے شہر سے باہر جانے کو کہہ رہا تھا۔ میں نے پیچھے دیکھا۔ دوسرا تاکنگے میرے پیچھے بھاگا آ رہا تھا۔ میری مرد سواری نے مجھ سے پوچھا کہ آخری بس کتنے بجے شہر سے نکلتی ہے۔ میں نے بتایا کہ ساڑھے دس بجے اڑے سے چلتی ہے۔ اس نے کہا کہ ہیں شہر سے دو میل دوکر اتار دینا۔ ہم کچی سڑک پر جا رہے تھے۔

”بیچھے والا تاکنگے قریب آ گیا تھا۔ میری سواری نے گھبرا کر کہا۔ ”تاکنگے سڑک سے اتار لو۔ دائیں طرف چلو۔“ میں نے اس کی مجبوری دیکھ کر کہا۔ ”بابو، بیس روپے لوں گا۔“ لڑکی نے اسی وقت دس دس روپے کے دو نوٹ نکال کر میرے ہاتھ میں دے دیئے اور کہا۔ ”اور تیز چلو۔“ میں نے تاکنگے اس دیرانے کی طرف دوڑا دیا۔ لڑکی نے اس سے پوچھا۔ ”کہاں لے جا رہے ہو؟ بس تو سڑک سے ملے گی۔“ اس نے جواب دیا۔ ”وہ ہمارے پیچھے آ رہا ہے۔ میں ڈرا اسے ٹھکانے لگاؤں۔ اگر سیدھے سڑک پر گئے تو وہ بھلا ہمیں بس میں بیٹھنے دے گا؟“ میں تاکنگے بھاگتے بھاگتے شہر سے دو میل دور دیران علاقے میں نکل گیا۔ دوسرا تاکنگے بالکل قریب آ گیا تھا۔ میرا گھوڑا رہ گیا۔ اس کی رفتار سست ہونے لگی تو میں نے کہا کہ بس جناب، اس سے آگے نہیں جاؤں گا۔ میں نے تاکنگے ایک طرف کر کے روک لیا۔ اس آدمی نے چانو نکال لیا۔ چاندنی میں مجھے چانو تو اچھی طرح نظر آیا۔ خاصا بڑا چانو تھا۔ اس نے چانو میری طرف کر کے مجھے گالی دی اور کہا۔ ”اگر نہ چلے تو قتل کر دوں گا۔“ اتنے میں دوسرا تاکنگے میرے قریب آ کر۔ اس میں سے دوسرے آدمی نے چھلانگ لگائی اور میری سواریوں کو لٹکایا۔ میرے تاکنگے سے آدمی باہر کود پڑا اور اس نے چانو کا دار کیا۔ وہ آدمی دوڑ کر تاکنگوں سے پرے چلا گیا۔ میرے والا آدمی اس پر چھوٹ پڑا۔ لڑکی بھی اتر گئی۔ میں نے اپنا تاکنگے موڑا اور دوسرے تاکنگے بان سے کہا۔ ”بھاگ

یہاں سے بھائی، یہ معاملہ تو سنگین ہے۔“ اور ہم وہاں سے بھاگ آئے۔

دوسرے تانگہ بان نے بیان دیا کہ اسے ایک آدمی نے روکا اور کہا کہ اس تانگے کو پکڑنا ہے۔ جو تانگہ گے دول گا۔ میں نے اس سے پچیس روپے مانگے وہ مان گیا۔ میں نے گھوڑا دوڑا دیا اور اس سے پوچھا کہ کیا تفتہ ہے؟ اس نے جواب دیا کہ ایک آدمی ہمارے محلے کی ایک لڑکی کو بھگا کر لے جا رہا ہے۔ اسے پکڑ کر پولیس کے حوالے کر دے گا تانگہ کچے میں اتر گیا تو میں نے تانگہ شریک سے انار کر اس کے پیچھے ڈال دیا۔ اس آدمی نے مجھے کہا۔ ”اگر اس سے لڑکی چھینے میں تم میری مدد کرو تو میں تمہیں پچاس روپے ایک انعام دول گا۔“ میں نے سودا قبول کر لیا۔ بہت دور جا کر تانگہ رک گیا۔ میں نے اپنا تانگہ اس کے قریب روکا۔ وہ میرے تانگہ سے کود کر اتر آیا اور مجھے کہا۔ ”آجاء دوست۔“ اور اس نے لٹکار کر کہا۔ ”آجاء اور اب دیکھتا ہوں تم بھاگ کر جاؤ گے کہاں۔“ میں ابھی تانگے میں سے اتر ہی رہا تھا کہ دوسرے تانگے سے ایک آدمی نکلا۔ شاید وہی نور تھا جسے میری سواری نے لٹکارا تھا چاندنی بڑی صاف تھی۔ اس نے چاقو کا وار میری سواری پر کیا۔ میری ہمت نہ ہوئی کہ اس کی مدد کرتا۔ وہ ایک طرف دوڑا تو دوسرے آدمی نے اسے جالیا اور اسے چاقو پر چاٹوا رہے لگا۔ اس آدمی نے شور مچا دیا۔ ہائے ہائے بھی کی۔ اتنے میں دوسرے تانگہ بان نے اپنا تانگہ موڑا اور مجھے پکار کر کہا۔ ”بھاگ یہاں سے بھائی۔“ اور تم تانگے موڑ کر وہاں سے بھاگ آئے۔ میں پچاس روپوں کے بدلے میں اپنی سواری سے پچیس روپے کر لے رہا تھا۔ دونوں تانگہ بانوں کے ہاتھوں سے میری اور کھوجی کی نیاس آرائی صبح ہوئی۔ میرا خیال تھا کہ لڑکی کو عاشق علی لے جا رہا تھا لیکن وہ انور تھا۔ اس وقت

عاشق علی تھانے سے گھر جا رہا تھا۔ تانگے بانوں کے بیان کے مطابق یہ دہی وقت تھا، جب میں نے عاشق علی کو تھانے سے گھر جانے کی اجازت دی تھی اور اسے کہا تھا کہ صبح نو بجے تھانے میں پہنچ جانا۔ معلوم ہوتا ہے کہ وہ تھانے سے گھر جا رہا تھا کہ راستے میں اسے انور اور راحت تانگے میں بیٹھے نظر آئے۔ انور نے یہ سوچا تھا کہ اوٹے سے پس پر سوار ہونے کی بجائے وہ شہر سے باہر میں روک کر سوار ہو جائے گا، جہاں اسے اور راحت کو کوئی نہیں دیکھ سکے گا۔ معلوم نہیں ان کی منزل کیا تھی عاشق علی قتل ہو گیا۔ راحت اور انور کو ڈاکو اپنے ساتھ لے گئے اور منڈل نے مجھے پیغام بھیجا کہ انور کی لاش تمہیں مل جائے گی۔ اب کوئی شک نہیں رہ گیا تھا کہ عاشق علی کے باپ کو زہر راحت نے دیا اور انور اس کے جرم میں شریک تھا۔ راحت نے عاشق علی کو عیشی کا ذریعہ بنا رکھا تھا۔ وہ دراصل انور کو چاہتی تھی۔ میرا مسئلہ یہ تھا کہ ان دونوں ملزموں کو زندہ پکڑنا تھا جو بظاہر ممکن نظر نہیں آتا تھا۔ منڈل کو پکڑنے کے لیے مجھے پولیس کی زیادہ نفی کی ضرورت تھی۔ میں نے اپنے لیے۔ اسے ہم کو پاس بٹھا کر وارنٹ تفتیش اور اس دوران پیدا ہونے والے حالات کی تفصیلی رپورٹ تیار کرنی شروع کر دی۔ میں یہ رپورٹ ہیڈ کوارٹر کو بھیج کر وہاں سے کافی مدد حاصل کرنا چاہتا تھا تاکہ منڈل کو پکڑ سکوں۔

دن بھر ہم رپورٹ لکھتے رہے۔ رات کو میں ذرا جلدی سو گیا۔ کئی دنوں کی مسلسل بھاگ دوڑ نے تھکا دیا تھا۔ کانسٹیبل نے جیت مجھے بگایا تو صبح کے پانچ بجے تھے۔ وہ مجھے اطلاع دیتے آیا تھا کہ ایک لاش ملی ہے۔ میں انکس ملتا ہوا کوارٹر سے دفتری طرف چلا تو کانسٹیبل نے کہا۔ ”ادھر نہیں ملک صاحب، ادھر۔“ وہ مجھے تھانے کے احاطے

ٹنٹل ڈاکو نے انور کی لاش بھیج کر اور لڑکی کو اپنے پاس رکھ کر مجھے پہنچ گیا تھا، جو میں نے قبول کر لیا اور تہیہ کر لیا کہ ٹنٹل کو اپنے ہاتھوں پکڑوں گا۔ میں نے بیان بنانا شروع کر دیا۔ ٹنٹل اور اس کے گروہ کی نقل و حرکت کی اطلاعات دینے کے لیے غزوں کا جال بچھا دیا۔ دو مہینے بعد مجھے اطلاع ملی کہ ٹنٹل اپنے سات آدمیوں کے ساتھ ایک جگہ ٹھہرا ہوا ہے۔ یہ چھوٹا سا ایک گاؤں تھا میں نے رات کے وقت دس کانسیبلوں کی مسلح نفری سے چھاپہ مارا مگر معلوم ہوتا تھا کہ غریبی دہلی ہوئی ہے۔ ٹنٹل کو اطلاع ملی چکی تھی کہ میں آ رہا ہوں۔ وہ بھاگ سکتا تھا لیکن اس نے میرے مقابلے کے لیے مورچہ بندی کوئی تھی۔ اس نے گاؤں کا گھیرا کھل ہونے ہی نہیں دیا۔ پہلی گولی اس کی طرف سے آئی۔ پھر دونوں طرف سے گولیاں پھیلیں۔ گاؤں کے اندر گئے تو ٹنٹل اور اس کے سارے آدمی نکل گئے تھے۔ اگر میرے ساتھ پنجابی اور بھٹان کانسیبل ہوتے تو میں غز کا مایاب موجدانہ گروہ میرے ساتھ صرف ایک مسلمان اور ایک سکھ کانسیبل تھا باقی پانچ ہندو تھے۔ اس کے بعد مجھے کوئی موقع نہ ملا کیونکہ ایک ہی مدینہ بعد مجھے ایک لمبی سپیشل ڈیوٹی پر واپس بھیج دیا گیا۔

یہ خونخوار امر ایک بوڑھے آدمی کی بوس کی وجہ سے کھیل گیا جس نے دس ہزار روپے کے عوض نو جوان لڑکی سے شادی کی۔ وہ خود قتل ہوا۔ اس کا جوان بیٹا بھی قتل ہوا، ایک اور ماں باپ کا اکلوتا جوان بیٹا ڈاکوؤں کے ہاتھوں قتل ہو گیا اور وہ نو جوان لڑکی جسے کسی باعزت گھر میں آباد ہونا تھا، ہمیشہ کے لیے ایک ڈاکو کی دانشتہ بن گئی۔

میں نے باہر اور پھر کچھ پاڑے لے گیا۔ وہاں ایک اور کانسیبل کھڑا تھا اور اس کے قریب ایک بوری رکھی تھی۔ بدبو اتنا ہی تھی کہ اس میں لاش ہے۔ ادھر سے گزرنے والے ایک آدمی نے جو بوری کے قریب کھڑا تھا یہ بوری دیکھی تھی۔ بوری کا منہ بند تھا۔ اس آدمی نے ہاتھ لگایا اور اسے بدبو بھی آئی تو اس نے تھانے میں اطلاع دی۔ میں نے بوری کھلوائی۔ اندر سے ایک لاش نکلی۔ اس کے گھٹنے سینے پر تھے اور سر کاٹ کر اگ رکھا ہوا تھا۔ بوری میں سے ایک کاغذ نکلا جس کا سائز بچوں کی کاپی کے کاغذ جتنا تھا۔ جگہ سے حوت میں اس پر ہندی زبان میں میرا نام اُدھورا لکھا ہوا تھا۔ ”ملک یار خان کو ملے۔“ نیچے لکھا تھا۔ ”تمہاری امانت واپس ہے۔“ رسید پر یہ نہیں چاہئے۔ اس کو ہم نے سزا دے دی ہے۔ اس نے قبول ہے کہ لڑکی کے خاوند کو اس نے لڑکی کے ہاتھ سے زہر پلایا تھا۔ پھر اس نے لڑکی کو گھر سے بھاگایا ہے اور راستے میں ایک اور آدمی کو قتل کیا ہے۔ لڑکی راضی خوشی ہے اس کا فکرمات کر۔ ٹنٹل۔“ یہ لاش رات کے وقت ڈاکو رکھ گئے تھے۔

میں لاش تھانے لے گیا۔ انور کے باپ کو بلایا۔ اسے لاش کا چہرہ اس طرح دکھایا کہ میں نے اس کا گناہ اس کے کندھوں کے ساتھ رکھ دیا تھا۔ اس کی ٹانگیں سیدھی نہیں ہو رہی تھیں کیونکہ اگر کچھ تھیں۔ میں نے اوپر چادر ڈال دی تھی۔ صرف چہرہ نکلا رکھا۔ اس کے باپ کو یہ نہیں بتایا کہ سر الگ ہے۔ اس نے چہرہ دیکھا تو اچانک چلا کر گرا اور بے ہوش ہو گیا۔ میں نے لاش پوسٹ مارٹم کے لیے بھیج دی۔ باپ جلدی ہوش میں آ گیا۔ ہم نے کہا کہ یہ اس کے بیٹے انور کی لاش ہے۔ اس کے بعد وہ کچھ نہیں بولا۔ یہ شخص بارہ تیرہ روز بعد بیان دینے کے قابل ہوا تھا۔ اس کا دامنی توازن بگڑ گیا تھا۔

وہی سیڑھیاں وہی زہر

دونوں قتل ایک ہی لڑکی کے گرد گھومنے لگے۔ تیسرا قتل احمد یار خان نے اپنے ہاتھوں کر دیا۔ وہ کہتے ہیں یہ نیکی تھی۔ کیا یہ واقعی نیکی تھی؟

اس سے پہلے ابرار کو کبھی ایسی تکلیف نہیں ہوئی تھی۔ اچانک پریٹ کو کیا ہو گیا تھا؟ باپ اچھی حیثیت کا آدمی تھا۔ ابرار کی سوشل حیثیت اثر والی تھی۔ باپ نے کمشنر کو درخواست دے دی۔ کمشنر انگریز تھا۔ اس نے پوسٹ مارٹم کا حکم دے دیا۔ پوسٹ مارٹم ہوا تو معدے میں زہر کا اثر نمایاں تھا اور اتنا نمایاں کہ پوسٹ مارٹم رپورٹ میں زہر کا نام بھی لکھ دیا گیا۔

تفتیش کے لیے یہ کیس ہمارے پاس آیا اور یہ میرے سپرد کر دیا گیا۔ میں نے پوسٹ مارٹم رپورٹ پڑھی۔ مقتول کے علاقے کے تھانے کے ایس۔ ایچ۔ او کو بلا بھیجا۔ ایک ہیڈ کانسٹیبل کو اپنے ساتھ رکھ لیا۔ میں نے ان لوگوں کی فہرست تیار کی جن سے مجھے تفتیش کرنی تھی۔ ایس۔ ایچ۔ او آیا تو اسے کیس رجسٹر کرنے کو کہا اور وہ دن تفتیش کا خاکہ تیار کرتے اور کاغذی کارروائی پوری کرتے گزر گیا۔ دوسرے دن دفتر گیا اور اس کیس کو سامنے رکھ لیا۔ کوئی ایک گھنٹے بعد انگریز ڈی۔ ایس۔ پی نے مجھے بلایا اور پوچھا کہ میرے پاس کتنا کام ہے۔ اتفاق سے دوسرے انسپکٹروں کی نسبت میرے پاس کام کم تھا۔ صاحب نے ایک اور کیس میرے حوالے کر دیا۔

اس کیس کی یہ تفصیل دی گئی کہ ایک مسلمان ریٹائرڈ کرنل (جسے آپ کرنل آبدار سمجھ لیں) اپنی کوشلی کی اندرونی سیڑھیوں سے گر کر مر گیا تھا۔ اس کے لواحقین نے کمشنر کو درخواست دی کہ وہ گیارہ سیڑھیاں ہیں جو چند گز بلند ہیں۔ وہاں سے گر کر کوئی مر نہیں سکتا۔ کرنل کو قتل کیا گیا ہے۔ کرنل کو موت کے راز ہی دفن کر دیا گیا تھا۔ چونکہ راز ایک پوسٹ مارٹم کی موجودگی میں لاش قبر سے نکالی گئی اور اس کا پوسٹ مارٹم کرایا گیا۔ وائس کنٹی پر نیلے رنگ کا اجھار تھا جو آنکھ کے قریب سے کان سے دو

یہ کیس متعلقہ تھانے کو دینے کی بجائے سیدھا ہمیں دے دیا گیا، اس حکم کے ساتھ کہ متعلقہ تھانہ کیس رجسٹر کرے گا اور ہماری مدد کرے گا۔ یہ حکم معمول کے کچھ خلاف تھا لیکن انگریز دفتری کارروائیوں کے چکر میں نہیں پڑا کرتا تھا۔ قتل کی واردات ہو جائے تو انگریز افسر ہماری جان کھا جاتے تھے۔ ایسا بالکل نہیں ہوتا تھا کہ پولیس مقتول اور قاتل کے لواحقین کے انتظار میں بیٹھ جائے اور جدوجہد سے "چائے پانی" زیادہ ملے، تفتیش ادھر کو جھکا دی جائے۔ یہیں تو اصل مجرم زمین کی تہوں سے نکال کر قانون کے سامنے کھڑے کرنے پڑتے تھے اور اگر استغناء کمزور ہو تو پولیس کی خیر نہیں۔

کیس کی یہ تفصیل ہمیں مہیا کی گئی تھی وہ یہ تھی کہ ابرار نام کا ایک آدمی جس کا عمر تیس سال تھی مر گیا۔ موت کا باعث پریٹ کا عارضہ تھا۔ صرقت تین دن بیمار رہا اور گیا ایک ہندو ڈاکٹر نے علاج کیا تھا۔ اس نے موتی کے باپ سے کہا کہ لاش کا پوسٹ مارٹم کرایا جائے۔ اسے زہر کا شک تھا۔ ابرار کے باپ کو بھی شک ہوا۔

ایرج اور پنک لمبا تھا۔ لمبائی ساڑھے چار ارج کے قریب تھی۔ یہ نمدید ضرب کا نشان تھا۔
ٹاکٹر کی رائے کے مطابق ایسی ضرب کرنے سے کم ہی لگا کرتی ہے۔ بہر حال قتل کے
شک کا جواز موجود تھا۔ اس لیے تفتیش کے لیے یہ کیس بھی مجھے اس حکم کے ساتھ
دیا گیا کہ علاقے کے تھانے میں رجسٹر ہوگا اور تھانہ مدکرے گا۔ یہ تھانہ شہر کے
ایک سرے پر تھا اور مقتول اہلکار کا تھانہ دوسرے سرے پر۔ دونوں کے درمیان مشرقی
پنجاب کا ایک بہت بڑا شہر تھا جو تقریباً آج کے لاہور جتنا بڑا تھا۔

میں نے دونوں کیس دیکھے تو مجھے یقین ہو گیا کہ دونوں وار داقین قتل کی ہیں دونوں
مقتولین کے لواحقین نے درخواستوں میں ان کی بیویوں پر شک کا اظہار کیا تھا۔ مجھے
اپنے ایک ساتھی، انسپکٹر سجن سنگھ کی ایک بات نے بہت دکھ دیا۔ سجن سنگھ میرا
بے تکلف دوست تھا۔ ہم ہنسی مذاق میں گالی گلوچ بھی کر لیا کرتے تھے۔ اس نے یہ
دونوں کیس دیکھے تو کہا۔ ”مسلمانوں کو دولت اور عورت مل جائے تو وہ اپنے خدا
پر بھی قاتلانہ حملہ کرنے سے نہیں ڈرتے۔ تمہارے یہ دونوں کیس دولت اور عورت کا
چکر ہے۔“ اس نے ٹھیک کہا تھا۔ دوسری جنگ عظیم ختم ہو چکی تھی۔ سمندر پار اور برا
ہیں تو دنیا تباہ و برباد ہو گئی تھی لیکن ہندوستان میں نوجی ٹھیکیداروں اور عہدوں سے
لوگوں نے بے پناہ دولت جمع کر لی تھی۔ جنگ نے دوسرے ظلم یہ کیا کہ فوج میں جو جمعہ
اور صوبیدار انگریزی لکھ پڑھ لیتے تھے انہیں لیفٹیننٹ اور کپتان بنادیا اور کمی کرنل
کے عہدے تک پہنچے اور ریٹائر ہو گئے۔

یہ لوگ دیہاتی تھے اور ان کی بیویاں بھی دیہاتی۔ اور جو شہروں کے رہنے والے
تھے، ان کی بھی بیویاں پرانی قسم کی سیدھی سادی عورتیں تھیں مگر مہجری اور کرنیلی نے

ان کے دماغ خراب کر دیے۔ انہوں نے پرانی بیویوں کو لٹا دیں دے دیں اور اپنی
بیٹیوں کی عمر کی لڑکیوں سے شادیاں کر لیں۔ ان لڑکیوں کے والدین نے عمر کا فرق تو نہ
دیکھا، وہ عہدوں اور درجے پیسے پر مرے اور لڑکیوں کو بوڑھے کرئیلوں کے حوالے
کر دیا۔ دوسری طرف وہ لوگ تھے جو جنگ سے پہلے کہیں لاکر، ہنسی یا دکان دار
تھے۔ جنگ کے دوران ٹھیکیدار باں عام ہوئیں تو جو موقع شناس اور چلتے پڑتے تھے
وہ ٹھیکیدار اور سپلائر بن گئے اور راتوں رات امیر ہو گئے۔ انہوں نے امیروں کی ہوساں
میں اٹھنا بیٹھنا شروع کر دیا۔

ہم ہندو اور مسلمان میں یہ فرق دیکھا کرتے تھے کہ ہندو کے پاس جائز ناجائز ہوت
آتی تھی تو وہ صاف سفر سے کپڑے پہنے چھوڑ دیتا تھا تاکہ کسی کو شک نہ ہو کہ اس کے
پہیٹ میں خزانہ ہے۔ وہ اس خزانے کو کاروبار پھیلانے میں صرف کرتا اور مزید دولت
کما لیتا تھا۔ اس کے برعکس مسلمان کے ہاتھ روپیہ پیسہ آتا تھا تو وہ اس کی نمانش کرتا تھا۔
نئی فریبی دہن لاتا تھا۔ کوٹھی بناتا اور شراب پیتا تھا۔ مسلمانوں کی اس عادت کی وجہ
سے دہکاری عام ہو گئی تھی۔ بوڑھے خاندانوں کی جوان بیویاں من مانی کرتی اور گلی
کھڑکی تھیں۔ کبھی کبھار کسی کی بیوی کسی کے ساتھ بھاگ جاتی تھی۔ سول کورٹس میں
گھر بڑے تازوں کی بھر مار تھی۔

ان دو کیسوں کا پس منظر بھی مجھے کچھ ایسا ہی نظر آتا تھا۔ ایک مقتول ریٹائرڈ
کرنل تھا جس کی بیوی نوجوان تھی۔ دوسرا مقتول تیس سال کی عمر کا دولت مند ٹھیکیدار
تھا۔ یہاں بھی شک اس کی بیوی پر کیا گیا تھا۔ میں نے پہلے اس کیس کی تفتیش
شروع کی۔ میں نے پردہ کوڑم یہ بنایا تھا کہ کچھ روز دونوں کیسوں کی تحقیقات بیک وقت

نشر دے کر دیں گے۔

میں نے مقتول ابرار کے والد اور اُس ڈاکٹر کو بلایا جس نے ابرار کا علاج کیا تھا۔ ڈاکٹر نے بتایا کہ مقتول ابرار اس کا دوست تھا۔ صحت نہایت اچھی تھی۔ کبھی کبھار کھانسی زکام ہو جاتا تھا۔ پھیپھ کا عارضہ کبھی نہیں ہوا تھا۔ ایک روز اس نے پھیپھ میں درد کی شکایت کی۔ دوائی دی مگر درد بڑھ گیا۔ رات کو دوائی بدلی۔ انجکشن دیا۔ اگلے روز درد زکام ہوا مگر لعش کا چہرہ اترا ہوا تھا۔ پھیپھ میں السر کا شک ہوا۔ مگر تیسرے دن کسی سپیشلسٹ کو دکھانے سے پہلے ہی مر گیا۔

”درد معدے کے مقام پر تھا۔“ ڈاکٹر نے کہا۔ ”اگراف کے قریب دوا میں ہوتا تو کہا جاسکتا تھا کہ اپنڈیسائٹس اچانک ابھر کر پھیپھ گیا ہے۔۔۔۔۔ میں نے تدفین سے ذرا پہلے لاش کا چہرہ دیکھا تو اس پر مجھے نمایاں نیلاہٹ نظر آئی۔ میں نے میت کو آخری غسل دینے والوں سے پوچھا کہ منہ سے جھاک تو نہیں نکلی تھی؟ انہوں نے بتایا کہ جھاک نکلی تھی۔ پھیپھ کے درد سے موت، لاش کا نیلا رنگ اور جھاک زہر کا ناقابل تردید ثبوت تھے۔ میں نے مرنے والے کے باپ سے کہا کہ میت قبرستان میں جانے سے پہلے ہسپتال جائے گی، پوسٹ مارٹم کے لیے۔ باپ اپنے بیٹے کی چیر پیاز سے گھبرایا تو میں نے اسے کہا کہ یہ میرا کیس ہے۔ اگر آپ اسے دفن کر دیں گے۔ تو بھی میں پولیس کو رپورٹ ضرور کروں گا۔ باپ نے ذرا سا سوچا اور اس کے منہ سے یہ الفاظ نکلے۔

”اے بیوی نے زہر دیا ہوگا۔“ میں فوراً ریش چندر جیٹھڑی درجہ اول سے ملا۔ وہ میرا دوست ہے۔ اس کی ہلاکت اور مدد سے ابرار کے باپ سے دشمنیت لکھوائی اور کشن رنگ پنچے جس نے فوری کارروائی کا حکم دیا اور ریش کو ہی ملزمان مقرر کر دیا۔

میں بھی ساتھ تھا۔ پوسٹ مارٹم رپورٹ آپ کے سامنے ہے۔ میرا شک غلط نہیں تھا۔ میں نے ابرار کے والد سے پوچھا کہ اس نے ابرار کی بیوی پر کس بنا پر شک کیا ہے؟ اس نے جواب دیا۔ ”ان میں ناچاقی تھی۔ ابرار نے کئی بار شکایت کی تھی کہ اس کی بیوی اس سے خوش نہیں رہتی۔ مرنے سے کچھ روز پہلے ابرار نے مجھ سے پوچھا تھا کہ وہ دوسری شادی کر لے تو انہیں کوئی اعتراض تو نہ ہوگا؟ میں نے اسے گول مول سا جواب دیا لیکن میں سمجھ گیا کہ ان کی ناچاقی اتنی بڑھ گئی ہے کہ میرے بیٹے نے دوسری شادی کا فیصلہ کر لیا ہے۔ ہو سکتا ہے اس نے اپنی بیوی کو بتایا ہو کہ وہ دوسری شادی کر رہا ہے اور بیوی نے اسے زہر دے دیا ہو۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ بیوی کی آشتیانی کسی اور سے ہو اور اس نے اپنے آشتی سے مل کر خاندان کو زہر دیا ہو۔“

بہر حال یہ محض شکوک تھے جو میری کوئی مدد نہ کر سکے۔ مزید معلومات یہ پولیس کے مقتول اپنے والدین سے ایک اپنی کوٹھی میں رہتا تھا۔ اس کا باپ اس کے کاروباری حالات سے آنف تھا۔ کسی کے ساتھ اس کی کاروباری دشمنی نہیں تھی۔ لہذا اور نہس کھٹا شراب یا اسے عادت نہیں تھی۔ اس کے دو بچے تھے۔ یہ شادی اس نے اپنی پسند سے کی تھی۔ بیوی کے والدین قریب کے ایک قصبے میں رہتے تھے۔ ابرار کا ایک دفتر بھی تھا، جس کے دو کمرے تھے۔ ایک شات کے لیے اور دوسرا کمرہ اس کا اپنا تھا۔ میں نے یہ کمرہ بند کر کے تالے کو سر بھر کر دیا۔ شات میں چار آدمی تھے۔ ان سے مقتول کی تلافی اور اس کی موت پر انیسویں کے سوا مجھے کوئی ایسی بات معلوم نہ ہو سکی جو بڑے کام آتی۔

میں مقتول کے گھر گیا۔ اس کی بیوی کو الگ کمرے میں لے گیا۔ میں نے اسے سر سے پاؤں تک دیکھا۔ ہم پولیس والے تجربے کی بنا پر چہرے کے تاثرات اور بات کرنے کے انداز سے پہچان لیا کرتے ہیں کہ اس انسان میں جرم کرنے کی صلاحیت یا ہمت ہے بھی یا نہیں جس کا اس پر الزام عائد کیا گیا ہے۔ قتل ایک ایسا جرم ہے جسے عادی قاتل بھی نہیں چھپا سکتے۔ یہ الگ بات ہے کہ ہم عدالت میں اسے قاتل ثابت کر سکتے ہیں یا نہیں۔ سپیشل جینیٹکس سال کی عمر کی اس لڑکی میں مجھے ایسی کوئی بات نظر نہ آئی جو جرم کی نشاندہی کرتی۔ اس میں گھبراہٹ ضرور تھی۔ اسے پتہ چل چکا تھا کہ اس کے شہر نے اس پر شک کا اظہار کیا ہے۔ میں نے اسے تسلی دی اور کہا ”میرے یہاں آنے کا مطلب یہ ہو کہ نہیں کہ فرض شک کی بنا پر آپ کو گرفتار کر لیا جائے گا۔ میرا فرض یہ ہے کہ شک رفع کروں اور آپ کو بے گناہ ثابت کروں۔ میں آپ کے خلاف نہیں، آپ کے حق میں بھی کام کروں گا۔ آپ میرے سوالوں کا جواب دیتی جائیں۔“ میں نے تقریباً دو گھنٹے اسے سوالوں کے جال میں پھانسنے کی کوشش کی یہاں کا ہر ایک جواب واضح تھا اور اس میں خود اعتمادی تھی۔ اس سے جو کچھ معلوم ہوا وہ مختصر یہ تھا۔ یہ شادی ابرار کی پسند سے ہوئی تھی۔ اس کے والدین کو پسند نہیں تھی وہ کہیں اور کرنا چاہتے تھے۔ بعد میں اس لڑکی نے انہیں حسن سلوک سے خوش کرنے کی کوشش کی۔ لیکن وہ لوگ اس سے ناراض ہی رہتے تھے۔ ابرار میں کوئی بڑی عادت نہیں تھی۔ پہلے پہل شراب نہیں پیتا تھا۔ دو سال سے پینے لگا تھا۔ پینے کی عادت نہیں تھی۔ گھر میں بھی شراب نہیں لایا تھا۔ نہ کبھی گھر میں پی تھی کسی پارٹی میں جاتا تو تھوڑی سی پی لیتا تھا۔

مرنے سے چار بار بچ مہینے پہلے اس کے رویے میں تبدیلی آگئی تھی۔ بیوی کے ساتھ پہلے والی بے تکلفی نہ رہی کبھی کبھی رات کو دیر سے آتا۔ بیوی پوچھتی تو بے رخی سے ٹال دیتا۔ بیوی کو شک ہوا کہ اس کی تو یہ کسی اور کی طرف ہو گئی ہے۔ گھر میں لڑائی جھگڑوں کے متعلق اس نے بتایا کہ لڑائی یا جھگڑا تو کبھی بھی نہیں ہوا تھا۔ چند مرتبہ بیوی نے ترش کلامی اور غصے میں گئے اور شکایتیں کی تھیں۔ یہ تو بیوی کو بالکل ہی علم نہیں تھا کہ وہ رات دیر سے آتا ہے تو رہتا کہاں ہے۔

”ابرار نے جب آپ کو بتایا تھا کہ وہ دوسری شادی کرنا چاہتا ہے تو آپ کا رد عمل کیا تھا؟“ میں نے پوچھا۔

”دوسری شادی؟“ اس نے حیران ہو کر کہا۔ ”ابرار نے کبھی ایسی بات نہیں کہی تھی، نہ ہی میں نے کبھی سوچا تھا کہ وہ دوسری شادی کرنا چاہتا تھا۔۔۔ آپ نے کیسے کہہ دیا ہے کہ وہ دوسری شادی کرنا چاہتا تھا۔“

”میں سب کچھ پتہ ہوتا ہے۔“ میں نے کہا۔ ”میں چاہتا ہوں کہ آپ میری مدد کریں۔ ابرار کو زہر دیا گیا تھا۔ یہ ثابت ہو گیا ہے۔ ضروری نہیں کہ زہر آپ نے دیا ہو آپ ذہن پر زور دے کہ سوچیں کہ ابرار کے دوستوں میں اور ملنے جلنے والوں میں ایسا کون ہو سکتا ہے جس نے اسے زہر دیا ہو۔“

اس کے رازت پینے لگے اور اس کی مٹھیاں اس طرح بند ہو گئیں جیسے وہ مجھے گھونٹہ مار کر رازت توڑ دے گی۔ میں اس کی بدلتی ہوئی حالت دیکھتا رہا۔ اس نے کہا۔ ”کیا یہ واقعی ثابت ہو گیا ہے کہ ابرار زہر سے مر رہا ہے؟ میں تو یہ سمجھی تھی کہ اس کا آپ میرے لیے کوئی معیبت کھڑی کرنا چاہتا ہے تاکہ میں یہاں سے بھاگ جاؤں اور

کبھی کسی کے خاندان کی اچانک موت واقع ہو جاتی ہے۔ اس کیس میں بھی انشورنس کا دخل ہو سکتا تھا لیکن میں نے دانسنہ ابراہار کی بیوی سے خاندان کی انشورنس کے متعلق کوئی بات نہیں کی۔ میں اسے پوچھنا نہیں کرنا چاہتا تھا تاکہ وہ اس خوش فہمی میں مبتلا رہے کہ میں انشورنس کے متعلق کچھ جانتا ہی نہیں۔

میں نے مقتول کے دفتر کا کمرہ سر بہرہ کر دیا تھا۔ اس کے گھر سے رخصت ہونے سے پہلے اس کی بیوی سے پوچھا ”مرجوم اپنے ذاتی اور مزدوری کاغذات کہاں رکھتے تھے؟“ بیوی نے کہا ”آئیے، میں آپ کو ان کی ذاتی میز اور برف کیس دکھاتی ہوں۔۔۔ آپ چاہیں تو سارے گھر کی تلاشی لیں۔ خدا کے لیے مجھے جلدی بتائیں کہ ابراہار کو زہر کس نے دیا ہے؟“ میں نے اس کی ہین کی درازیں دیکھیں، برف کیس دیکھا، اس کا ایچی کیس دیکھا۔ وہاں کوئی اہم کاغذ نہ تھا۔ اس کی بیوی نے کہا ”ان کے تمام مزدوری کاغذات دفتر میں ہوتے ہیں۔“

جاتے جاتے میں گھر کی نوکرانی اور نوکر کو اپنے ساتھ لے گیا۔ اپنے دفتر میں انہیں ڈرایا دھمکایا اور یہ بھی کہا کہ تمہاری بیگم یہ کوٹھی چھوڑ کر جا رہی ہے۔ تمہاری نوکری تو چھوٹ ہی جائے گی، پھر ڈر کیسا؟ مگر انہوں نے میاں بیوی کی تعریف کی۔ بیوی کے متعلق بتایا کہ بڑی شریف عورت ہے۔ خاندان کی غیر حاضری میں کوئی غیر مرد گھر میں نہیں آیا۔ بیوی خاندان کے ساتھ کبھی کسی پارٹی میں نہیں گئی۔

کرنل سپر ہیوں سے گرا تھا

تفتیش کا یہ ابتدائی مرحلہ تھا۔ میں نے سی۔ آئی۔ ڈی کے چار آدمیوں کو خفیہ

دہ اس کو ٹھی پر قبضہ کر لے۔ یہ ذرا لوگوں سے پوچھیں کہ جب ابراہار کی انشورنس مارٹم کے بعد چیری بھاری ہوئی میرے پاس آئی تھی تو میرا کیا حشر ہوا تھا اور میں نے کیا دلی تباہی کی تھی۔ ابراہار کو سردہ ہوتا تھا تو میں ساری رات اس کے سر ہانے بیٹھی رہتی تھی۔ وہ مریکا تو باپ نے اس کا پیٹ چاک کر دیا۔ اس کا باپ برطینت اور کینیڈا پورٹنل ہے۔۔۔ لیکن انکسٹر صاحب آپ کو یقین ہے کہ ابراہار کو زہر دیا گیا تھا؟“

”پورٹ مارٹم میں یہی لکھا ہے۔“ میں نے جواب دیا۔

اس نے دانت پیس کر کہا۔ ”مجھے پتہ چل جائے کہ ابراہار کو زہر کس نے دیا تھا۔ تو اسے پھانسی نہ چڑھنے دوں۔ ان ناخنوں سے اس کی گردن چیر کر اس کا خون پی جاؤں۔“ (اس کی ذہنی حالت بگڑ گئی۔ وہ اٹھ کر کمرے میں بیٹھ گئی۔ اس نے بنیانی باتیں شروع کر دیں اور اس نے یہ بھی کہا۔ ”میرے بھائی اس آدمی کا قیمہ کر کے مرگ پر پھینک دیں۔۔۔ اسے ابراہار تو کبھی مجھے تو بتانا کہ کون دیرے تیرے پیچھے لگا ہوا ہے۔“

بحرم ایکننگ کیا کرتے ہیں مگر وہ جرائم پیشہ ہوتے ہیں۔ ایک باعزت گھرانے کی جوان عورت کامیاب ایکٹنگ نہیں کر سکتی۔ میں نے اس عورت کو ذہن سے اتارا نہیں۔ البتہ اس پر شک بے بنیاد تھا۔ اب میرے سامنے دو سوال تھے۔ ایک یہ کہ ابراہار نے خود کشی کی ہے؟ دوسرا یہ کہ خود کشی نہیں کی تو اس کے کس دشمن نے اسے زہر دیا ہے؟ خود کشی بعد از نیاں تھی۔ اس کی بیوی کے کہنے کے مطابق اسے کوئی مالی پریشانی نہیں تھی اور نہ ہی گھر میں کوئی ہسٹنگس مسئلہ تھا کہ وہ خود کشی کر لیتا۔ زہر دینے کی ایک وجہ انشورنس بھی ہو سکتی تھی۔ ہمارے ملک میں جب سے انشورنس رائج ہوئی ہے، کبھی کسی کی بیوی اور

سکتے ہیں۔ اوپر سونے کا کمرہ اور تین مزید کمرے تھے۔ اس بلندی اور ان سیڑھیوں سے گر کر مرنا نا قابل یقین نہیں لگتا تھا۔

”کرنل صاحب اوپر والی سیڑھی سے پھسلے اور نیچے آکر ہے۔“ کرنل کی بیوی نے اپنے آپ سناٹا شروع کر دیا۔ ”وہ ناشتے کے لیے آکر ہے تھے۔ میں نیچے تھی۔ وہ فرش پر لڑھکتے ہوئے آئے۔ اٹھنے کی کوشش کی مگر اٹھ نہیں سکے۔ میں نے نوکروں کو بلایا۔ کرنل صاحب کو اٹھا کر لٹک پر ڈلوایا اور ڈاکٹر ملہنزا کو بلایا۔ ان کے آنے تک صاحب مر چکے تھے۔ آپ نوکروں سے پوچھیں۔ ڈاکٹر ملہنزا سے پوچھیں۔“

”ختم نہ!“ میں نے اسے چپ کرانے کے لیے کہا۔ ”میں آپ سے بہتر سمجھتا ہوں کہ مجھے کس سے پوچھنا ہے۔ اب ذرا مجھے بولنے کا موقع دیں۔“ کرنل صاحب کے پاؤں میں کیا تھا؟“

”سیلپر تھے۔“ اس نے کہا ”وہ بھی سیلپنگ سوٹ پہن تھے۔“

”مجھے وہ سیلپر دکھا دیجئے۔“ میں نے کہا اور اس کے دل پر قبضہ کرنے کے لیے کہا۔ ”میرے ساتھ تعاون کیجئے۔ مجھے یہ ثابت کرنا ہے کہ کرنل صاحب کی موت کی ذمہ دار آپ نہیں۔“

وہ سیلپر لانے کو چلی تو میں بھی ساتھ چل پڑا۔ اس نے کہا۔ ”آپ کے ساتھ آنے کی ضرورت نہیں، میں سیلپر لے آتی ہوں۔“ لیکن میں ساتھ چلا گیا۔ کرنل صاحب کے بتوں میں سے سیلپر اٹھائے۔ ان کے تنوے دیکھے۔ ان پر مجھے کوئی چکناہٹ نظر نہ آئی۔ میں نے سیلپر قبضے میں لے لیے۔

کرنل کی ازدواجی زندگی کی تفصیلات یہ تھیں۔ سیلائی گورنر میں جمعہ دار تھے۔ جنگ

طریقہ کار سے تحقیقات پر لگا دیا۔ وہ اسی وقت روانہ ہو گئے۔ میں دوسرے کس کی طرف متوجہ ہوا۔ یہ کرنل ابلار کی موت کی تحقیقات تھیں۔ اس کے گھر گیا۔ بڑی خوبصورت کوٹھی تھی۔ اس کی بیوی سے ملا۔ وہ ابلار کی بیوی سے بہت مختلف تھی۔ بھتی تو ابلار کی بیوی بھی خوبصورت لیکن کرنل کی بیوی کی خوبصورتی میں کوئی اور ہی بات تھی۔ اس کی ڈیل ڈول، چلنے اور بولنے کا انداز بتانا تھا کہ بڑی شریف نہیں۔ عمر ابلار کی بیوی جتنی تھی جب کہ کرنل کی عمر موت کے وقت پچیس سال بتائی گئی۔ یہاں بیوی میں پورے تیس سال کا فرق تھا۔ اگر یہاں کوئی جرم ہوا تھا تو وہ عمر کے اسی فرق کی پیداوار تھا۔ اس بڑی کو دیکھ کر ہی مجھے یقین ہو گیا کہ اس کوٹھی میں کوئی ڈرامہ کھیلا گیا ہے۔

میں بڑی کو بتانے لگا کہ میں کیوں آیا ہوں۔ اس نے میری بات کاٹ کر کہا۔ ”ہاں، ہاں، میں جانتی ہوں آپ کیوں تشریف لاتے ہیں۔ کرنل صاحب سیڑھیوں سے نہیں گرے۔ ان کے بھائی صاحب کہتے ہیں کہ کرنل صاحب کو قتل کیا گیا ہے۔“

استقام لینے کا یہ موقع ان کے لیے بہت اچھا تھا۔ ”وہ اٹھ کھڑی ہوئی اور کہنے لگی۔“ میرے ساتھ آئیں۔ میں آپ کو بتاؤں وہ کہاں سے گرے تھے۔“

وہ مجھے ڈرائنگ روم سے باہر لے گئی۔ ساتھ ہی ڈیوڑھی کی طرح ایک فراخ کمرہ تھا۔ اس میں نہایت خوبصورت سیڑھیاں اترتی تھیں۔ تھمدا گیارہ تھی۔ ہر ایک سیڑھی تقریباً آٹھ انچ اونچی تھی اور اس پر ماربل چسپ تھے۔ دونوں طرف ہر سیڑھی سے ایک چمکی گول پائپ اوپر کو نکلی ہوئی تھی اور ان پائپوں پر گول لکڑی نیچے سے اوپر تک چلی گئی تھی۔ یہ دراصل سیڑھیوں کا ایک دکش سیٹ تھا جسے آپ زینہ کہ

شروع ہوتے ہی انہیں کشن دے کر ایفٹینٹ بنادیا گیا۔ چھ مہینے بعد کپتان ہو گئے۔ دو سال بعد میجر ہوئے۔ میجر ہوتے ہی پہلی بیوی کو طلاق دے دی کیونکہ وہ پرانے ماڈل کی بیوی تھی۔ کرنل صاحب چونکہ سپاہی گور میں تھے۔ اس لیے یہ یقین سے کہا جاسکتا ہے کہ انہوں نے سرکار کا مال بیچا اور اپنا گھر بھرا تھا۔ یہ ان کی کوٹھی اور فرنیچر وغیرہ سے ظاہر ہوتا تھا۔ مہاراجوں اور نوابوں کی سی شان تھی۔ جنگ کے آخری سال کرنل بن گئے اور اس لڑکی کے ساتھ شادی کر لی۔ یہ شادی لڑکی کے ماں باپ کی مرضی سے ہوئی تھی۔

میں نے لڑکی سے پوچھا کہ اپنے سے تیس سال بڑے آدمی کے ساتھ جس کی پہلے ہی ایک بیوی اور پانچ بچے تھے شادی کر کے وہ کیا محسوس کرتی تھی؟ اس نے سر جھکا لیا۔ اس کی شوخی اور زبان کی تیزی ختم ہو گئی۔ میں نے اسے جذباتی سہارا دینے کے لیے کہا۔ ”ہماری سوسائٹی کا یہ عادتہ کتنا افسوسناک ہے کہ ایک نوجوان لڑکی کو ایک بوڑھے کے ساتھ بیاہ دیا گیا اور لڑکی نوجوانی میں بیوہ بھی ہو گئی۔“ اس نے میری طرف دیکھا۔ میں نے کہا۔ ”آپ کے ساتھ ظالمانہ جبر کیا گیا تھا۔“ اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

اس نے آنسو پونچھے اور آہ لے کر کہا۔ ”اس کا یہ مطلب نہیں کہ انہیں میں نے قتل کیا یا کر دیا ہے۔ وہ بیڑھیوں سے گرے اور مر گئے۔“

میں نے سوال شروع کر دیے۔ میرے سوالوں کے حوالے سے وہ صاف پتہ کر نکلی گئی۔ اس کے خاندان ماں اور نوکروں سے میں نے جو معلومات حاصل کیں، وہ یہ تھیں کہ جب بیگم نے شور مچایا تو وہ اندر گئے۔ کرنل صاحب بیڑھیوں کے نیچے

فرش پر پڑے تھے۔ وہاں باہر کا کوئی آدمی نہیں تھا۔ گھر میں کئی لوگ آیا کرتے تھے۔ بیگم سے الگ تھلک ملنے کبھی کوئی نہیں آیا تھا۔ بیگم اکثر اکیلی باہر جایا کرتی تھی۔ بعض اوقات کرنل صاحب گھر پر ہوتے تھے اور بیگم باہر گئی ہوتی تھی۔ ان کا کبھی لڑائی جھگڑا نہیں ہوا تھا۔ ایک نوکر نے بتایا کہ آخری رات ایک آدمی کرنل صاحب کے ساتھ الگ کمرے میں بیٹھا رہا تھا۔ دونوں بہت دیر تک دھکی دھکی رہے تھے۔ بیگم اوپر چلی گئی تھی۔

”تم اس آدمی کو پہچان سکتے ہو؟“ میں نے اس سے پوچھا۔ ”بڑی اچھی طرح۔“ نوکر نے جواب دیا۔ ”وہ پہلے بھی دو تین بار آیا تھا۔ نام معلوم نہیں۔ یہ بھی معلوم نہیں کہ کہاں رہتا اور کیا کرتا ہے۔“

میں نے کرنل کی نوجوان بیوہ کو تسلی دی کہ وہ گھبرائے نہیں۔ میں اس کی حفاظت کروں گا اور اس طرح کے کچھ جھوٹے وعدے اور جھوٹی ہمدردی کر کے اس کے دل سے یہ شک نکال دیا کہ میں اسے مجرم سمجھتا ہوں۔۔۔ میں وہاں سے رخصت ہوا۔ میرے ذہن پر یہ معمہ سوار تھا کہ بیگم اور نوکروں کے کہنے کے مطابق کرنل کو فرش سے اٹھایا گیا تھا اور بیگم کے سوا وہاں کوئی اور نہ تھا تو کیا کرنل کو اگر قتل ہی کیا گیا ہے تو بیگم نے کیا ہے؟ یا بیگم نے اسے کسی آدمی سے جو کوئی ذکر ہی ہو سکتا ہے، قتل کر دیا ہے؟ مگر نوکروں نے عیسائی میں مجھے ایک دوسرے کے متعلق بنایا تھا کہ اس وقت کوئی نوکر اندر نہیں تھا تو کیا تمام نوکر جن کی تعداد تین تھی، قتل میں شامل ہیں؟

میں ڈاکٹر ملہوترا سے ملا۔ اسے پورٹ مارٹن رپورٹ دکھائی۔ ڈاکٹر ملہوترا کو یہ

جرم و جاسوسی کا شوق

میرے لیے کیس تو برابر کا بھی اہم تھا لیکن کرنل کا کیس زیادہ توجہ طلب تھا۔ اس کی بیوی میری نگاہ میں مشتبہ تھی۔ میں نے فیصلہ کیا کہ پہلے اس کی بنیادی کڑوں۔ کہیں لوکی اپنی بنیاد کچھ نہ کرے۔ میں دوسرے دن پھر اس کے گھر گیا۔ ڈرائنگ روم میں اس کے کچھ ملنے والے بیٹھے تھے۔ میں نے اسے تسلی دی کہ وہ ان سے فارغ ہو لے، گھر لانے کی کوئی بات نہیں۔ اس نے مجھے ایک مکر سے میں بٹھا دیا۔ یہ اس کا کوئی خاص مکر معلوم ہوتا تھا۔ ایک خوبصورت ریک میں تین چار رسالے اور کتابیں پڑی تھیں۔ مجھے خیال آیا کہ اگر یہ رسالے اور کتابیں یہ لڑکی پڑھتی ہے تو ان سے اس کی ذہنی سطح کا پتہ چل جائے گا۔ میں نے اردو کی کتابیں دیکھیں۔ یہ ناول تھے۔ درق گزرائی کی اور کہیں کہیں سے دو چار فقرے پڑھے۔ ہر ناول عریاں اور فحش تھا۔ ایک انگریزی رسالہ دیکھا۔ یہ تو نیم عریاں تصویروں سے بھرا ہوا تھا۔ ہر تصویر میں جنسی اشتعال کا پورا پورا بندوبست کیا گیا تھا۔

پھر انگریزی کی ایک کتاب اٹھائی۔ یہ جرم و جاسوسی کی کہانیوں کا مجموعہ تھا۔ یہ کتاب کھولی تو ایک صفحے کا کوڑا موڑ کر پتہ کیا ہوا تھا، جیسے پڑھنے والے نے کہانی یہاں تک پڑھی ہو۔ میں نے اس صفحے کو دیکھا۔ ایک پیرا گراف کے ساتھ خاشے میں نیسل کی بلکی سی لکیر کھینچی ہوئی تھی۔ اس لکیر کا مطلب یہی ہو سکتا تھا کہ پڑھنے والے کو یہ پیرا گراف زیادہ پسند آیا ہے۔ میں نے یہ پیرا گراف پڑھا تو مجھے ایسے محسوس ہونے لگا جیسے میں بڑی سی بی بی سی در بیچ بھول جلیوں سے نکل آیا ہوں

کرنل کی بیوی نے بلایا تھا۔ میرے سوالوں کا جواب دیتے ہوئے اس نے کہا کہ کرنل پنشن پر آنے کے بعد میرا مریض رہا۔ شراب نے اس کے اندر کچھ نہیں چھوڑا تھا۔ نوجوان لڑکی کے ساتھ شادی کر کے اس نے اپنے آپ کو نفسیاتی مریض بنالیا تھا۔ مجھ سے اکثر طاقت کے انجکشن لیا کرتا تھا۔ وہ مصنوعی طریقوں سے جوان ہونے کی کوشش کرتا تھا۔ بوڑھے جسم میں طاقت کی دوائیاں ڈال ڈال کر اس نے اپنا دل کمزور کر لیا تھا۔ اس میں شراب کا اثر بھی شامل تھا۔ وہ جب بیڑھیوں سے گر کر مرے تو میں بالکل حیران نہیں ہوا۔ گرنے کی چوٹ مہلک نہیں تھی، مہلک گرنے کا احساس اور صدمہ تھا، جس سے اس کی حرکت قلب بند ہو گئی۔ پوسٹ مارٹم رپورٹ میں کینٹی کی جس چوٹ کا ذکر ہے وہ لاش پر موجود تھی لیکن اتنی نمایاں نہیں تھی۔ میں اسے گرنے کی چوٹ سمجھا تھا۔

”ٹاکٹر صاحب!“ میں نے اسے کہا۔ ”ذرا سیڑھیوں کو تصویریں لائیں یا میرے ساتھ چل کر ایک نظر اس خوبصورت زینے کو دیکھیں۔ کیا وہاں سے گرنے اور گر سکتے ہوئے نیچے آنے سے کینٹی پر اتنی شدید چوٹ آسکتی ہے کہ وہاں خون جمع ہو جائے؟ میں نے جنگلی لکڑی دیکھی ہے۔ وہ گول اور تقریباً پانچ اینچ موٹی ہے۔ اگر کرنل کا سر اس لکڑی سے ٹکرتا تو چوٹ اس طرح کی نہیں ہو سکتی تھی جیسی پوسٹ مارٹم رپورٹ میں لکھی گئی ہے۔ یہ چوٹ ڈنڈے کی کھٹی گئی ہے۔“

”میں نے اس چوٹ کا نشان دیکھا اور اس پر غور بھی کیا تھا۔“ ڈاکٹر نے کہا۔ ”اب آپ کی باتوں سے میں الجھن میں پڑ گیا ہوں۔ یہ چوٹ نہ تو زینے کے جنگلے کی لکڑی کی ہے نہ ہی سیڑھیوں کے کناروں کی۔ چوٹ مشکوک ہے۔“

گرے تھے اس روز اس نے سیڑھیوں کی صفائی کی تھی؟ اس نے کہا۔ ”وہ تو میں ہر روز کرتی ہوں۔ ساری کوٹھی کی جھاڑ پونچھ میرے ذمے ہے۔“
 ”ذرا یاد کر کے بتاؤ کہ جب تم نے سیڑھیاں صاف کی تھیں تو رہاں کیسے کیا؟ اسی فرط کا چھلکا تو نہیں تھا؟“ میں نے اس سے پوچھا۔ ”یا کوئی چلتی چیز؟“

”بیگم صاحب نے مجھے کہا تھا کہ سیڑھیاں اچھی طرح دھو دینا۔“ اس نے کہا۔ ”سچی بات ہے جی! ادھر کرل صاحب کی میت پڑی تھی، ادھر بیگم کو گھر کی صفائی کی پڑی ہوئی تھی۔ ایسے وقت کون جھاڑو دیتا ہے لیکن بارشوں کے دستور نہالے ہوتے ہیں جی۔“

”تم نے سیڑھیاں دھوئی تھیں؟“

”حکم مانجی!“ اس نے کہا۔

”کوئی خاص چیز تم نے دیکھی؟ کیا سیڑھیاں زیادہ گندمی تھیں؟“

”گندمی تو نہیں تھیں۔“ اس نے کہا۔ ”میں نے اوپر کی سیڑھی پر پانی میں جھگو یا سوا کپڑا پھیرا تو وہاں جھاگ پیدا ہوئی تھی۔ اس سے نیچے والی سیڑھی پر بھی ایسی ہی جھاگ پیدا ہوئی تھی میں نے دل میں نوکروں کو گایاں دیں کہ انہوں نے یہاں صابن گرا دیا تھا۔“

”تم نے کبھی یہ سیڑھیاں صابن سے دھوئی تھیں؟“

”کبھی بھی نہیں۔ مگر اس روز میرے گیلے کپڑے سے وہاں جھاگ اٹھی تو میں نے سوچا کہ یہ تو صابن کی جھاگ معلوم ہوتی ہے۔ میں نے پھر زیادہ توجہ نہیں دی بلکہ گھر میں کرل صاحب کی میت پڑی تھی۔ مجھے ان کے مرنے کا بہت افسوس تھا۔“

اور خدا کے ہاتھ نے مجھے سیدھی راہ پر ڈال دیا ہے۔ لڑکی ابھی اپنے ہانوں سے نارغ نہیں ہوئی تھی۔ میں نے یہ ساری کہانی پڑھ لی اور کتاب ریک میں اسی جگہ رکھ دی جہاں سے اٹھائی تھی۔

نصف گھنٹہ بعد لڑکی آگئی۔ میں نے دو چار بے تکلفی کی باتیں کر کے ان کتابوں کے متعلق پوچھا اور ان کی تعریف بھی کی۔ اس نے بتایا کہ اسے جرم و جاسوسی کی کہانیاں زیادہ پسند آتی ہیں۔ اس نے وہی انگریزی کی کتاب اٹھا کر میرے ہاتھ میں دے دی اور کہنے لگی۔ ”ایسی کتابیں آپ بھی پڑھا کریں۔ آپ کو ڈیٹیشن (سرگزشتی) میں بہت مدد ملے گی۔ اس کتاب کی ہر کہانی ایسی ہے کہ یہ پتہ چل جاتا ہے کہ قاتل کس طرح کیا گیا ہے مگر قاتل پکڑا نہیں جاتا کیونکہ ثبوت یہاں نہیں ہوتا۔“ میں نے کتاب کا ٹائٹل دیکھا اور کتاب اس طرح ریک میں رکھ دی جیسے مجھے

اس سے کوئی دلچسپی نہ ہو۔ میں نے سوچا کہ اس لڑکی کو معلوم نہیں کہ جرم کے لیے ضروری ہوتا ہے کہ اس کی شخصیت مضبوط ہو۔ یہ لڑکی ایک بھیاٹک جرم کو کے اس کا ثبوت اپنے ہاتھوں میرے سامنے دکھ رہی تھی کہ اسے معلوم نہیں تھا کہ یہ کتاب جس میں کوئی قاتل پکڑا نہیں جاتا، مجھے اس لڑکی کو گرفتار کرنے کا جواز مہیا کر چکی ہے۔ نیپل کی ایک باریک سی لکیر نے اس کی قسمت کی لکیروں کو بدل دیا تھا۔

میں نے اس سے ادھر ادھر کی باتیں کیں اور اس کے نوکروں کے کوارٹر والوں کی طرف چلا گیا۔ میں نے اس عورت کو بلایا جو گھر میں جھاڑو اور صفائی کرتی تھی۔ مجھے کتاب کے الفاظ نے اس عورت سے کچھ پوچھنے کی راہنمائی کی تھی۔ میں نے اسے پہلے تو تھوڑا سا ڈرا یا پھر پوچھا کہ جس روز کرل صاحب سیڑھیوں کے اوپر کمرؤں سے

اگر یہ کیس تھانے والوں کے سپرد ہوتا تو انہیں بہت ہی مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا۔ ہمارے محکمے کے اختیارات لامحدود تھے۔ ہم بڑے سے بڑے افسر کو بھی پابند کر سکتے تھے۔ میں نے کرنل کی بیگم سے کہا کہ وہ سونے والے کمرے میں چلی جائے۔ اس نے میرے ساتھ بے تکلف ہونے کی کوشش کی۔ میں نے اس پر کچھ ظاہر نہ ہونے دیا اور اس کے ساتھ بے تکلفی سے پیش آیا۔ مگر میری ذہنی کیفیت بدل چکی تھی جو وہ بھانپ گئی۔ اس نے میرا ہاتھ پکڑ لیا اور آنکھوں میں خمار کا بڑا ہی دانشمنش اثر پیدا کر کے بولی۔ ”آئیں نا آپ بھی میرے سونے کے کمرے میں، وہاں کوئی نہیں آئے گا۔“

یقین کیجئے کہ اس کی یہ پیش کش ٹھکرانے کے لئے مجھے اپنے آپ پر بڑا ہی جبر کرنا پڑا۔ وہ اپنا آپ مجھے رشوت کے طور پر پیش کر رہی تھی۔ اس کی یہ پیش کش اس کے جرم کی نشاندہی کرتی تھی میں نے اپنے اوپر قابو پایا اور اسے کہا۔ ”آپ سونے کے کمرے میں چلی جائیں۔ اب آپ کسی سے نہیں مل سکیں گی۔ آپ کے نوکر آپ کے پاس آئیں تو ان کے ساتھ ایک پولیس کانسٹیبل ہوگا۔“ وہ سخت گھبرائی اور میرے کئی بار کہنے پر وہ اوپر چلی گئی۔

میں نے اپنے میڈ کو نوکر کو کرنل کے گھر سے ہی ٹیلیفون کیا اور کہا کہ چار باروری کانسٹیبل میرے پاس آجائیں۔ راتوں سے مسلح ہوں۔ فون بند کر کے میں لڑکی کے کمرے میں بیٹ گیا۔ اس کا ڈانگ پیلڈ چکا تھا اور کمرے میں ٹہل رہی تھی۔ مجھے کہہ کر اس نے سکرانے کی کوشش کی۔ میں نے اسے کہا۔ ”وہ ڈنڈا کہاں ہے؟“ اس نے جبران ہو کر بوجھا۔ ”کون سا ڈنڈا؟“

”جس سے آپ نے با آپ کے کسی دوست نے کرنل کو قتل کیا ہے۔“ وہ تو چکر اکر گرنے لگی تھی۔ میں نے اسے پٹنگ پر بٹھا دیا اور کہا۔ ”ہو سکتا ہے کتاب میں چھپی ہوئی کہانیوں کے قائل نہ پکڑے گئے ہوں لیکن کتابوں سے طریقہ پڑھ کر جرم کرنے والے جلدی پکڑے جاتے ہیں۔ دیکھیے محترمہ! میں نے رعب سے کہا۔ ”اگر آپ پریشانی اور اذیت سے بچنا چاہتی ہیں تو مجھے صاف بتادیں کہ اوپر کی آؤنی اور اس سے نیچے کی میز تھی پر صابن کس نے ملا تھا اور خوب کرنل پھسل کر نیچے آیا تو اس کی کینٹی پر ڈنڈا کس نے مارا تھا؟“ اس کے ہونٹ کانپنے لگے، اور اس کی آنکھیں۔۔۔ سے اور حیرت سے کھل گئیں۔ وہ عادی جرم تو ہمیں تھی، نو جوان لڑکی تھی جس کا تعلق امیر سمیر گھرانے سے تھا۔ وہ اپنے خاوند کو کسی جوان آشنا کی خاطر یا خاوند کی انٹرنس کی رقم حاصل کرنے کے لیے جو ایک لاکھ روپیہ تھی، قتل کرنا چکی تھی لیکن اسے معلوم نہیں تھا کہ قتل جرم کرنا کسی نو جوان لڑکی کے بس کی بات نہیں۔ میں نے اسے کہا۔ ”میں آپ کو قتل کی سزا سے بچا سکتا ہوں۔ آپ ان آدمیوں کو پکڑوا دیں جو آپ کے ساتھ اس جرم میں شامل تھے۔ میں آپ کو وعدہ صاف گواہ بنا دوں گا۔“

اس کے چہرے پر کئی رنگ آئے اور گئے۔ منہ سے ایک لفظ نہ نکلا میں نے کہا۔ ”میں آپ کو سوچنے کا بہت وقت دوں گا۔ آپ اس کمرے سے باہر نہیں نکل سکیں گی۔ ابھی پولیس کے سپاہی آجائیں گے۔ وہ آپ کی ساری ضروریات پوری کریں گے۔ اب آپ الزام سے انکار کرنے اور بچنے کی نہ سوچیں بلکہ جو میں نے کہا ہے وہ سوچیں، آپ کی نجات اسی میں ہے۔“

میں اسے سخت پریشانی کے عالم میں چھوڑ کر کمرے سے نکل آیا۔ لوگوں کو ہدایت دی کہ وہ کوٹھی کے اندر صرت اس صورت میں جائیں جب ان کے ساتھ ایک کانسیٹیل ہو۔ انہیں کسی سے ملنے سے روک دیا۔ کچھ دیر بعد چار مسلح کانسیٹیل آگئے۔ انہیں اپنے حوالدار کی نگرانی میں ضروری ہدایات دے کر میں دفتر چلا گیا۔ میں اب اس چکر میں پڑ ہوا تھا، کہ اس لڑکی کے خلاف شبہ تو بچتے ہو گیا ہے مگر ثبوت اور شہادت کیا ہے جس کی بنا پر اسے گرفتار کروں اور کیس تیار کروں۔ اب میری امید کا انحصار کرنل کی نوجوان نیگی کے اعصاب پر تھا کہ وہ کتنی دیر تک قاسم رہتے اور کب ٹوٹنے ہیں۔ مجھے امید تھی کہ اس کی برداشت جلد ہی ختم ہو جائے گی اور وہ انبال جرم کر کے چلے اپنے ساتھی اور ثبوت دے دے گی۔

اس کی تصویر اور زہر کی بوتل

میں نے دفتر میں جا کر یہ کارگزار کی لکھی اور اگلا پروگرام نوٹ کیا۔ یہ فیصلہ کر کے کہ اس لڑکی کو کل شام تک سوچنے کی ہمت دوں اور اتنی دیر میں ابرار کے کیس کی تحقیق کچھ آگے بڑھاؤں۔ وہاں سی۔ آئی۔ ڈی کے جو آدمی چھوٹے تھے ان سے کوئی کارآمد سراغ نہ ملا۔ ابرار کے ذاتی کاغذات دیکھنا لازمی تھا۔ اس کیس کا سراغ کاغذوں سے مل سکتا تھا۔ اس کی بیوی دھلی ہوئی سیلیٹ کی مانند تھی۔ میں نے دو مشیر دل کو ساتھ لیا۔ کسی چیز کی برآمدگی کی گواہی دینے کے لیے دو ایسے افراد کی ضرورت ہوتی ہے جن کا پولیس اور ملزم کے ساتھ کوئی تعلق نہ ہو۔ انہیں مشیر کہا جاتا ہے جو برآمدگی کے مشیر نامے پر دستخط کرتے ہیں۔ میں نے دو سرز آری ساتھ لیے

اور ابرار کے دفتر گیا۔ شاف کے دو آدمی موجود تھے میں نے ابرار کے کمرے کے تالے کی مرنڈی نکالا کھولا اور اندر گیا۔ اس کی میز کی ایک دراز سے چابیوں کا ایک گچھا برآمد ہوا۔ ان سے اس کی میز کا ایک مقفل دراز کھولا۔ اس میں سے ایک خوبصورت فائل کو نکلا۔ اسے کھولا تو اس میں سے ایک تصویر نکلی۔ یہ ایک لڑکی کی تصویر تھی۔ بال ماتھے پر پڑے ہوئے مسکراہٹ میں بے حیائی اور حسن میں بے پناہ دل کشی — یہ تصویر کرنل آبرار کی نوجوان بیوہ کی تھی۔

میں نے فائل کوڑ میں رکھے ہوئے کاغذات کو دیکھا۔ اس لڑکی کا کوئی خط برآمد نہ ہوا البتہ ایک اور تصویر نکلی، یہ ابرار اور اس لڑکی کی تھی۔ دوسری طرف اس فوٹو گرافر کی دکان کی مر تھی جہاں یہ تصویر لی گئی تھی۔ باقی کاغذات میں سے کوئی انشورنس کی پالیسی نہ نکلی۔ الماری سے بھی کوئی کارآمد کاغذ برآمد نہ ہوا۔ میں نے تصویر دل کی برآمدگی کا مشیر نامہ تیار کیا اور دونوں مشیروں سے دستخط کرائے۔ ابرار کے دفتر کے جو آدمی وہاں موجود تھے، انہیں لڑکی کی تصویر دکھا کر پوچھا کہ یہ لڑکی کبھی دفتر آئی تھی یا نہیں۔ انہوں نے بتایا کہ یہ لڑکی چار یا پچھتر شبہ شام کو یہاں آئی تھی، ابرار صاحب اس کے ساتھ چلے جاتے تھے۔

دوسرے آدمی نے بتایا — "ابرار صاحب کی وفات سے ایک روز پہلے اس لڑکی کا فون آیا تھا میں نے جواب دیا کہ ابرار صاحب بیمار ہیں۔ آج دفتر نہیں آ سکیں گے۔ دوسرے دن بھی اس کا فون آیا۔ اگلے روز ابرار صاحب فوت ہو گئے۔ دو روز دفتر بند رہا جس روز دفتر کھلا تو اس لڑکی کا فون آیا میں نے اسے بتایا کہ ابرار صاحب فوت ہو گئے ہیں۔ وہ مان نہیں رہی تھی۔ آخر اس کے منہ سے اس

”پہلے یہ تو بتاؤ کہ لازم کیا ہے“ میں نے کہا۔ ”اگر تو نے میری شکل ص
کردی تو انعام دوں گا۔“

وہ مجھے اپنے کوارٹر میں لے گیا۔ بیوی بچوں کو باہر نکال دیا۔ مجھے چار پانی پر
بٹھا کر اس نے ایک ٹرنک کے اوپر سے دوسرا ٹرنک اٹھا کر پرے رکھا۔ نیچے
والے ٹرنک کو کھول کر اس کے نیچے ہاتھ ڈال کر سوٹا وارٹر کی ایک بوتل نکالی۔ اس
میں پانی سا تھا جس کا رنگ کچھ سبز تھا اور ادھر جھاگ تھی۔ بوتل کے منہ میں ہلکا
تھا۔ یہ اسی شہر کی ایک بیوریج کمپنی کی بوتل تھی۔ اس نے بوتل میرے ہاتھ میں
دے دی اور ہاتھ جوڑ کر کھڑا ہو گیا۔ میں نے غصے سے کہا۔ ”اب کچھ منہ سے
بھی بکو... یہ کیا ہے؟“

”حضور والا! اس میں زہر ہے“ اس نے کہا۔ ”مجھے شک ہے کہ اس زہر سے
اس آدمی کو مارا گیا ہے جس کی آپ نے مجھے تصویر دکھائی ہے۔ ان کا نام ابرار ہے۔“
”تم اس آدمی کو کس طرح جانتے ہو؟“

کرنل کی بیگم اور بلی

”عالی جاہ! میں بیگم صاحب کا خاص ملازم ہوں۔ یہ شخص بیگم صاحب کا دوست
تھا۔ اس کے مرنے کا مجھے اس طرح پتہ چلا کہ ایک روز بیگم صاحب نے مجھے اس کے
دفتر میں بھیجا اور کہا کہ مجھے ٹیلیفون پر کسی نے بتایا ہے کہ وہ مر گیا ہے۔
لیکن مجھے یقین نہیں آتا کہ ہمارے پتہ پر نہ... میں اس کے دفتر گیا تو پتہ بتایا کہ وہ
واقعی مر گیا ہے۔ اس بوتل کا قصیدہ ہے کہ آخری رات کرنل صاحب نے مجھے بلایا۔“

طرح کے الفاظ نکلے۔ ”ہائے اللہ! میں بالکل ہی لٹ گئی۔ پھر اس طرح آواز آئی جیسے
اس نے ریسپورر رکھا نہیں بلکہ اس کے ہاتھ سے گر پڑا تھا۔“
میں نے ان دونوں کو گواہوں کی فہرست میں شامل کر لیا۔

یہ تھا ایک بہت بڑے شہر کی سوسائٹی کا ڈرامہ۔ ایک قتل ایک سرے پر
ہوا، دوسرا دوسرے پر اور دونوں ایک دوسرے سے متعلق تھے۔ ابرار کی بیوی کے
اس سوال کا جواب مل گیا تھا کہ ابرار راتوں کو باہر جوتا رہتا ہے تو کہاں جاتا ہے۔ یہ تو کہا
جاسکتا تھا کہ کرنل کے قتل میں ابرار کا ہاتھ تھا مگر یہ مہتمم ابھی حل طلب تھا کہ ابرار
کو زہر کس نے دیا۔ آپ کو یاد ہو گا کہ ابرار کرنل کے مرنے سے تیسرے روز مرا تھا۔ کیا
کرنل کی بیوی کے کسی چاہنے والے نے ابرار کو زہر سے راستے سے ہٹایا ہے؟ اور
کیا کرنل کے سر پر ڈنڈا مارنے والا بھی یہی شخص تھا جس نے ابرار کو زہر دیا ہے؟۔
میں اب اتنے دھیرے میں ٹھول رہا تھا۔ ذہن میں یہ خیال آیا کہ کرنل کے ایک نوکر نے
بتایا تھا کہ آخری رات ایک آدمی کرنل کے پاس بیٹھا دھسکی پتیارہا تھا میں
نے اسی کو تنگلے کا سہارا سمجھا اور کرنل کی کوٹھی گیا۔ اس نوکر کو ابرار کی تصویر دکھائی
جس کے ساتھ کرنل کی بیوی کی تصویر تھی۔ اس بوڑھے سے نوکر نے ذرا غور سے دیکھ
کر کہا۔ ”یہی آدمی تھا جو آخری رات کرنل کے ساتھ بیٹھا رہا تھا۔“

”اس آدمی کے متعلق تم کچھ اور بھی جانتے ہو؟“ میں نے پوچھا۔
اس نے میرے آگے ہاتھ جوڑ دیئے اور ہلکا ریلوں کی طرح انتخابی۔ ”حضور
والا! میرے چھوٹے چھوٹے بچے ہیں۔ میرے دل میں ایک لازم ہے۔ اگر بتا دوں تو
میرا کوئی نقصان تو نہیں ہو گا؟“

ٹرسے اٹھالی اور پیٹری میں گیا۔ مجھے کچھ شک نہ تھے لگا کہ اس سوڑے میں کوئی خاص بات ہے۔ شک کی ایک وجہ یہ تھی کہ کرنل صاحب مجھے بلانے کی بجائے خود بوتل لینے چلے گئے تھے۔ دوسری وجہ یہ کہ وہ اسے کھول کر دیکھ رہے تھے پھر بلائے تھے اور انہوں نے مٹی میں ایک کاغذ مڑوڑ کر مجھ سے چھپایا تھا۔ نمبر یہ کہ کرنل صاحب نے مجھے کہا تھا کہ بچا ہوا سوڈا نالی میں پھینک دینا اور شک کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ کرنل صاحب ابراہ کو پسند نہیں کرتے تھے۔ کیونکہ وہ کرنل صاحب کا نہیں بیگم صاحب کا دوست تھا۔

یہاں اس بوڑھے نوکر نے تین واقعات سن کر ثابت کیا کہ کرنل صاحب کو بیگم اور ابراہ کی دوستی پسند نہیں تھی۔ اس نے کہا۔ ”میں بالکل نہیں جانتا کہ اس رات ابراہ صاحب کرنل صاحب کے پاس کیوں بیٹھے ہوئے تھے اور بیگم صاحب ان میں کیوں نہیں بیٹھی تھیں۔ مجھے شک یہ ہے کہ کرنل صاحب نے ابراہ صاحب کو اپنی بیوی کا دھوکا دیا تھا اور وہ انہیں نہ ہر بلانا چاہتے تھے۔ کرنل صاحب ظالم طبع انسان تھے۔ سچی بات یہ ہے کہ مجھے بیگم صاحب کے ساتھ ہمدردی تھی۔۔۔۔۔

”میں نے بچا ہوا سوڈا کمپن پھینکا نہیں۔ میں بوتل اپنے ساتھ لے گیا۔ باورچی خانے میں ایک پٹی آیا کرتی تھی اور برآمدے میں سو جایا کرتی تھی۔ میں نے باورچی خانے سے ایک کپے ہوئے سالن کی بوتلی اور اس پر تھوڑا سا سوڈا ڈال کر پٹی کے آگے پھینک دی۔ پٹی نے بوتلی کھالی۔ دوسرے دن پٹی کو دیکھا۔ وہ بہت بے چین تھی۔ اور زور زور سے میاؤں میاؤں کرتی تھی۔ سارا دن اور ساری رات وہ کسی نگین سے مشورہ مچاتی رہی۔ اگلے روز اس سے چلا بھی نہیں جاتا تھا۔ وہ اٹھتی اور گرتی

میں کیا تو یہ آدمی ان کے پاس بیٹھا ہوا تھا۔ کرنل صاحب نے مجھے دسکی کی بوتل اور گلاس وغیرہ لانے کو کہا۔ میں نے یہ چیزیں ان کے آگے رکھ دیں اور برآمدے میں جا کر بیٹھ گیا۔ میں سوڑے کی دو بوتلیں بھی فریج سے نکال کر ان کے آگے رکھ آیا تھا۔۔۔ دسکی بلانا میرے فرائض میں شامل تھا۔ تھوڑی دیر بعد میں یہ دیکھنے کے لیے اندر جانے لگا کہ کچھ اور ضرورت نہ ہو۔ میں کمرے میں گیا تو کرنل صاحب وہاں نہیں تھے۔ یہ آدمی (ابراہ) اکیلا بیٹھا تھا۔ مجھے کہنے لگا۔ ”تم کہاں تھے۔ دیکھ کرنل صاحب خود سوڈا لینے گئے ہیں۔“ میں دوڑتا پیٹری میں گیا تو دیکھا کہ کرنل صاحب سوڑے کی ایک بوتل کھول کر کھڑے اسے دیکھ رہے تھے اور بوتل بلا بھیج رہے تھے۔ مجھے دیکھ کر گھبرا گئے اور ایک کاغذ کو مٹی میں دبا کر بولے۔ ”تم بے شک چلے جاؤ۔ ہم کچھ دیر بیٹھیں گے۔“ میں برآمدے میں چلا گیا۔ میں نے بالکل نہیں سوچا کہ کرنل صاحب بوتل میں کیا دیکھ رہے تھے اور انہوں نے کاغذ کا جو پرزہ مٹی میں دبا دیا تھا، وہ کیا تھا؟۔۔۔۔۔

”بے شک کرنل صاحب نے مجھے کہہ دیا تھا کہ تم چلے جاؤ۔ لیکن میں برآمدے میں موجود رہا۔ کرنل صاحب کا بہانہ ابھی بیٹھا ہوا تھا۔ اس لیے میں اس کے جلنے تک وہاں سے ہٹنا نہیں چاہتا تھا۔ بہت دیر بعد میں نے ابراہ صاحب کو جانے کے لیے کمرے سے نکلنے دیکھا تو میں بوتلیں اور گلاس اٹھانے کے لیے اندر گیا۔ وہ پٹی کی بوتل اور گلاسوں کے علاوہ سوڑے کی تین بوتلیں تھیں۔ دو خالی اور نمبر یہ میں کچھ سوڈا بچا ہوا تھا۔ میں جب یہ بوتل ٹرسے میں رکھنے لگا تو کرنل صاحب نے کہا کہ یہ سوڈا نالی میں انڈیل دینا، نوکر پی لیتے ہیں، اچھا نہیں لگتا۔ میں نے اچھا حسد کر کہہ کر

نہی۔ پھر وہ مر گئی۔ اس سے ثابت ہو گیا کہ اس سوڑے میں کرنل صاحب نے زہر ملا کر ابرار صاحب کو پلا دیا ہے۔۔۔۔

”جلی تو دو روز بعد مری۔ صبح ہی صبح کرنل صاحب بیڑھیوں سے گر کر مر گئے۔ گھر پر فوس کے لیے آنے والوں کے ٹھٹھکے ٹھٹھکے لگ گئے۔ سوڑے کی بوتل چھپا کر رکھ دی۔ میں یہ سوچ رہا تھا کہ بیگم صاحب کو بتا دوں کہ کرنل صاحب آپ کے دوست کو زہر دے کر مرے ہیں۔ پھر مجھے یہ خیال آ جانا خود ہی نہ چھن جاؤں۔ بیگم صاحب یہ نہ شک کر بیٹھیں کہ شراب پلانے کا کام تو میں کرتا ہوں پھر کرنل صاحب نے سوڑا داڑ میں زہر کیسے ملایا؟ اس میں ضرور میری شراکت ہے۔ میں نے تین روز ابرار صاحب کو بھی نہ دیکھا۔ وہ ہمارے ہاں نہیں آئے۔ پھر بیگم صاحب نے مجھے ان کی موت کی خبر سنائی جس کی میں نے ان کے دفتر میں جا کر تصدیق کی۔ مجھے ان کے دفتر سے پتہ چلا کہ تین روز سے تکلیف میں رہے اور مر گئے۔ جلی بھی تیسرے روز مری نہ تھی۔ مجھے ہمت نہیں پڑ رہی تھی کہ بیگم صاحب کو اصل حقیقت بتاؤں۔ ہم غریب لوگ ہیں حضور والا! بادشاہوں کے اچھے برے معاملات میں دخل دے کر انسان خوار ہی ہوتا ہے۔۔۔۔

”پھر آپ آگئے۔ میں تو بزل پھینکنے چلا تھا۔ جب آپ آئے اور گفتیش شروع ہوئی تو میں نے بزل پھینکنے کا ارادہ بدل دیا۔ میں نے سوچا کہ گفتیش میں سوڑے کی ضرورت پڑ سکتی ہے۔ میں پھر بھی آپ سے بات کرتے ڈرتا تھا کہ کہیں کیس الٹ کر مجھ پر ہی نہ آ پڑے۔ مگر آپ نے جن سپاہیوں کو یہاں پہرے پر بٹھایا ہے انہوں نے ہمیں ڈرا ڈرا کر ہمارے پاؤں تلے سے زمین نکال دی ہے۔ انہوں نے ہم سب کو نظر بندی میں رکھا

ہوا ہے۔ ان کی باتوں سے ڈر کر میں یہ نہ آپ کے حوالے کر رہا ہوں۔“
کانٹیلڈوں کو میں نے ہی کہا تھا کہ نوکروں کو ڈراتے اور دھمکاتے رہیں اور انہیں یہ تاخیر دیں کہ وہ سب قتل کے جرم میں پکڑے جائیں گے۔ میرا یہ طریقہ کامیاب رہا۔ یہ تو بہت ہی قیمتی راز تھا۔ میں نے بزل اپنے قبضے میں لے لی اور اس ڈر کو گلوں میں شامل کر لیا۔ میں کرنل کی بیگم کے سونے والے کمرے میں گیا۔ اس کا چہرہ اُترا ہوا تھا۔ میں نے اس کی اور ابرار کی اکٹھی تصویر اس کے آگے رکھ دی۔ اس نے پہلے تو تعجب کو دیکھا پھر میری طرف دیکھا۔ میرت نے اس کے پاؤں تلے سے زمین نکال دی۔ اس نے تصویر کو دونوں ہاتھوں میں اٹھایا اور اچانک وہ چھپا لے کر رونے لگی۔ اس نے تصویر پر آنکھوں پر رکھ لی اور پتوں کی طرح لمبلانے لگی۔ اس کے رونے میں درد اور بارغی۔ میں کمرے میں ٹھٹھٹھا رہا۔

وہ ذرا سنبھلی تو میں نے کہا۔ ”کرنل صاحب ابرار کو زہر دے کر مرے ہیں۔“
”کیا کہا آپ نے؟“ اس کی آنکھیں باہر کو آنے لگیں۔
”کرنل صاحب قتل ہونے سے پہلے اپنے قاتل کو قتل کر چکے تھے۔“ میں نے الفاظ الگ الگ کر کے کہا۔ ”دونوں مقتول قاتل تھے۔ ایک مقتول خود اُمر گیا، دوسرا دو روز بعد مرا۔ اب محترمہ! اپنے آپ کو مزید اذیت میں نہ ڈالیے۔ مجھے یہ بتا دیجئے کہ کرنل صاحب کو بیڑھیوں سے گرنے کا بندوبست کس نے کیا تھا اور جب وہ گرے تو ان کی کنپٹی پر ڈنڈا کس نے مارا تھا؟“

”میں آپ کی بات سمجھی نہیں۔“ اس نے کہا۔ ”کرنل صاحب پھسل کر گرے تھے۔“
”سچے! میں آپ کو بتاتا ہوں کہ کرنل صاحب کس طرح گرے یا انہیں کس طرح گرایا

بوت کی بنا پر بری ہو گئے۔ میں نے یکم سے کہا۔ ”آپ نے اس مافی سے اپنے آپ کو نہیں دلا دیا تھا کہ قتل کے اس طریقہ کار سے آپ پکڑی نہیں جاسکیں گی بلکہ آپ نے یہ نہ سوچا کہ یہ انسان ہے۔ اب یہ انسان آپ کی حیثیت کو ثابت دے گا۔ سیڑھیوں سے صابن دھونے والی بلاز میرے گاہکوں کی فہمت میں شامل ہے۔ کرنل صاحب کے جو سیلبریں میں نے قبضے میں لیے تھے ان کے ساتھ صابن کے ٹان موجود ہیں۔ میرے پاس یہ گواہی دینے والی ایک عورت موجود ہے جو ثابت دے گی کہ بار علی الصبح گھر سے نکلا اور دو اڑھائی گھنٹوں بعد گھر گیا تھا۔ یہ عورت بار کی بیوہ ہے۔ ابراہیم سیڑھیوں کے نیچے چھپا ہوا تھا۔ وہ کرنل صاحب کی کنپٹی پر ہڈا مار کر یہاں سے غائب ہو گیا تھا۔“

اس نے سر ہاتھوں میں ختم لیا اور بہت دیر سوچتی رہی۔ پھر اس نے پوچھا۔
”یہ جرم ثابت ہو جائے تو مجھے کتنی سزا ملے گی؟“

”اگر آپ میرے ساتھ تعاون کریں تو آپ کی کچھ مدد کر سکوں گا۔“ میں نے اسے
”آپ کو اپنے جرم کا اقبال کرنا ہوگا۔ ثبوت اور شہادت کی ضروری کڑیاں ملانی
والی۔ آپ مجھے اپنے جرم کی کہانی سنائیں گی۔ تحریری اقبال جرم مجسٹریٹ کے
سامنے ہوگا۔ وہاں آپ آئندہ ہوں گی۔ آپ مجسٹریٹ کے سامنے جو چاہیں بیان
ہو ادیں۔ مگر میں آپ کو یہ بتا دوں کہ اگر آپ نے مجسٹریٹ کے سامنے گڑبڑ کی
جی بچ نہیں سکیں گی۔ آپ کو اب عدالت میں مجرم کی حیثیت سے پیش ہونا ہی ہے۔“
اس میں اتنی ہمت نہیں رہی تھی کہ مجھے جھٹلا سکتی یا فزائی کوئی صورت اختیار کر
تی۔ اس نے لمبی آہ بھری اور غم میں ڈوبی ہوئی آنکھوں سے کچلی ہوئی آواز میں کہنے

”کیا تھا؟“ میں اس کے سامنے بیٹھ گیا اور کتاب کا وہ صفحہ کھولا جس کا کوئی نوٹ کر
کیا ہوا تھا۔ میں نے وہ پیرا گراف پڑھ کر اسے سنایا جس کے حاشیے میں پینسل کی
تھی۔ پیرا گراف کے بالکل صحیح الفاظ تو مجھے یاد نہیں رہے۔ بہر حال کچھ اس طرح تھے
”قتل کا طریقہ یہ اختیار کیا گیا کہ اندرونی سیڑھیوں کی سب سے اوپر
والی ایک سیڑھی پر صابن خیر جھگڑے مل دیا گیا۔ صابن کے باریک باریک
ٹکڑے سیڑھیوں پر چپک گئے۔ صرت غور سے دیکھنے سے ہی نظر آتے
تھے۔ ایک آدمی سیڑھیوں کے نیچے چھپا کھڑا تھا جس کے ہاتھ میں
شاہ بلوط کی لکڑی کا ڈنڈا تھا۔ مقتول سیلنگ روم سے نکل کر نیچے آنے
لگا۔ اوپر کی سیڑھی سے اس کا پاؤں پھسلا۔ وہاں صابن ملا ہوا تھا۔
اس نے لوگی سیڑھی پر پاؤں رکھ کر سنبھلنے کی کوشش کی۔ وہاں بھی
صابن ملا ہوا تھا۔ وہ گرا اور ڈنڈا ہوا نیچے آ رہا۔ ابھی اٹھ ہی رہا تھا کہ
اس کی کنپٹی پر ڈنڈا پڑا۔ یہ ضرب مہلک ثابت ہوئی اور وہ مر گیا۔ گھر
کے نوکروں نے اسے آکر اٹھایا۔ سب یہی سمجھتے تھے کہ مقتول سیڑھیوں
سے گر کر مرا ہے۔ ڈاکٹر نے بھی لاش کو دیکھ کر یہی رائے دی کہ سیڑھیوں
سے گر کر مرا ہے لیکن....“

لوٹے خاندان اور نوجوان بیوی کی کہانی

یہ جرم دو جاسوسی کی ایک بڑی لمبی کہانی کا صرت ایک پیرا گراف ہے اس
میں قابل پکڑے گئے تھے۔ ایک مقتول کی بیوی تھی۔ دوسرا اس کا آشنا لیکن عدم

”میرے دل میں رحم پیدا ہو چکا ہے۔“ میرے منہ سے اپنے آپ ہی یہ الفاظ نکل گئے۔ ”میں آپ کی مدد کروں گا۔“ میں پولیس انسپکٹر تھا لیکن میرے اندر ایک انسان جاگ اٹھا۔

اسے کچھ حوصلہ ملا۔ اس نے کہا۔ ”یہ تو آپ تصور کر سکتے ہیں کہ بائیس سال کی لڑکی کا خاوند اس سے تیس سال بڑا ہو۔ شراب پی پی کر اس نے اپنا جسم کھوکھلا کر لیا ہو تو اس نوجوان لڑکی کا کیا تشہر ہوتا ہوگا۔ کرنل نے مجھ پر یہ کوم کیا کر مجھے گھر میں قید نہیں کیا بلکہ بڑے فخر سے مجھے پارٹیوں میں لے جانے لگا جہاں انگریز اور دیسی انسر آتے تھے۔ ان پارٹیوں میں شراب چلتی تھی، ڈانس ہوتے تھے۔ مجھے بھی ڈانس کی دعوت دی جاتی تھی مگر مجھے انگریزی ڈانس آتا نہیں تھا۔ پھر بھی مجھے لیک انگریز فوجی انسر اپنے سینے سے لگا کر کرکٹر کی دھن کے ساتھ ہال میں گھمانا، وہ ہنستا تو کوئی اور سینے سے لگا لیتا اور میں بالکل آزاد ہو گئی۔ میں نے اپنی عمر کے فوجی انسروں کے ساتھ دوستی پیدا کر لی اور کبھی ایک کے ساتھ کسی بڑے ہوٹل میں چلی جاتی کبھی کسی دوسرے کے ساتھ۔ کرنل صاحب بہت خوش تھے کہ ان کی بیوی نوجوان ہے، خوبصورت اور سونٹل ہے۔۔۔۔

”مختصر یہ کہ کرنل کے بوڑھے جسم سے مجھے نفرت ہو گئی اور میں اپنی تنہائی کے لیے بدکار ہو گئی لیکن میں جن حالات میں بدکار ہوئی ان کی شدت کو دہی سمجھ سکتا ہے جو ان میں گھرا ہوا ہو۔ ابراہار کا اپنا ٹھیکہ لیری کا کاروبار تھا۔ کرنل فوج کے اس ٹھیکے کا انچارج تھا جہاں سے ٹھیکے دیے جاتے تھے۔ ابراہار اور کرنل کی ملاقات کسی ٹھیکے کے سلسلے میں ہوئی تھی۔ کرنل رشوت لینا تھا۔ اس نے ابراہار کو گھر بلا لیا میں

لگی۔ ”میرے ماں باپ کو تو آپ اس جرم میں شامل نہیں کر سکتے کیونکہ ابھی ایسا قانون نہیں بنا جو والدین کو سزا دے سکے جو اپنی نوجوان بیٹیوں کو بوڑھے ورت مند سے بیاہ دیتے ہیں۔ اگر میرے ماں باپ یہ جرم نہ کرتے تو آج سو سائیں ہی یہ دو جرم نہ ہوتے جن کی تفتیش آپ کر رہے ہیں۔ ایک آدمی زہر سے لڑیا گیا اور دوسرے کو بیڑھوں سے گرا کر ختم کر دیا گیا۔ میرے ساتھ جرم میں جو شریک تھا وہ زہر سے مر چکا ہے۔ اب سب کی سزا بھگتے کے لیے میں اکیلی رہ گئی ہوں۔“

اس کی آواز میں قہر اور نفرت آگئی۔ دانت پیس کر بولی۔ ”کہاں ہیں میرے ماں باپ؟“ کرنل کے منہ پر وہ یہاں آئے تھے۔ آپ جانتے ہیں انہوں نے کیا کہا تھا؟ انہوں نے کہا تھا کہ یہ کوٹھی نہ چھوڑنا، یہیں رہنا اور نہ کرنل کے بھائی اور اس کی پہلی بیوی مالک بننے کی کوشش کریں گے۔ میں نے انہیں کہا کہ اب آپ لوگ بھی اس کوٹھی میں نہیں آئیں گے۔ کوٹھی اور انشورنس میرے نام ہے۔ کرنل سے آپ نے میرے جسم کی قیمت وصول کر لی تھی۔ اب میں اپنی جوانی اور ان خواہوں کی قیمت وصول کروں گی جو آپ نے تباہ کیے ہیں۔ میں نے ماں باپ کے ساتھ ایسا بے ہودہ سلوک کیا کہ وہ چلے گئے۔ مجھے دراصل ابراہار کا سہارا تھا۔ اس نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ وہ میرے ساتھ شادی کر لے گا۔“

”ابراہار کو آپ کس طرح جانتی تھیں؟“

اس نے آہ بھری اور کہا۔ ”میں نے تو بہت سے آدمیوں کو جلانے کی کوشش کی تھی مگر میری پسند کا آدمی صرف ابراہار تھا۔ میں آپ کو شادی کے بعد کی ساری باتیں سناتی ہوں۔ شاید آپ کے دل میں کچھ رحم پیدا ہو جائے۔“

دین گھر میں بننا تھا۔ میں نے پہلی بار ابرار کو دیکھا تو یہ آدمی میرے دل میں بیٹھ گیا۔ میں نے اس کا ٹیلیفون نمبر نوٹ کر لیا۔ پھر باہری ملاقاتیں شروع ہو گئیں۔۔۔۔۔

”ابراہیم! میں نے بہت ہی مختلف تھا۔ اسے نہتے جسم سے بچنے نہیں تھی۔ میرے جذبات کا اسے بہت زیادہ رشتہ تھا۔ وہ گھر میں بھی میرے پاس آیا کرتا تھا۔ کرنل کو میری اس سے ملاقاتیں پسند نہیں تھیں۔ کہا کرتا تھا کہ یہ معمولی سا سفید ہے۔ دراصل اسے پتہ چل گیا تھا کہ میں ابرار میں زیادہ دلچسپی یعنی ہوں۔ وہ شاید اس خوش فہمی میں مبتلا تھا کہ میں جن افسروں کے ساتھ گفتگو کرتی ہوں وہ مجھے بہت سمجھتے ہیں اور ایک ابرار ہی ہے جو بد معاش ہے۔۔۔۔۔

”ایک روز ابرار کے سکے پر ہمارا جھگڑا بھی ہو گیا۔ میں نے کرنل کو صاف گفتگو میں کہہ دیا کہ ابرار یہاں آنے کا اور ضرور اسے گا۔ کرنل کے دل میں یہ بات اٹک گئی تھی کبھی کبھی شام کو ابرار کے دفتر چلی جاتی اور اسے باہر لے جاتی اور رات دیر تک اس کے ساتھ رہتی۔ ایک شام کرنل نے میرا پیچھا کیا اور مجھے ابرار کے ساتھ کار میں دیکھ لیا۔ میں نے اس کی کار اپنی کار کے قریب سے گزرتے دیکھی تھی۔ میں رات کو گھر آئی تو پھر اس کے ساتھ تو تو میں میں ہوئی۔ اس کے بعد میں نے ابرار سے نشاندہی کا فیصلہ کر لیا۔“

”کیا آپ کو معلوم تھا کہ ابرار شادی شدہ ہے؟“

”ہاں۔ اس نے کہا تھا کہ وہ بیوی کو طلاق دے دے گا۔ میرا معاملہ ٹیڑھا تھا۔ کرنل مجھے طلاق دینے پر کبھی راضی ہونے والا نہیں تھا۔ میں اور ابرار ایک دوسرے میں اس قدر گھل مل گئے تھے کہ جذبات نے ہمیں اندھا کر دیا تھا۔ ہم نے کرنل کو راستے

سے ہٹانے کا فیصلہ کر لیا اور سوچنے لگے کہ اسے کس طرح ختم کیا جائے۔ میں جرم و جاسوسی کی کہانیاں پڑھنے کی عادی تھی۔ میں ان کہانیوں سے قتل کے طریقے معلوم کرنے لگی۔ ذرا اس پر غور کریں کہ میں جرائم پیشہ گھرانے میں تو پیدا نہیں ہوئی تھی۔ کسی اچھے مقصد کے لیے تعلیم حاصل کی تھی۔ میں کسی باعزت گھرانے کی بونہنلا چلتی تھی۔ کبھی کوئی گندی کتاب نہیں پڑھی تھی۔ مگر مجھے ایسے عذاب میں ڈال دیا گیا کہ اپنی تسکین کے لیے ایسی کہانیوں کی عادی ہو گئی کہ میں جنسی غلاظت اور جرم تو تھا۔ میں اس نفسیاتی عذاب سے اور ان کہانیوں کے اثر سے اپنے آپ میں نہ رہی۔۔۔۔۔

”میں نے یہ کہانی پڑھی جس کا آپ نے ابھی حوالہ دیا ہے۔ مجھے یہ طریقہ زیادہ پسند آیا۔ اگر آپ نے یہ کہانی ساری پڑھی ہو تو آپ کو معلوم ہو گا کہ میں بھی ایک بیوی اپنے خاندان کو ایسے طریقے سے قتل کرنا چاہتی ہے کہ قتل کا شبہ نہ ہو۔ اس کا دوست اسے یہ طریقہ بتاتا ہے جس کے مطابق بیوی معمول سے پہلے جاگ اٹھی۔ اس کا خاوند ابھی سویا ہوا تھا۔ بیوی نے سنگ مرمر کے بنے ہوئے زینے کی اوپر والی سیڑھی پر صابن رگڑ دیا۔ صابن کے چھوٹے چھوٹے سفید ٹکڑے سیڑھیوں کے ساتھ چپک گئے۔ بیوی نے اپنے دوست کو سیڑھیوں کے نیچے چھپا رکھا تھا۔ اس کے ہاتھ میں موٹا ڈنڈا تھا۔ بیوی نے خاندان کو جگایا اور نیچے چلنے کو کہا۔ خاوند زینے سے اترنے لگا تو صابن سے اس کا پاؤں پھسل گیا۔ اس نے دوسرا پاؤں اگلی سیڑھی پر رکھا۔ وہاں بھی صابن تھا۔ وہ پھسلا اور ٹھکڑا ہوا نیچے آ رہا۔ وہ ابھی اٹھ ہی رہا تھا کہ اس کی کپٹی پر ڈنڈا پڑا اور وہ ختم ہو گیا۔ ڈنڈا مارنے والا غائب ہو گیا۔ بیوی نے شور مچایا۔ نوکر جھاگے آئے۔ بیوی نے کہا کہ یہ سیڑھیوں سے گرا ہے۔ ڈاکٹر آیا۔ اس نے بھی

کرنل لی بیوہ جب تجھے اپنا بیان دے رہی تھی تو کنکری بار مجھے ایسے محسوس ہوا جیسے وہ میری بیٹی ہے۔ میں نے ایک بار سوچا کہ ماں باپ کے گناہ کی سزا اس لڑکی کو مل رہی ہے۔

اس کی قسمت میں اب موت جیل نہیں لکھی تھی بلکہ جیل سے باہر ساری عمر کی رسوائی لکھی تھی۔ اسے اب ذلیل و خوار ہونا تھا۔ میں اس کی زیادہ سے زیادہ بہمدد کر سکتا تھا کہ استغاثہ میں کہیں کمزوری رکھ دیتا جس سے قائدہ اٹھانے ہوئے اس کا وکیل اسے بری کرالیتا۔ لیکن میں سوچ رہا تھا کہ یہ بری ہوگی تو بھی مہذب طوائف سے کی اور چند سالوں کی جیل کاٹ کر کنکری تو بھی لوگ اسے لے اڑیں گے۔ اسے عمر قید نہیں ہو سکتی تھی۔ یہ میرا اندازہ تھا۔ مجھے کچھ اس قسم کا خیال بھی آیا کہ اسے کہوں کہ یہ بوتل جو میں نے تمہیں دکھائی ہے اس میں زہر ہے۔ یہ بیوہ اور ذلت کی زندگی سے نجات حاصل کر لو۔

میں اسے بوتل دکھا رہا تھا اور وہ اسے شفاف آنکھوں سے دیکھ رہی تھی۔ اس نے بڑی آہستہ سے کہا۔ ”ابراہم کو اس زہر سے مارا گیا تھا؟“

”جی۔ اس زہر سے“۔ میں نے کچھ سوچا اور کہا۔ ”یہ زہر انسان کو تیسرے دن مارتا ہے لیکن کئی دن سوڑے اور بانی میں پڑے رہنے سے اس قدر لگ سڑ گیا ہے کہ زبان پر ایک قطرہ چڑھانے تو انسان ختم ہو جائے۔ چلئے۔ آپ اپنی بات پوری کریں۔“

وہی سیرٹھیاں، وہی زہر

”ابراہم جب بہت دیر بعد کرنل کے کمرے سے نکلا تو میں اس کے انتظار میں

یہی رائے دی کہ بیڑھیوں سے گرنے سے کوئی چوٹ مہلک ثابت ہوئی ہے۔۔۔۔

”میرے نادان دماغ نے اسی طریقے کو بہتر سمجھا۔ آپ یہ تو سمجھ چکے ہوں گے کہ میرا دماغ کن چکروں میں الجھا ہوا تھا۔ میں نے ابراہم کو یہ کہانی پڑھائی تو اس نے کہا کہ ڈنڈا مارنے کا کام وہ کرے گا۔ ہم نے ڈرامہ طے کر لیا۔ آخری رات ابراہم ہمارے ہاں آیا۔ کرنل گھر پر تھا۔ میں یہ دیکھ کر حیران ہوئی کہ اس نے ابراہم کا استقبال دوستانہ طریقے سے کیا بلکہ بڑی ہی تہ تکلفی کا مظاہرہ کیا تھا۔ گپ شپ چلتی رہی۔ تھوڑی دیر بعد کرنل اسے اپنے کمرے میں لے گیا اور مجھے کہ گیا کہ میں نے ابراہم صاحب کے لیے ایک ٹھیکہ بھگا ہوا ہے۔ تم اوپر چلی جاؤ، میں ان سے بات کروں۔ اس نے ہنس کر کہا۔ ”دوسری کہ بلیک پر بات اچھی طرح ہو سکتی ہے۔“ میں اوپر چلی گئی۔ ابراہم دراصل صبح کا بدگرام طے کرنے آیا تھا۔ وہ تو ہم نے ابراہم کے دفتر میں بھی طے کر لیا تھا۔ میں سمجھی کہ بوتل واقعی کسی ٹھیکے کی بات کرنے کا۔ مجھے معلوم نہیں کہ اندر کیا ہوا۔“

”وہ آپ کو میں بتا دیتا ہوں۔“ میں نے اسے اس کے نوکر کا بیان سنا دیا کہ کس طرح کرنل نے ابراہم کو سوڈا واٹر میں زہر ملا دیا۔ میں نے اسے بوتل دکھائی، جس میں کچھ سوڈا بچا ہوا تھا۔ یہ بوتل مجھے کیمیکل اینڈ میزیکو کھیمسٹری تھی۔ یہ ابھی میرے پاس تھی۔

وہ بہت دیر اسی بوتل کو دیکھتی رہی۔ اس کی آنکھیں خشک تھیں۔ اتنی کوشش کی کہ میں نے کبھی دیکھی ہوں گی۔ یہ لوگ میرے دل میں اتنی جارہی تھی، جس کی وجہ یہ نہیں تھی کہ وہ جوان اور بہت خوبصورت تھی بلکہ اس لیے کہ وہ ایک مسلمان گھرانے کی شریف لڑکی ہوا کرتی تھی۔ ایسی ہی ایک عورت میری بھی تھی۔

چھی ہوئی تھی۔ وہ میرے قریب سے گزرا تو میں نے اسے مرنا اتنا کہا۔ ”صبح وقت پر آجانا۔“ میں دوڑ کر سونے کے کمرے میں چلی گئی۔ چند منٹ بعد کرنل آگیا۔ وہ بہت خوش تھا اور ابراہن کی تعریفیں کر رہا تھا۔ مجھے کیا علم تھا کہ یہ ناگ ڈنک مار آیا ہے۔ ہم سو گئے۔ آدھی رات کے بعد میں اٹھی۔ کرنل گہری نیند سو رہا تھا۔ اس کی نیند اس لیے بھی گہری ہوتی تھی کہ وہ نیند کی گولیاں کھا کر سو رہا کرتا تھا۔ میں نے غسل خانے سے صابن کی ٹبکی اٹھائی اور اوپر والی سیڑھی پر صابن کے باریک باریک ٹکڑے رکھ کر انہیں سسلا اور رگڑا۔ ٹکڑے پھیل کر فرش سے چپک گئے۔ دوسری سیڑھی پر بھی صابن مل دیا۔ مجھے معلوم تھا کہ کرنل ہمیشہ زینے کے بنگلے کی ٹکڑی پر ہاتھ رکھ کر چڑھا اور اتار کرتا تھا۔ میں نے اس طرف صابن ملا اور ہاتھ دھوئے پھر سو گئی۔۔۔۔

”میں وقت سے پہلے اٹھی۔ میں دیکھنا چاہتی تھی کہ کوئی نوکر اندر تو نہیں آیا۔ وہ سب اپنے کام میں لگے ہوئے تھے۔ ابراہن آچکا تھا۔ اسے اندر آتے کسی نے نہیں دیکھا۔ اس کے ہاتھ میں ڈنڈا تھا۔ میں نے خالسا ہاں سے جا کر کہا ناشیہ لگا دے۔ کرنل کو ڈاکٹر نے بیڈ ٹی پیس سے منع کر رکھا تھا۔ میں نے کرنل کو جگایا اور جب وہ نیچے آنے کے لئے تیار ہو گیا تو آگے آگے چل پڑا۔ میں پیچھے تھی۔ وہ جوں ہی زینے پر پہنچا اور ایک پاؤں اگلی سیڑھی پر رکھنے لگا اس کا اوپر کا پاؤں پیچھے کو پھسل گیا۔ وہ پیٹ اور منہ کے بل سیڑھیوں پر گرا اور لڑھکتا ہوا نیچے چلا گیا۔ اسے شاید چوٹ شدید لگی تھی۔ نہایت آہستہ سے اس نے سر اٹھایا۔ زینے کے نیچے سے ابراہن نکلا۔ اس نے کرنل کی کنڈی پر بڑی زور سے ڈنڈا مارا۔ ابراہن نے

استغفار نہ کیا۔ وہ ڈنڈا اٹھائے نکل گیا۔ پھر وہ مجھے نظر نہیں آیا۔ ”میں نے ایکٹنگ کی۔ چیختی چلاتی باہر کو دوڑی۔ نوکر دوڑے آئے۔ ساتھ والی کوٹھی سے بھی دو آدمی آگئے۔ انہوں نے کرنل کو اٹھایا۔ میں نے ڈاکٹر ملہوٹرا کو ٹیلیفون کیا۔ وہ فوراً آگیا۔ میں نے سب کو بتایا کہ کرنل صاحب سیڑھیوں سے گھرے ہیں کسی کو شک نہ ہوا۔ ڈاکٹر ملہوٹرا نے بھی تصدیق کر دی کہ موت گرنے کے صدمے سے واقع ہوئی ہے۔ کرنل صاحب کا دل کمزور تھا۔ مجھے معلوم نہیں کہ کرنل کے رشتہ داروں کو کس طرح شک ہوا تھا کہ اسے قتل کیا گیا ہے۔ انہوں نے پوسٹ مارٹم کی درخواست دے دی۔ کرنل کو قبر سے نکالا گیا۔ میں نے اپنے آپ سے کہا کہ اس بدکار بڑھے نے مر کر بھی میرا پیچھا نہیں چھوڑا۔ پھر آپ آگئے۔“ اس نے کہا۔ ”انسپکٹر صاحب! کہیں ایسا مضبوط بنا ہے کہ مجھے فوراً پھانسی دے دی جائے۔ میں اب زندہ نہیں رہنا چاہتی۔ مجھے جیل خانے کی سزا نہ دلوانا۔ میں پھانسی چڑھنا چاہتی ہوں اور بہت جلدی۔“

”آپ پر سب سے بڑا ظلم یہ ہوگا کہ آپ کو پھانسی نہیں دی جائے گی۔ میں نے کہا۔ میری جذباتی حالت بگڑ گئی تھی۔ پولیس انسپکٹروں کی جب تفتیش کامیاب ہو جاتی ہے اور ملزم اقبال جرم کر لیتے ہیں تو انہیں بہت خوشی ہوتی ہے خواہ کتنے ہی افراد پھانسی چڑھ جائیں۔ مگر مجھے ایسی کوئی خوشی نہیں ہوئی میں نے دبوڑے ہی پیسیدہ اور اپنی سر دوس کے مشکل ترین کیسیوں کی تفتیش کامیابی سے مکمل کر لی تھی۔ پھر بھی مجھے خوشی نہ ہوئی۔ میں نے اس لڑکی سے کہا۔ ”ہر سکتا ہے، آپ بروی ہو جائیں پھر کپ کیا کریں گی؟ ساری سوسائٹی کو پتہ چل چکا ہے کہ آپ نے اپنے

خاندان کو قتل کر لیا ہے اور یہ تو آپ کی سوسائٹی کو علم ہے ہی کہ آپ کا چال پلن
ٹھیک نہیں۔ اب آپ کو کوئی اپنی بیوی نہیں بنائے گا۔ آپ کے جسم کے خریدار
بہت ہوں گے۔ پھر ایک وقت آئے گا کہ آپ باقاعدہ عصمت فروشی کرنے لگیں گی
اور آپ کو گرفتار کر کے روزانہ عدالت میں پیش کیا جایا کرے گا۔ اخباروں میں آپ
کی تصویریں چھپیں گی۔ لوگ آپ کے نام سے جھوٹی اور ذلیل کہانیاں منسوب کریں
گے۔ آپ کو بازاروں میں سے گنارا جایا کرے گا۔ پھر آپ کو جیل خانے میں بند کیا
جائے گا۔ دہاں.....“

”خدا کے بلے انیکلٹر صاحب!“ وہ دوڑ کر میرے پاؤں میں گر پڑی اور کہنے لگی
”ہوئے ہونٹوں سے کہنے لگی۔“ مجھے کوئی مار دو۔ مجھے آج ہی چھانسی چڑھا دو۔ میں
مانتی ہوں کہ میں اپنے خاندان کی قاتل ہوں۔ مجھے آج ہی سزا دو اور کوئی مار دو“
میں نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ اُٹ خدایا۔ اتنے حسین بال میں نے کبھی نہیں
دیکھے تھے جبے میں ریشم پر ہاتھ پھیر رہا تھا۔ میں نے اسے اٹھایا اور کہا۔ ”ذرا دلی کو
سنجھاؤ۔ تھوڑا سوسلا کرو۔“ اسے پلنگ پر بٹھا کر میں ٹیبلٹ منے کمرے سے نکل گیا۔
میں سیڑھیوں سے اُترا اور ڈرائنگ روم میں گیا۔ کچھ دیر ڈرائنگ روم میں ٹھٹھا رہا۔
اور ہر کوئی چیز کرنے کی آواز آئی۔ میں اُہستہ اُہستہ ڈرائنگ روم سے نکلا اور اس زینے
تک پہنچا جہاں سے کرنل گرا تھا۔

ادھر لڑکی نمودار ہوئی۔ وہ اپنے کمرے سے نکل آئی تھی۔ اس نے دونوں ہاتھوں
سے اپنی گردن پکڑ رکھی تھی۔ کسی شدید تکلیف کی وجہ سے اس کے ہونٹ کھلے ہوئے
اور دانت پس رہے تھے۔ اس نے آنکھیں سختی سے بند کر رکھی تھیں۔ میں سمجھ گیا کہ اس

نے زہر پی لیا ہے۔ میں زہر کی بوتل اس کے کمرے میں چھوڑ آیا تھا۔ میں زینے کے
نیچے کھڑا رہا۔ زہر نے اس کے حلق کو شایہ جلا ڈالا تھا۔ اس کی آواز نہیں نکل رہی
تھی۔ میں اپنی جگہ سے نہیں ہلا۔ وہ چکر اکر گری اور گیارہ خوبصورت سیڑھیوں سے
لڑھکتی ہوئی میرے قدموں میں آ پڑی۔ میں نے اس کی بغض دیکھی۔ وہ مریچکی تھی۔
اس کی بندھن کھینچ کر کھینچیں۔ میں نے اس کی آنکھیں بند کر دیں۔ اسے وہیں
چھوڑ کر میں اوپر چلا گیا۔ اس کے کمرے میں سوٹا واٹر کی بوتل فرش پر پڑی تھی۔ اس
نے سارا زہر پی لیا تھا۔

میں نیچے آیا تو میلر حوالدار اور دو کانسیل لڑکی کی لاش کے قریب کھڑے
تھے۔ حوالدار نے کہا۔ ”صاحب، یہ تو مر گئی ہے۔“
”ہاں۔ اس نے زہر پی لیا ہے۔“

اس کے بعد جو کچھ ہوا وہ ٹھکانہ کارروائی تھی۔ میں ایک مہینہ معطل رہا۔ ملزم کے
پاس زہر رکھنا بہت بڑا جرم تھا لیکن انگریز ڈی۔ ایس۔ پی نے مجھے کوئی سزا
دی۔ یہ ایک انعام تھا جو اس نے مجھے اس صلے میں دیا تھا کہ میں نے دوا انتہائی
پیچیدہ کیسوں کی بالکل صحیح اور بہت تھوڑے وقت میں تشفی کی تھی۔

میرے ساتھیوں اور دوستوں نے مجھے مرے ہوئے کیسوں کی کاسباب
تشفیث کی مبارک باد دی۔ بعض نے کچھ سیکھنے کے لیے مجھ سے ایک ایک تفصیل
سنی اور مجھ سے کچھ ڈھنگ سیکھے لیکن لڑکی ایک بات تھی جو میں نے کسی کو نہیں
بتائی۔ اب جب کہ وہ شہر انڈیا میں رہ گیا ہے۔ کیسوں کے قاتل وہیں رہ گئے ہیں
وہیں عمر کے آخری حصے میں اُن پہنچا ہوں، میں یہ راز اپنے سینے سے نکال دینا

چاہتا ہوں۔ راز یہ ہے کہ میں نے لڑکی کو خود موقع دیا تھا کہ وہ زہر پی لے۔ میری یہ کہانی دیر اور سے پھر پڑھیں۔ میں نے لڑکی سے کہا تھا کہ یہ زہر انسان کو تیسرے دن مارتا ہے مگر اب یہ گل سڑ کر اتنا تیز ہو گیا ہے کہ ایک قطرہ زبان پر پڑے تو انسان نوراً مر جائے گا۔

پھر میں نے لڑکی کو زہر پینے پر اس طرح اکسایا تھا کہ اس کے انجام کی اسے بڑی ہی بھیانک تصویر دکھائی تھی۔ میں نے اسے کہا تھا کہ تمہیں ہر روز عدالت میں بازاروں سے گزار کر پیش کیا جائے گا۔ اخباروں میں تمہاری تصویریں اور خبریں چھپیں گی اور اگر تم بری ہو گئیں تو تمہارا کوئی رخصتوار جھوگا۔ تمہاری سوسائٹی جانتی ہے کہ تمہارا چال چلن ٹھیک نہیں اور اگر تم جیل میں چلی گئیں تو تمہارا حشر اس سے بھی بُرا ہوگا۔ میں اس کی یہی مدد کر سکتا تھا کہ اسے ذلت کی آنے والی زندگی سے پہلے ہی اپنے آپ کو ختم کرنے کا موقع دوں۔ میں نے اسے یہ نہیں کہا کہ تم زہر پی لو اور انگریز، ہندو اور سکھ افسروں کی دشتہ بینے سے پہلے ہی اپنے آپ کو ختم کر لو۔ میں نے اسے اپنے دل کی یہ بات بھی نہیں کہی کہ تم مسلمان کی سچی ہو، میں تمہیں شراب پیتے اور بدکاری کرتے نہیں دیکھ سکوں گا۔ میں نے اتنا ہی کیا کہ اس کے پاؤں تلے سے زین نکال کر اور زہر کا اثر بتا کر اور بوتل دانستہ رہیں چھوڑ کر کمرے سے نکل گیا۔ کوئی پولیس آفیسر ایسی بھیانک غلطی نہیں کرتا کہ قتل کے ایسے موزم کے پاس زہر چھوڑ جائے جس کا جرم ثابت ہو چکا ہو۔ اچھا ہوا کہ اس نے عقل سے کام لیا اور وہی زہر پی لیا جو اس کے جگر می دوست ابرا کو پلایا گیا تھا اور وہ انہی سیڑھوں سے گری جہاں سے اس کا شوہر گرا تھا۔